اردو

جلد ۹ جولائی سنہ ۱۹۲۹ع حصہ ۳۵

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

یادگار مولانا شرر مرحوم

دو سالانہ انعام

زبان اُردو کے محسن مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم کی یادگار میں جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے، سکرٹری انجمن ترقی اردو، اور جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ نے حسب ذیل دو سالانہ انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے —

(۱) "عطائے عبدالحق"

رسالۂ اُردو کے سال بھر کے مضامین نثر میں اول درجے کے سب سے اچھے مضمون پر ۱۲۵ روپیہ کلدار کا انعام جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے، عطا فرمائیں گے —

(۲) "عطیۂ ہاشمی"

کے نام سے دوسرا انعام ۱۰۰ روپیہ کلدار کا، مولوی سید ہاشمی صاحب اُن صاحب کی نذر کریں گے جن کی نظم رسالۂ اُردو کے سال بھر کی نظموں میں سب سے اچھی اور اعلیٰ درجے کی ہوگی —

ہر سال کے اخیر مہینے میں جو حضرات اہل سمجھے جائیں گے اُن کی خدمت میں رقم ارسال کر کے رسالے میں اس کا اعلان ہوتا رہے گا۔ انعام کی اہلیت کا فیصلہ صرف معطیان کی متفقہ رائے پر منحصر ہو گا —

المعلن

مدیر رسالۂ اُردو اورنگ آباد دکن

فہرستِ مضامین

خطبات گارساں دتاسی

ساتواں خطبہ ۳ دسمبر سنہ ۱۸۵۶ ع

(مترجمۂ جناب محمد عبدالباسط صاحب بی-اے)

(انگریزی سے اُردو میں مولوی سید وہاج الدین صاحب نے ترجمہ کیا)

حضرات! ہمارے گزشتہ جلسے کے انعقاد کے بعد، ہندوستان کی ایک ایسی سلطنت میں جہاں تمام تر ہندوستانی زبان ہی بولی جاتی ہے، ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا ہے - اور وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کی انگریزی حکومت نے سری رامچندرجی کی گدی کے مالک اودھ (قدیم اجودھیا) کے فرمانروا اعلیٰ حضرت واجد علی شاہ کو تخت سے اُتاردیا ہے- مجھے اس موقع پر اس خالص سیاسی انقلاب پر تبصرہ یا بحیثیت بادشاہ کے واجد علی کی اچھائیوں یا برائیوں سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ مجھے واجد علی شاہ کے ساتھ اس وجہ سے کسی قدر دلچسپی ہے کہ وہ ایک ممتاز ادیب اور بلند پایہ شاعر ہیں، 'اختر' ان کا تخلص ہے، اور وہ آج کل ہندوستان کے آسمان شاعری کے چند درخشاں ستاروں میں سے ہیں، میں اس سے پہلے دوسرے موقعوں پر آپ سب کے سامنے ان کی تصنیفات اور نتائج افکار کا ذکر کرچکا ہوں - وہ اپنے خاندان کے شاہان سلف کی روایتوں کے حامل اور تخت و تاج کے ایک لائق وارث ہیں- ان کا سارا خاندان ہندوستانی ادبیات کا محسن تھا، اور اس کے اکثر افراد خود بھی ادبی ذوق رکھتے تھے - صفدر جنگ، شجاع‌الدولہ، آصف الدولہ، جو ہندوستانی زبان کے شاعر تھے اور 'آصف' تخلص کرتے تھے - ، سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر، جو مشہور فارسی

لغت ہفت قلزم کے مؤلف تھے ' اور جن کی کتاب کا یہ نام اس وجہہ سے ہوا کہ اس میں سات ابواب ہیں - نصیرالدین حیدر ' ناصرالدولہ ' اور خود واجد علی شاہ معزول کے والد امجد علی شاہ ' ان سب کے احسانات ہندوستانی ادبیات پر ہیں - واجد علی کو ایسی شریف اور با ہمت ملکہ کے بیٹے ہونے کا شرف حاصل ہے ' جس نے اگر چہ اپنی عمر میں کبھی سمندر نہ دیکھا تھا ' اور جہاز کا نام تک نہ سنا تھا لیکن محض اپنی نسل کے حقوق کی حفاظت کے لئے سات سمندر پار کا سفر کیا ' اور انگلستان پہنچ کر حکومت کے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا - جس کا شکار ان کا بیٹا واجد علی بنایا گیا تھا —

اس تمہید کے بعد اب میں اپنے سالانہ خطبے کے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں' یعنی ہندوستان کی اس ادبی تحریک کا بیان جو ہندوستانی زبان کے توسط سے ہوی ہے - میں نے کسی موقع پر ہندوستانی زبان کو فرانسیسی کی بہن * کہا ہے لیکن دراصل وہ اس کی خالہزاد بہن ہے ' جس طرح اطالوی † زبان فرانسیسی کی خالہ زاد بہن ہے ' اور سنسکرت لاطینی کی بہن اور " ہندوستانی " یا " ہندی " یا " جدید ہندوستانی " کی ماں ہے —

حضرات ! لفظ " ہندوستانی " جیسا کہ میں متعدد بار آپ سے عرض کرچکا ہوں ' اسم جنس ہے اور اس سے ہندوستان کی اور خصوصاً ممالک مغربی و شمالی اور پنجاب کی زبان مرادلی جاتی ہے - اُردو جسے کسی قدر فارسی آمیز اور عربی آمیز ہندوستانی کہنا چاہئے' تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان ہے' اوران کی راجدھانیوں مثلاً دہلی ' آگرہ ' لکھنؤ اور حیدرآباد میں نہایت کھری اور خالص شکل میں بولی جاتی ہے - ہندی کو ہندوؤں کی ہندوستانی کہنا چاہئے اور یہ زیادہ تر سنسکرت

---

* ملاحظہ ہو میرے خطبۂ افتتاحیہ بابت سنہ ۱۸۵۴ع کا آخری پیراگراف' (مصنف)

† ملاحظہ ہو میکس مولر (Max Muller) کی کتاب (ہدایات دربارۂ تحصیل السنہ) Suggestions in learning the language کا صفحہ ۹ - (مصنف)

لفظوں سے ' خواہ خالص ہوں یا مخلوط ' بھری ہوی ہے - ہندی کے لئے عام طور پر دیوناگری رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے - جس کے معنے ہیں دیوتاؤں کی تحریر اور جسے عرف عام میں محض ناگری کہتے ہیں - لیکن اس کے علاوہ ہندو دوسرے رسم الخط بھی استعمال کرتے ہیں مثلاً کایتھی اور صرافی ' جو دونوں کی دونوں ناگري کی بگڑی ہوی شکلیں ہیں - صرافی رسم الخط متھرا ' علیگڈہ اور مین پوری کے اضلاع کی ہندی تحریر میں استعمال کیا جاتا ہے - آگرے میں ناگری مدرسوں کی تعداد کایستھی سے کسی قدر زیادہ ہے ' لیکن دوسرے اضلاع میں زیادہ تر کایستھی ہی کا استعمال ہوتا ہے - کایستھی تحریر کو کایتھی ناگری بھی کہتے ہیں ' یعنی کایتھوں کی تحریر - کایتھہ ' مقامی بولی میں کایستھہ کو کہتے ہیں' یعنی وہ ذیلی ذات جس میں محرر داخل ہیں ' مثلاً پٹواری وغیرہ - صرافی رسم الخط کا دوسر نام مہاجنی ہے ' اور اس کا استعمال زیادہ تر مہاجنوں اور صرافوں میں ہوتا ہے - یہ رسم الخط صرف تجارتی بیوپار کے لئے مخصوص ہے اور ایک قسم کے آنکڑوں میں لکھا جاتا ہے جسے صرف جاننے والے ہی سمجھہ سکتے ہیں لیکن اگر کوی شخص ناگری حروف تہجی سے تھوڑا بہت واقف ہو تو اس کو صرافی کا حرف شناس بننے میں کچھہ زیادہ دقت نہ ہوگی - ہاں ایک ایسے ہندیات * کے ماہر کو جس نے بجز خوش‌نما ' اور نوک پلک سے درست سنسکرت تحریر کے اور کچھہ نہ پڑھا ہو ' دیہات کے بنئے ! کی بد خط گھسیٹ پڑھنے میں البتہ بہت دقت ہوگی - اُردو کی خوش‌خط تحریروں میں عام طور پر " نستعلیق " کا استعمال ہوتا ہے جو دو لفظوں نسخ اور تعلیق سے مرکب ہے - معمولی اُردو تحریروں میں زیادہ تر " شکستہ " کا استعمال ہوتا ہے - خود اس لفظ " شکستہ " ہی سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ تحریر کتنی بے احتیاطی کے ساتھہ ہوتی ہوگی -

---

* معلومات متعلق ہندوستان' جیسے مصریے مصریات (مترجم —)

! ملاحظہو H. S. Reid. Report. Agra, pp 69 and 70 (مصنف)

سنہ ۱۸۴۴ ع میں ممالک مغربی و شمالی اور پنجاب میں هندیوں کے ۳۷ مطبع اور ۳۳ رسالے وغیرہ تھے - رسالوں کی اشاعت ۲۲۱۶ * تک پہنچ گئی تھی- اخباروں اور رسالوں میں سب سے زیادہ مقبول اور کثیرالاشاعت لاهور کا اردو اخبار "کوہ نور" تھا، لیکن اس کے خریداروں کی تعداد بھی ۳۴۹ سے زیادہ نہ تھی! اس کے اڈیٹر هر سکھ رائے تھے جو مطبع کوہ نور کے مالک بھی تھے - میں اس موقع پر اُن اخبارات کا ذکر نہیں کر رہا هوں جو سال زیر بحث میں انگریزی زبان میں نکلتے تھے - اگر ان کی تعداد بھی دیسی زبانوں کے رسالے اور اخبارات میں شریک کردی جاے، تو اس سال سب کی اشاعت مل کر ایک لاکھ باستھ هزار چار سو آٹھ هوجاتی هے - یعنی پچھلے سال کی اشاعت سے اٹھاون هزار سات سو ترانوے زیادہ، اس لئے کہ پچھلے سال کی تعداد صرف ایک لاکھ تین هزار چھ سو پندرہ تھی † —

جن مطبعوں کا میں نے ذکر کیا هے، ان میں سال زیر بحث کے اندر اخباروں اور رسالوں کے علاوہ دو سو سات کتابیں مشرقی زبانوں میں چھپ چکی هیں۔ سنہ ۱۸۵۵ ع کے متعلق میرے پاس صحیح اعداد موجود نہیں هیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں هے کہ پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی کتابوں کی اچھی خاصی تعداد شائع هوی هے - غالباً ان کتابوں میں انگریزی زبان کی خالص ادبی تصانیف کے ترجمے بھی شامل هیں - انگریزی زبان کی ادبی تصانیف کے جو ترجمے آئندہ کئے جائیں گے، وہ مستحق تعریف ضرور هوں گے، لیکن اس شرط پر کہ وہ کوئی ایسی ترمیم یا اصلاح نہ کریں جس سے اردو ادبیات کی خصوصیت میں کوئی تبدیلی

---

* ملاحظہ هو Allen's Indian mail' No of August 16th 1836. (مصنف)

† Alliens Indian Mail' 31st July 1856. (مصنف)

یا کمی واقع ہوجاے، بقول ملٹن "اتنے زیادہ نفس مذاق نہ بنو کہ غیر یقینی برائیوں کا فیشن ہوجاے" —

چند ہفتے ہوے، مسٹر فرانسیس ٹے لر (Francis Taylor) نے جو دھلی کے ایک دیسی کالج کے پرنسپل ہیں مجھے ان ہندوستانی تصانیف کی ایک فہرست بھیجی ہے جو حال میں سلطنت مغلیہ کی راجدھانی (دلی) میں شائع ہوئی ہیں - اس فہرست میں چند ایسی کتابوں کا بھی ذکر ہے جو میں نے اب تک آپ حضرات‌کو نہیں بتائی ہیں - یہ کتابیں اردو ادب کے لئے ایک قابل قدر اضافے کا حکم رکھتی ہیں - آگرہ گورنمنٹ نے بھی ادارۂ فرانسہ (Institute of France) کو ایک سو پچھتر کتابوں کا ایک ذخیرہ تحفتاً بھیجا ہے، اور اس میں بھی مجھے چند نئی کتابیں نظر آئی ہیں - یہ ذخیرہ میرے قابل فخر احباب مسٹر ولیم میور (William Muir) معتمد حکومت ممالک مغربی و شمالی ہند، اور مسٹر ایچ - ایس - ریڈ (H. S. Reid) ناظم تعلیمات ممالک مغربی و شمالی کے توسط سے وصول ہوا ہے - یہ دونوں حضرات ہندوستانی ادبیات کے جو ایک نہ ایک دن ہندوستان میں سنسکرت اور فارسی ادبیات کی جگہ لے کر رہے گا، بڑے سرگرم معاون اور سرپرست ہیں - اگرچہ ان کتابوں کو انگریزی حکومت نے دیسی کالجوں اور مدرسوں کے نصاب میں شریک کرنے کی غرض سے شائع کیا ہے، لیکن یہ یورپی حضرات اور خصوصیت کے ساتھ سیول اور فوجی محکموں کے اعلی افسروں کے لئے بھی بہت مفید ہیں، جن کے لئے بنگال جیسے صوبے میں رہ کر بھی جہاں کے اکثر اضلاع میں بنگالی بولی جاتی ہے، ہندوستانی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے - اس لئے کہ یہ زبان (ہندوستانی) نہ صرف بنگال کے اکثر مقامات میں بولی جاتی ہے بلکہ کلکتہ، نیز صوبۂ بنگال کے دوسرے شہروں* کی عدالتوں میں صرف یہی زبان

---

* H. H. Wilson. Glossary of Indian Terms, Preface P. 20.

استعمال ہوتی ہے —

حضرات! جن دو فہرستوں کا میں نے ابھی آپ کے سامنے ذکر کیا ہے، اب ان میں سے میں ایک نئے تذکرے کا حال آپ کو سناتا ہوں۔ اس تذکرے کا نام "گلستان سخن" ہے، اور اس کے مصنف مرزا قادر بخش المتخلص بہ 'صابر' ہیں۔ جو خاندان شاہی کے ایک شہزادے مرزا مکرم بخت کے لڑکے ہیں۔ اس خاندان کا ایک سربرآوردہ شخص سراج الدین* اب تک شاہ بلکہ بادشاہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ صابر مولوی امام بخش 'صہبائی' کے شاگرد ہیں، جو آج کل کے اعلیٰ درجے کے ہندوستانی مصنفین میں سے ہیں —

شعر کا شوق آج تک ہندوستانیوں میں بدستور باقی چلا آتا ہے، لیکن اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا ہے۔ ارسطو اپنی کتاب شعریات، باب نہم میں لکھتا ہے کہ "شاعری، بمقابلہ تاریخ کے کہیں زیادہ فلسفیانہ اور سبق آموز ہوتی ہے" لیکن جو فہرستیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں ان میں، نظم کی بہت کم نئی کتابیں نظر آتی ہیں۔ یعنی ایک تو "گیان چالیا" (چالیس اقوال) جو ہندی دوہوں کی شکل میں ہے اور پنڈت شری لال کی لکھی ہوئی ہے جو کئی مفید کتابوں کے مصنف ہیں، اور دوسری "پشپ باٹک" (گلستان) جو گلستان کے باب ہشتم دربارۂ سیرت بادشاہاں کا ترجمہ ہے اور بنسی دھر کا کیا ہوا ہے۔ یہ کتاب آگرے میں طبع ہوئی ہے، اور اشاعت اول میں تین ہزار نسخے چھاپے گئے ہیں۔ ایک اور مصنف قمرالدین نامی نے "گلستان اردو" کے نام سے گلستان کی تلخیص کی ہے اور ساتھ ساتھ فارسی عبارت بھی دے دی ہے۔ انہوں نے بوستان کے اقتباسات کا بھی اسی طرح ترجمہ کیا ہے۔ ان کا ترجمہ نہایت فصیح اور صحیح ہے —

---

* یعنی ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ۱۲ مترجم

ان فلسفیانہ اور اخلاقی کتابوں میں جو حال میں ممالک مغربی و شمالی میں چھپی ہیں، سب سے زیادہ قابل ذکر "صفات رب العالمین" مصنفۂ بابو شری داس ہے - ان مصنف کا نام اگرچہ ہندووں کا سا ہے اور اس کے معنی "لکشمی کے غلام" کے ہیں، لیکن وہ در اصل عیسائی ہیں اور جن چند ہندوستانی عیسائی مصنفین کا ذکر میں نے ابھی کچھہ زمانہ ہوا آپ سے کیا تھا، ان میں ان کے نام کا بھی اضافہ کر لیا چاہئیے —

ایک اور قابل ذکر کتاب 'بھوج پربند سا' ہے یعنی بھوج کی کہاوتوں کا انتخاب - اس پر بنسی دھر نے حاشیہ بھی لکھا ہے - آپ سب واقف ہیں کہ بھوج 'جسے ہندوستان کا سلیمان کہنا چاہئیے' مالوے کا ایک مشہور راجہ تھا - اس نے پانچویں صدی میں اجین میں حکومت کی 'اور ہندوستانی تصنیفات میں اس کا ذکر اکثر آتا ہے —

'بدھی و دیودیت' (کتاب دربارۂ علم عقل) ایک ہندی کتاب ہے 'اور اس میں تعلیم و تربیت کے فوائد کو تفصیل کے ساتھہ بیان کیا گیا ہے -

'شکھا منجری' (گلدستۂ معلومات) یہ چند' اقتباسات کا ہندی ترجمہ ہے جو ایچ - سی' ٹرنر (H. C. Turner) نے ٹاڈ (Tod) کی کتاب "Hints on Self improvement" سے لئے ہیں - ہندی ترجمہ بنسی دھر کا کیا ہوا ہے —

میں اس موقع پر ان اخلاقی قصوں کا بیان بھی مناسب سمجھتا ہوں جو حال میں لکھے گئے ہیں - مثلاً 'فرخ آباد کی کہانی' 'سراج پور کی کہانی' اور 'بدہ پھل و دیا' (درخت عقل' کے' پھل) - یہ آخری کتاب جو پنڈت کشن دت' اسسٹنٹ پروفیسر سنٹرل اسکول' آگرہ کی تصنیف ہے 'ایک اردو کتاب 'کبودھی

• Hindustani Authors and their Works P. 20. and P. 58 of this Volume.

سبودھی ' کا ھندی ترجمہ ھے ' اس کتاب کا ذکر میں پچھلے سال کر چکا ھوں —

تاریخی کتابوں میں ' جن کی تعداد میری پیش نظر فہرستوں میں سب سے زیادہ ھے ' مجھے ' میر خواند' کی مشہور کتاب ' روضۃ الصفا " کا اردو ترجمہ نظر آ تا ھے - اس کتاب میں نہایت قدیم زما نے سے لیکر مصنف کے زما نے یعنی سولھویں صدی عیسوی تک کی ایرانی تاریخ بیان کی گئی ھے —

ایک اور کتاب جو ایک مسلمان عالم مولوی عبیداللہ ابومسلم کی تصنیف ھے ' 'تحفۃ الہند' ھے - اس میں ھندوؤں کے مذھب کی تشریح کی گئی ھے - یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ھو گا کہ مسلمان ھندو عقائد کی تشریح کس طرح کر تے ھیں - وہ اگرچہ اُن کے عقائد کی شکل کو بالکل نہیں بدلتے ' لیکن ان کو بہت کامیابی کے ساتھ اپنے ذاتی عقائد میں ضم کر دیتے ھیں - میں تاریخی سلسلے کی دو اور کتابوں کا بھی ذکر کرنا چاھتا ھوں - ان میں سے ایک تو ' تذکرۃ المشایخ ' ھے ' جس کے مصنف سداسکھ لال ھیں - یہ کتاب سوانح سے تعلق رکھتی ھے ' اور انگریزی سے ترجمہ کی گئی ھے - دوسری کتاب ولسن کی Manual of Ancient History کا اُردو ترجمہ ھے جو تاریخ عالم کے نام سے کیا گیا ھے - اس کتاب کا ایک ھندی ترجمہ بھی ' جگت درتانت' (تاریخ عالم) کے نام سے شائع ھوا ھے —

جدید مطبوعات میں ' اخلاقی تصا نیف کا حصہ بھی اھم ھے - میں سب سے پہلے ' چھندو دی پکا ' (عروض کا چراغ) کا ذکر کروں گا - یہ رسالہ ھندی عروض پر ھے ' اور سنہ ۱۸۵۳ ع میں آ گرے میں چھپا ھے - اب تک ھندی زبان کے عروض سے کو ئی واقف بھی نہ تھا ' اور جس طرح اردو عروض فارسی عروض کی کسی قدر بدلی ھوئی شکل ھے - اسی طرح ھندی عروض ' تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ' بالکل سنسکرت عروض کی طرح ھے - لیکن اس موضوع (ھندی عروض) پر ایک رسالے کی پھر بھی ضرورت تھی ' اور بنسی دھر نے اس کمی کو پورا کر دیا ھے —

صرف و نحو کی ان کتابوں کا ذکر جو حال ھی میں ھندی اور اردو دونوں زبانوں

میں شائع ہوئی ہیں ' طوالت سے خالی نہ ہوگا - یہ قواعد جتنے اردو اور ہندی سے متعلق ہیں ' اتنے ہی فارسی اور سنسکرت سے ' پھر بھی مجھے امید ہے کہ اگر یوروپی حضرات انہیں پڑھیں گے تو انہیں ان سے کئی نئی باتیں حاصل ہوں گی :—

مذکورۂ بالا کتب کے بعد انشا کی کتابوں کا نمبر ہے - ان میں حسب ذیل کتابیں نظر آتی ہیں:—

پتر مالی کا (پتیوں کا ہار) مصنفۂ شری لال ' ہندی زبان میں؛

' انشاے خرد افروز ' مصنفۂ قمر الدین ' اردو میں - اس کتاب کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں ' اور ہزاروں نسخے فروخت ہو چکے ہیں—

انشاےخلیفہ'یہ فارسی کتاب 'انشاےشاہ محمد'کا اردو خلاصہ ہے' فارسی عبارت بھی ساتھہ ساتھہ دی گئی ہے - انشاے شاہ محمد' ہندوستان میں بہت مستند مانی جاتی ہے اِس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ممالک مغربی و شمالی کے فاضل ناظم تعلیمات مسٹر ریڈ نےجب سنہ ۱۸۵۳ - ۱۸۵۴ ءمیں دیہی مدارس کا دورہ کیا تو انہیں تین سو تیتا لیس مدرسوں کے طلبا کے ہاتھوں میں یہی کتاب نظر آئی —

ایک اور کتاب ' سدہ درپن ' (پاکی کا آئینہ) ہے - یہ ہندوستانی زبان میں ہے اور اس میں آداب و اخلاق کے متعلق ہندوؤں کے نقطۂ خیال کا بیان کیا گیا ہے - اس کے مصنف سیٹھہ بدھی چند نارائن انسپکٹر مدارس متھرا ' ہیں - یہ صاحب کئی کتابوں کے مصنف ہیں —

' بدیانکر ' ہندی زبان میں شری لال کی تصنیف ہے - اسی کو بنسی دھر نے ' حقائق الموجودات ' کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا ہے - اس میں موجودات عالم' ستارے' نظام شمسی' حرارت' روشنی' کرۂ ہوا ' کہر' بادل' دنیاے حیوانات' نباتات معدنیات وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے —

اب میرا فرض ہے کہ فن زراعت پر جو چند کتابیں تصنیف ہوی ہیں ' ان کا

بھی ذکر کروں- ان کا مطالعہ ھماری زراعتی انجمنوں کے لئے یقیناً پر از معلومات ھوگا - یہ کتابیں حسب ذیل ھیں :—

" کھیت کرن " اس کے مصنف کالی رائے ڈپٹی کلکٹر فتح گڈھ ھیں - یہ آج کل کے ایک مشہور مصنف ھیں - کتاب ھندی میں ھے اور اس میں ممالک مغربی و شمالی کے ھندوستانی کاشتکاروں کے دستور اور طریقوں کا حال درج ھے - یہ رسالہ آگرہ اور دھلی دونوں جگہ کئی کئی بار اُردو اور ھندی میں چھپ چکا ھے - اس میں مختلف قسموں کی مٹی' طرح طرح کے اوزاروں اور آب پاشی کے مختلف طریقوں کا بیان کیا گیا ھے - نیز تحصیل مالگذاری کے طریقوں کا حال اور زائد تحصیل کے متعلق چارہ جوئی کرنے کی ھدایتیں بھی کی گئی ھیں - اس رسالے میں نقشے بھی ھیں اور اصطلاحیں فارسی اور دیوناگری دونوں تحریروں میں دی گئی ھیں —

" کسان اپدیش " - اس کے مصنف بنسی دھر ھیں - کتاب ھندی میں ھے ' اور اس میں بھی آبادی' ملکیت کے کھاتوں ' نیز پٹواریوں کے سالانہ حساب وغیرہ کی تشریح کی گئی ھے - میں سمجھتا ھوں کہ یہ وھی کتاب ھے جو موھن لال اور روشن علی کی متفقہ کوشش سے اردو میں ' " پند نامہ کاشتکاراں " کے نام سے چھپ چکی ھے- یہ دونوں حضرات تعلیم یافتہ ' اور آج کل کے ممتاز اھل قلم ھیں' اس کتاب کا ایک فارسی ' اردو اڈیشن بھی ھے —

اگر چہ مجھے اس کا احساس ھے کہ اختصار کی بہت کچھ کوشش کے باوجود بھی اسمائے کتب کی فہرست بہت طویل ھو گئی ھے - لیکن میں اس میں ایک کتاب کے اضافے کی جسارت اور کروں گا - اور وہ میری کتاب " ھندوستانی زبان کے مصنفین کا تذکرہ " * کا اردو ترجمہ ھے ' یہ ابھی حال ھی میں دلی

---

* مطبوعہ Journal ! Institute بابتہ اکتوبر سنہ ۱۸۵۵ ع ۱۲۰ مصنف

سے شائع ہوا ہے اور اس کے مترجم محمد ذکاء اللہ ہیں - ابھی تین دن ہوے اس ترجمے کی چند جلدیں مجھے وصول ہوئی ہیں - مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے اور مجھے یہ دیکھہ کر بہت خوشی ہوئی کہ دلکش ہندوستانی زبان پر میری یہ ادنی درجہ کی تصنیف خود ہندوستانیوں میں مقبول ہوئی - میری تصنیف کے ہندوستانی زبان میں ترجمہ کئے جانے کا یہ پہلا موقع نہیں ہے' چند سال پہلے میری ایک اور کتاب "تاریخ ادبیات ہندوستان" (History of Hindustani Literature) کا " طبقات شعراے ہند" کے نام سے اردو ترجمہ ہو چکا ہے —

دیسی مدارس کے لئے جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ بہ یک وقت ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شایع ہوئی ہیں تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں ایکساں طور پر ان سے مستفید ہوسکیں - اکثر یہ فارسی زبان میں بھی شایع ہوئی ہیں' جیسے ہندوستانی مسلمانوں کی لاطینی سمجھنا چاہئے' اور جسے مدارس میں (اور ہندووں کے مدارس میں بھی) اردو کے ساتھہ ساتھہ سکھایا جاتا ہے' اصلیت یہ ہے کہ اردو سیکھنے کے لئے فارسی زبان سے واقف ہونا ناگزیر ہے —

حضرات' میں نے آپ کو ان مذہبی کتابوں کا حال نہیں سنایا ہے جو سرگرم مبلغین دیسیوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے شایع کرتے رہتے ہیں - ایسی کتابوں میں عہدنامہ قدیم اور خصوصیت کے ساتھہ عہد نامہ جدید کے ترجمے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں - چاہے ان مقدس کتابوں کو پڑھ کر بہت کم ہندوستانیوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہو تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن لوگوں نے انھیں پڑھا ہے ان کی زندگی پہلے سے بہتر اور زیادہ خوشی کی ضرور ہوگئی ہے' کیوں کہ بقول ینگ (Young) —

" کئی سرکش حیات سے گوشہ نشین ہونے کے بعد انجیل

پڑھو اور خوش رہو اس میں ایسے حقائق کی کثرت ہے
جن سے زندگی کا سکون بدرجہ أتم حاصل ہوتا ہے۔
اس کے مقدس صفحے کو پڑھو، اور اس کا احترام کرو،
وہ ایک ایسا صفحہ ہے جہاں " ابدیت " کی قسم
نظر آتی ہے، ویسا ایک صفحہ ساری مخلوقات مل
کر بھی کوشش کرے تب بھی پیدا نہیں کرسکتی۔
اور زبردست سی زبردست آگ بھی اسے برباد نہیں
کر سکتی " —

دکھنی مرثیے ایڈنبرا میں

(پہلی قسط)

از

(جناب مولوی سید محی الدین قادری صاحب)

[اردو ادب پر غور کرنے والوں کو یہ خبر خوش کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ سر زمین اسکاٹ لینڈ کے قدیم اور خوبصورت دارالحکومت ایڈنبرا میں اس زبان کے چند مخطوطے بھی محفوظ ہیں، جن میں سے دو تین ضرور قابل قدر ہیں کیونکہ اُن کی وجہ سے اردو زبان کا ایک اہم دور ایک حد تک روشنی میں آجاتا ہے -

ان قابل ذکر مخطوطوں میں سے فی‌الحال دکھنی مرثیوں کے متعلق سرسری معلومات کی پہلی قسط پیش کی جاتی ہے تاکہ اُردو کی تحقیقات کرنے والے اُن سے نا واقف نہ رہیں -

کتب خانۂ ایڈنبرا یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقی کے کٹلاگ میں "مراثی ہاشم علی" کے عنوان کے تحت ان کی دو جلدوں کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن در اصل ان میں سے ایک تو ہاشم علی کے تقریباً ڈھائی سو مرثیوں کا مجموعہ ہے، جس کو مصنف نے "دیوان حسینی" کے نام سے موسوم کیا ہے، اور جس کے متعلق چند معلومات اس مضمون میں پیش کی جائیں گی - اور دوسری جلد ایک "بیاض" ہے جس میں قریب اسی (۸۰) شاعروں کے تین سو مرثیے ہیں - افسوس ہے کہ یہ بیاض ابتدائی اور آخری صفحوں کے لحاظ سے نامکمل ہے - یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ

حقیقت میں اس کا کیا حجم تھا - اور اس وقت اس میں اول اور آخر سے کتنے کتنے صفحے غائب ھیں -

اس بیاض پر تفصیل سے کچھہ لکھنے کے لئے خاص فرصت درکار ہے۔ تاہم اس میں جن جن شاعروں کے مرثیے موجود ھیں ان کی میں نے حروف تہجی کے لحاظ سے ایک فہرست ترتیب دے لی ہے جو اس مضمون کے ضمیمہ کے طور پر پیش کی جاتی ہے تاکہ اہل تحقیق و تفتیش کو فی الحال کچھہ معلومات حاصل ہوجائیں - اس کے علاوہ خود اس بیاض کی جو تفصیلی فہرست تیار کی گئی ہے وہ کسی دوسری قسط کے ساتھہ پیش کی جاے گی۔ اُس کی مدد سے آئندہ تحقیق کرنے والے بیاض میں خاص خاص شاعروں اور مرثیوں کا صحیح سلسلۂ تاخر و تقدم معلوم کرکے اُن کے زمانے وغیرہ کے متعلق کوئی پتے چلاسکیں گے -

چونکہ ان چھٹیوں سے پہلے اس مضمون کا ختم کردینا ضروری تھا اس لئے جو کچھہ لکھا گیا ہے بالکل برا روی اور جلدی کا نتیجہ ہے اور اس کے علاوہ چونکہ اس مضمون کا سارا مواد صرف مرثیوں کے زیر نظر دو جلدوں اور میری موجودہ یاد پر مبنی ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ اکثر جگہ مجھے بہت ھی اختصار سے کام لینا پڑا ہے -

[سید محی الدین قادری]

کتب خانہ ایڈنبرا یونیورسٹی
۲ جنوری سنہ ۱۹۲۹ ء

دکھنی مرثیوں کی ابتدا کے متعلق فی الحال کوئی تحقیقی بات نہیں کہی جاسکتی - لیکن اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ وھاں بہت قدیم زمانے ھی سے مرثیہ گوئی کے آغاز ھوچکا ھوگا ، کیونکہ بیجاپور اور گولکنڈا دونوں حکومتیں تقریباً شروع ھی سے شیعہ مذھب کی پیرو تھیں -

ہمارے زیر نظر مخطوطوں کو اردو مرثیہ‌گوی کے آغاز سے کوئی تعلق نہیں یہ اس زمانے کے مرثیے ہیں جب دکھنی مرثیہ گوئی کمال کو پہنچ چکی تھی - وہ ثابت کرتے ہیں کہ دکھن کی شیعہ سلطنتوں کے زوال کے ساتھہ ہی اس کو بھی زوال نہیں شروع ہوا بلکہ اس کا سلسلہ باقی تھا - یہاں تک کہ بعد میں شمالی شاعروں نے اس کو اپنے ہاتھہ میں لیکر اس میں اور بھی ترقی دی ' اور آخر کار ' انیس ' اور ' دبیر ' جیسے استادوں نے تو اُس کو اوج کمال پر پہنچا دیا —

یہ کچھہ کم تعجب کی بات نہیں کہ دکھن میں ' اس گئے گذرے زمانے میں بھی ' مرثیہ گوئی برابر جاری رہی - اور اس طرح ' ہاشمی ' اور ' مرزا ' اور ' انیس ' اور ' دبیر ' کے درمیانی زمانے میں مرثیوں کی زمین بالکل بنجر نہیں پڑی رہی - زیر نظر مرثیوں کے مطالعہ کے بعد یہ خیال دور ہوجاتا ہے کہ اردو مرثیہ گوئی دکھن میں شروع ہو کر بالکل ختم بھی ہو گئی - اور یہ کہ شمالی شاعروں کو از سر نو مرثیہ گوئی کا آغاز کرنا پڑا —

دکھنی مرثیوں کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کا مرثیہ پن ہے - اور اس حیثیت سے وہ شمال کے مرثیوں سے متفرق ہیں - وہ مرثیہ گوئی کے اصلی مقصد کو مدنظر رکھہ‌کر لکھے گئے ہیں - ان کا مقصد رونے رلانے کے سوا کچھہ نہیں - شمال میں بھی ابتدا میں یہی رجحان تھا - لیکن ' انیس ' اور ' دبیر ' نے اس کے رخ کو بالکل بدل دیا اور ان کے یہاں مرثیے اردو شاعری کے اہم ترجزو بن گئے - اس میں بہت کم شبہ کی گنجائش ہے کہ دکن میں بھی اس طرح کا رجحان شروع ہو چکا تھا کہ مرثیہ نگاری میں رونے رلانے کے علاوہ شعریت کا بھی لحاظ رکھا جائے جیسا کہ ' روحی ' ' رضی ' ' قادر ' ' ندیم ' اور ' نظر ' وغیرہ کے مرثیوں سے ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ بات عام طور پر مقبول نہیں ہوئی تھی - ایک دفعہ ' عزلت ' نے اپنے مرثیے کے آخر میں اشارہ کیا تھا کہ :-

خام مضمون مرثیہ کہلے سوں چپ رہنا بھلا

پختہ درد آمیز عزلت نت‌توں احوالات بول

مگر اس کے ایک بڑے ہم عصر ' رضا ' نے مرثیے کے اصطلاحی مضمون اور مقصد کو دلیل بنا کر اس طرح اس کا جواب پڑھا کہ :-

اے عزیزاں گرچہ ' عزلت ' مرثیہ میں یوں کہیا

خام مضموں مرثیہ کہنے سوں چوپہ (کذا) رہنا بھلا

لیکن اس مظلوم بے سر کا بیاں کرنا روا

تا کہ سن کر یوں بیاں ہو ویں سبہا اشک بار

اگرچہ شمالی مرثیوں کی طرح دکھنی مرثیے موضوع کے لحاظ سے زیادہ مضمون خیز نہیں ہیں تاہم ان میں بھی امام زادہ علی اصغر کی شہادت ' اور امام قاسم اور بی بی سکینہ کی شادی اور پھر ہمیشہ کی جدائی پر بہت کچھہ توجہ صرف کی گئی ہے - خصوصاً علی اصغر کی شہادت پر دکھن کے قریب قریب ہر مرثیہ گو نے نئے نئے طریقے سے ماتم کیا ہے —

اس امر کا اظہار بھی شمال اور جنوب کے اردو مرثیوں کا مقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لئے شاید غیر ضروری نہ ہوگا کہ دکھنی مرثیہ بالعموم مربع‌بندوں کی شکل میں لکھے گئے ہیں . ہر مرثیے کے پہلے بند کے چار مصرے ہم قافیہ وہم ردیف ہو تے ہیں - لیکن ہر بند کا چوتھا مصرعہ اسی ردیف اور قافیہ میں لکھا جا تا ہے جو ابتدا ئی بند کا ہو تا ہے - چند مرثیے مخمس کی شکل میں بھی ہیں- اور سلام ' درود ' اور فاتحہ وغیرہ کے موضوع کے لئے عموماً غزل کی شکل استعمال کی گئی ہے —

دکھنی مرثیوں کی ایک دور خصوصیت ان کی تاریخی معلومات ہیں - اس بارے میں وہ شمالی مرثیوں سے زیادہ اہم ہیں - ان سے شاعروں کے نا م ' ان کی زندگی ' ان کے وطن ' اور زما نے وغیرہ کے متعلق بھی معلومات ہو تے

ھیں - اور یہ باتیں اس لئے زیادہ اہم ھیں کہ ان مرثیہ نگاروں پر اس وقت کسی اور ذریعے سے کوئی روشنی نہیں پڑتی —

دکھنی مرثیہ نگاری کی نسبت اس وقت ان چند اشاروں کے قلمبند کرنے کے بعد اور ھاشم علی کے متعلق بعض نوٹ پیش کرنے سے پہلے اس امر کا اظہار بھی ضروری معلوم ھوتا ھے کہ اس وقت ھاشم علی پر اس لئے نہیں قلم اٹھایا جارھا ھے کہ وہ بہترین دکھنی مرثیہ گو ھیں بلکہ اس لئے کہ اس وقت سب سے زیادہ انہیں کے مرثیے موجود ھیں —

(۲)

اس وقت جس مرثیہ گو پر ھم چند نوٹ لکھیں گے اس کا نام ھاشم علی ھے - ان ھاشم علی کو نصرتی کے ھم عصر ھاشمی سے کوئی تعلق نہیں - یہ بات یہاں ضرور ملحوظ رھے کہ ھاشم علی کبھی مرثیے میں خود کو ھاشم یا ھاشمی نہیں لکھتے - ان کے دیوان (یعنی مجموعۂ مراثی) کے مطالعہ کے وقت میں نے حتی‌الامکان کوشش کی کہ کہیں صرف لفظ ھاشمی کا استعمال دیکھوں مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ھے میں نے کسی مرثیے کے آخر میں ھاشم علی کے سوا کوئی اور تخلص نہیں پایا - یہی وجہ ھے کہ جب بیاض مراثی میں مجھے ایک ایسا مرثیہ ملا جس کے آخری شعر یہ ھیں —

تھا اے ھاشم مجھ کوں عظمت ترک اشعار جدید

(عزم ؟)

بس کے ھے دل میں ھجوم درد حسنین شہید

اشک کے طفلاں ھو دامن گیر ماتم کر مزید

لوح دل سیں یو سطر غم کی مٹانے نیں دئیے

تو میں نے اس کو ھاشم علی کے مرثیوں کی فہرست میں نہیں داخل کیا ' بلکہ جیسا کہ اس مضمون کے آخر میں فہرست ملاحظہ کرنے سے واضح ھو گا '

ہاشم اور ہاشم علی دو علحدہ علحدہ نام لکھے ہیں - تاہم ہاشم پر استفہامیہ لگادیا ہے - ممکن ہے کہ خرق عادت کے طور پر ہاشم‌علی نے ایک دفعہ ہاشم تخلص بھی استعمال کردیا ہو!

ہاشم علی، عادل‌شاہی ہاشمی سے تقریباً ایک صدی بعد کے شاعر ہیں - وہ ولی اورنگ‌آبادی کے ہم عصر تھے اُن کے موجودہ دیوان میں ایک دو تاریخیں ایسی ملتی ہیں جن سے اُن کے زمانے کا صحیح تعین ہوسکتا ہے --

۱- مرثیہ نمبر ۲۰ کے عنوان کے طور پر انہوں نے حسب ذیل عبارت لکھی ہے

"...... از جملہ تفضلات امام شہید کہ برین عاصی‌شدہ آنست‌کہ برادر ایمانی حافظ فضل‌الدین درعالم رویا بتاریخ بیستم ماہ مبارک رمضان سنہ ۱۱۴۸ ہجری یک ہزار (؟) و چہل هشت‌مشاهدہ نمود کہ گویا پائے‌علاوہ (الاوہ- موجودہ) آنحضرت نشستہ و مجبان جمع شدہ‌اند کہ یکایک از شکل ضریح سوز (؟) صدائے برآمد حاضران مجلس همگی بہ تعظیم آں برخاستہ، دست ہائے ادب بر سینہ نہادہ، بجہت استماع ندائے روح افزا عینے سراپا گوش گشتند، کہ بار دیگر آواز برآمد، و نام قایل بیان غم بر زبان راندند کہ کجاست، چوں ایں کمینہ‌را نیز دراں محفل حاضردید کہ با نیز تمام سر را قدم‌ساختہ نزدیک ضریح مقدس آمدہ‌ایستاد بار سیوم حکم عالی صادر شد کہ آں مرثیۂ واویلا رابخواں -حسب فرمان وحی ترجمان شروع بخواندن‌نمود کہ ازاں خواب بہ‌زبیدار شدہ ایں پائے سلطی آنست کہ در بارگاہ سلیمانی وصول شدہ" —

اس سے جہاں مصنف کے مذہبی معتقدات پر روشنی پڑتی ہے، جس پر آیندہ نظر ڈالی جائے گی، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم علی سنہ ۱۱۴۸ ہجری میں خاصے مشہور مرثیہ گو ہوچکے تھے - اور اُن کے مرثیے اس قدر پر اثر سمجھے جاچکے تھے کہ

اُن کی داد دینے اور سننے کے لئے ان کے اعتقاد کے مطابق حضرت امام حسین بھی اُن کے ایک دوست کے خواب میں تشریف لاے تھے —

۲- ایک جگہ (یعنے مرثیہ نمبر ۱۷۵ کے آخر میں) مرثیے کی تاریخ تصنیف یوں بیان کی ہے :—

جب منجم نے کیا اس درد نامہ کا حساب	غین و قاف و سین و طا آیا رقم اندر کتاب
سن کے یو تاریخ کوں سینے میں دل ہوتا کباب	ختم کر ہاشم علی قاسم کی شادی کے بین

گویا یہ مرثیہ سنہ ۱۱۶۹ ھ میں لکھا گیا ہے —

ان دونو شہادتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہاشم علی گیارھویں صدی ہجری کے آخر یا بارھویں کے اوائل ؔ میں پیدا ہوے ہوں گے اور یہ کہ بارھویں کے آخر میں انتقال کیا ۔

ایک اور طرح سے بھی ہاشم علی کے زمانہ پر روشنی پڑتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہاشم علی نے اپنے مرثیوں میں دکن کے مشہور شاعر ' قادر ' کا دو دفعہ ذکر کیا ہے - اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ تو قادر کی زندگی میں ان کی طرف اشارہ کیا اور دوسری دفعہ اُن کی وفات کے بعد —

' قادر ' دکن کے بہترین مرثیہ گویوں میں سے ہیں - گجرات اُن کا وطن نہیں تھا بلکہ دکن کا کوئی حصہ ۔ یہاں اُن کے ۱۷ اعلیٰ درجہ کے مرثیے موجود ہیں - ان میں کل ۳۰۵ شعر ہیں اور بلحاظ مقدار خود ہاشم علی اور غلامی کے سوا یہاں سب سے زیادہ انہی کے مرثیے ہیں -اگرچہ خوبیٔ کلام کے مدنظر فی الحال اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا غلامی بہتر ہیں یا قادر ؟

' قادر ' ہاشم علی کے ہم عصر تھے - ان کے مرثیوں میں سے ایک میں عجیب طرح سے تاریخ تصنیف کا ذکر ایا ہے - وہ لکھتے ہیں —

سن اگیارہ سو اوپر اونچاس سال	سبز بانا قادرا کا لہو میں لال
ختم کریو مرثیہ پایا وصال (؟)	ہاے کیا غم ' غم پہ غم ہے مستقیم

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قادر سنہ ۱۱۴۹ ہجری میں زندہ تھے - اور چنانچہ جب ہاشم علی نے یہ شعر لکھا —

ہاشم علی عجب نین یو مرثیے کوں سن کر تجھ پر خلیفہ قادر تحسین کرے دکھن میں

وہ بقید حیات تھے لیکن اس کے بعد ہی (اور بہت ممکن ہے کہ سنہ ۱۱۶۹ ھ سے پہلے) ان کا انتقال ہوگیا - کیوں کہ ایک دوسرے مرثیے میں ہاشم علی کہتے ہیں -

ہزار حیف نیں شاعران دکھن سو 'روحی' و 'مرزا' او 'قادر' نہیں

ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تینوں ان کے سامنے مرگئے تھے اور ان کی وفات پر ہاشم علی کو افسوس بھی ہوا تھا —

اس تمام تفصیل سے یہ ثابت کرنا بھی مقصود تھا کہ سنہ ۱۱۴۸ ھ اور سنہ ۱۱۶۹ ھ سے متعلق ان کی ذاتی شہادتوں کے علاوہ سنہ ۱۱۴۹ ھ کی بھی ان کے زمانہ کے متعلق ایک بالوساطہ شہادت موجود ہے —

اسی سلسلے میں ان شاعروں کی نسبت بھی کچھ لکھنا دلچسپی سے خالی نہیں جن کا ہاشم علی نے ذکر کیا ہے اور جس سے ان کا ماحول بھی معلوم ہوتا ہے —

'قادر' کے ساتھ ایک ہی مصرعہ میں 'روحی' اور 'مرزا' کا تذکرہ کرنا ضرور قابل توجہ ہے - بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مرزا سے دکن کے ان دو شاعروں سے کوئی ایک مراد ہے جن میں سے ایک کا تعلق بیجاپور سے تھا اور دوسرے کا گولکنڈے سے - بیجاپور کے مرزا کو انتقال کئے ہوے اس وقت تک غالباً بہت زمانہ گذر گیا ہوگا کیونکہ موجودہ معلومات کی بنا پر اُن کا انتقال علی عادل شاہ ثانی ہی کے زمانہ میں یعنے سنہ ۱۰۸۳ ہجری سے پہلے ہوچکا تھا - اور یہ ظاہر ہے کہ ہاشم علی جن مرزا کا ذکر کر رہے ہیں و یقیناً وہ مرزا ہیں جو یا تو ان کے ہم عصر تھے یا جنھوں نے ان کے قریبی زمانے میں انتقال کیا تھا -

گولکنڈے کے مرزا ممکن ہے ہاشم علی کے زمانے تک زندہ ہوں - کیونکہ سنہ ۱۰۱۸ ھ

کے بعد ان کا بقیدہ حیات ہونا مسلم ہے - بہت ممکن ہے کہ وہ پچیس تیس سال اور بھی زندہ رہے ہوں - لیکن یہاں جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ گولکنڈے کے مرزا سے عام طور پر مرثیے نہیں منسوب کئے جاتے - سمجھا یہ جاتا ہے کہ صرف بیجا پور کے مرزا مرثیہ گو تھے -

یہ بحث اس لئے بھی زیادہ قابل توجہ ہے کہ اسی پران پندرہ مرثیوں کی قسمت کا فیصلہ منحصر ہے جو یہاں "بیاض" میں مرزا کے نام سے موجود ہیں اور جن میں تقریباً ۲۱۵ شعر ہیں - اگر یہ مان لیا جائے کہ ان مرثیوں کے مصنف گولکنڈے ہی کے مرزا ہیں تو یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ وہ سنہ ۱۱۵۰ تک زندہ بھی تھے - کیونکہ مرزا کے جو مرثیے یہاں موجود ہیں ان میں ایک جگہ قادر کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ گویا وہ اس وقت مرچکے تھے - مرزا لکھتے ہیں :-

یہ مرثیہ بو تراب سیتے قبول پاوے تو کچھ عجب نیں

کہ روح قادر کی زار رووے پڑے جو مرزا دکن میں غم تھیں

یاد رہے کہ مرزا جیسا کہ ان کے ایک متذکرہ شعر سے ظاہر ہوتا ہے سنہ ۱۱۴۹ھ تک زندہ تھے --

اس میں بہت کم شک کی گنجائش ہے کہ 'مرزا' 'قادر' کی طرح دکن ہی کے شاعر تھے - وہ ایک جگہ کہتے ہیں --

در ملک ہند' پورب و پچھم ہے سوگ میں
سب سے ادھک عزا ہے بہ دکھن حسین کا

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مرزا کے مرثیے اس مجموعے کے بہترین مرثیوں میں سے ہیں - اُن کا مصنف یقیناً ایک اعلیٰ درجے کا اور پختہ شاعر ہوگا --

پس یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہاشم علی نے جس مرزا کا ذکر کیا ہے وہ گولکنڈے کے مرزا ہیں جنھوں نے مرثیے بھی لکھے اور جو سنہ ۱۱۵۰ھ تک زندہ بھی تھے - یا یہ کہ وہ دکن کا کوئی اور بڑا مرثیہ گو شاعر تھا، جو ولی، ہاشم علی، اور قادر کا ہم عصر تھا اور جس نے قادر کے بعد اور ہاشم علی سے پہلے انتقال کیا --

اس بحث کو بند کرتے وقت میں اپنا یہ اندیشہ بھی ظاہر کردینا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ضروری ہے کہ یہ سب مرثیے ایک ہی مرزا کے ہوں ؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ بیاض جمع کرنے والے نے (جس طرح بعض قدیم شاعروں مثلاً ہاشمی اور اور شاہی کے مرثیوں کے نمونے دئے ہیں، یا بعضوں مثلاً بسمل اور ہادی کے فارسی مرثیے بھی شامل کر لئے) قطب شاہی مرزا اور عادل شاہی مرزا دونو کے مرثیے نقل کر لئے ہوں، اور پھر ہماری بدقسمتی سے اس کا خیال نہ رکھا ہو کہ ہر مرثیہ پر اس کے خاص مصنف کی طرف اشارہ کیا جاے --

اگر واقعی یہ مرثیے دو مختلف شاعروں کی پیداوار ہیں تو نہ معلوم آئندہ ایسا موقع بھی آسکے گا کہ کوئی خدا کا بندہ دو شاعروں کے مرثیے علحدہ علحدہ کرکے ہر حقدار کو اس کا صحیح حق پہنچاے --

ہاشم علی کے متذکرہ شاعروں میں تیسرا نمبر روحی کا ہے - بیاض میں ان کے زیادہ مرثیے موجود نہیں ہیں - تاہم جس قدر بھی ہیں اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے ممتاز ہیں - روحی کے مرثیوں میں شعریت اور تغزل کا جتنا رنگ غالب ہے کسی اور دکھنی مرثیہ گو کے یہاں نہیں - یہاں ان کے کل پانچ مرثیے ہیں جن میں پچاس سے بھی کم شعر ہیں --

روحی ایک اچھے شاعر ہوں گے - ان کے مرثیے ان کی خوبیء کلام کا پتہ دیتے ہیں - ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف مرثیہ گو نہیں تھے، غزل گوئی میں خاصی مشق کی ہوگی - ایک مرثیے سے چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں

تا کہ اس کا اندازہ ہو کہ روحی جیسے کامیاب شاعر بھی عزلت کے هم خیال تھے —

آج غم ناک هیں چمن کے گل
بلکہ دل چاک هیں سمن کے گل
غم زدہ سینہ داغ حیران هیں
نرگس، لالہ، یا سمن کے گل
یوں نہ لالے شفق کے دستے هیں
لہو میں ڈوبے هیں سب گگن کے گل
جب سنے شہ کی بات مجلس میں
جل بجھے شمع انجمن کے گل
نقش پا دیکھہ دل هوس رکھتا
سر پہ رکھنے کوں تجھہ چرن کے گل
خوش لگے تجھہ طبع سیں اے روحی
دل کے باغاں منے سخن کے گل

نہ معلوم اس طرح کے مرثیوں کو دیکھنے کے بعد 'رضا' کا دیا حال ہوا ہو —

روحی کی زندگی کی نسبت فی‌الحال کوئی معلومات نہیں - 'قائم' نے اپنے تذکرے میں البتہ ایک روحی کا ذکر کیا ہے جو حیدرآباد کے پیر زادے تھے - مگر نہ معلوم وہ بزرگ یہی روحی هیں یا کوئی اور ؟ یہ ظاهر ہے کہ ان روحی کا هاشم علی کی زندگی هی میں انتقال هو چکا تھا —

هاشم علی کے دیوان میں ایک اور شاعر کا بھی ذکر آتا ہے - وہ اپنے مرثیے نمبر ۱۰ کے عنوان میں لکھتے هیں :—

" تضمین غزل خواجہ حافظ شیرازی کہ حافظ رضی نامی شاعر نیز کردہ بود "

اس سے یہ پتہ چلتا ھے کہ حافظ رضی جن کے نو مرثیے بیاض میں موجود ھیں ' اور جو اچھے مرثیہ گویوں میں سے ھیں ' ھاشم علی کے زمانے سے پہلے گذرے تھے یا انھی کے زمانے میں تھے - رضی غالباً گجرات کے شاعر تھے - خود انھوں نے حافظ کی مشہور غزل " دل می رود زدستم صاحبدلاں خدا را " کی تضمین ایک اور شاعر 'بے خبر ' کی تقلید میں کی ھو گی - " بیاض " میں ' بے خبر ' کی تضمین کے بعد ھی حافظ ' رضی ' کی تضمین نقل کی گئی ھے - لیکن حافظ ' رضی ' کا یہ مرثیہ ' بےخبر ' اور ھاشم علی دونو کے مرثیوں سے بہتر ھے —

ھاشم علی کے زمانے اور ان کے قریبی شاعروں پر چند نوٹ لکھنے کے بعد مناسب معلوم ھوتا ھے کہ ان کے وطن کی نسبت ان کے کلام سے جو روشنی پڑتی ھے اس کو بھی ظاھر کر دیا جائے —

کٹلاگ کے مرتب نے انھیں برھان پوری لکھا ھے ' اگرچہ ان کے مرثیوں سے اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا - ان سے صرف اس قدر علم ھو تا ھے کہ وہ گجرات کے شاعر تھے ' اور غالباً اس شہر میں رہتے تھے جس کو وھاں کے باشندے شاید ' نگر ' کہتے ھوں - کیونکہ اپنے مرثیوں میں انھوں نے دو دفعہ نگر کا اس طرح ذکر کیا ھے :

۱ - شہ کے غم میں آہ اے ھاشم علی زینہار ھر گز نہ کر توں بے دلی
سن نگر میں شور محشر ھو گلی ھے شب قتل شہیداں آج رات

(مرثیہ نمبر ۴۳ کے آخری شعر)

۲ - یو نگر میں شور شہ کے باج ھے اس الم کا نالہ گھر گھر آج ھے

(مرثیہ نمبر ۴۸ کا آخری شعر)

یہاں لفظ ' نگر ' برھان پور کے لئے ممکن ھے بالکل اسی طرح استعمال کیا گیا ھو جس طرح شہر حیدرآباد دکن کو وھاں کے لوگ اختصار کے لئے بالعموم بلدہ یا شہر کے لفظوں سے یاد کرتے ھیں—

رہا اس کا ثبوت کہ یہ نگر گجرات کا کوئی شہر ہوگا ' یوں ملتا ہے کہ ہاشم علی نے چند مرثیوں میں دکن کو اس طرح یاد کیا ہے کہ گویا وہ وہاں نہیں رہتے ۔ اس کے برخلاف گجرات میں رہنا حسب ذیل شعروں سے ثابت ہوتا ہے —

ہاشم علی لکھا توں بیکس دولہن کی باتاں
اس غم سے ہے جگر خوں' اور چشم اشک ریزاں
گجرات میں پڑے جب یہ مرثیے کو یاراں
سن کر چلے ہیں روتے دکھنی دکھن کوں اپنے (مرثیہ نمبر۲۲۷)

معلوم یہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں دکھنی گجرات کو اکثر جایا کرتے اور وہاں کے شاعروں سے مستفید ہوتے تھے ' یہ بات صرف ولی اورنگ آبادی ہی تک محدود نہیں تھی۔ ہاشم علی کے علاوہ ایک اور مشہور شاعر ' رضا' نے بھی دکھنیوں کا اس بارے میں ذکر کیا ہے وہ اپنے ایک مشہور مرثیے کے آخر میں لکھتے ہیں:—

نیں ہے طاقت تا کروں غم کا سومیں سارا بیاں
تم کرو زاری شہاں کی آج اے پیر و جواں
آفریں مجھ کوں کہو اے شاعراں و ذاکراں
کرتا ہوں اب بس سخن کوں ' آج ہے قاسم کا بیہ (بیاہ)
اے ' رضا ' قاسم کے جلوہ کا بیاں کر توں تمام
تجھ کوں محشر میں شفیع ہوکر چھڑاویں گے امام
مرثیہ تجھ کن لکھا کر لے گئے ہیں ہر کدام
لے گئے دکھنی دکھن کوں ' آج ہے قاسم کا بیاہ

کیا تعجب ہے کہ ' ولی ' نے اپنے انہیں گجراتی دوست شاعروں کی یاد میں وہ نظم لکھی ہو جو ان کے جدید مطبوعہ کلیات میں موجود ہے اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ واقعی ' ولی ' کے دل پر گجراتیوں نے اچھے نقوش تاثر چھوڑے تھے ۔

ہاشم علی کے حسب ذیل شعر سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے

شعر دکھن پہنچتے تھے —

دکھن سے ہوکے تیرے سخن کربلا چلے
ہاشم علی لے آئے معبداں نے یو خبر

اور نہ صرف یہی، دکن کے شاعروں سے ہاشم علی کو داد تحسین حاصل کرنے کی بھی توقع رہتی تھی - وہ کہتے ہیں —

تجھ پر خلیفہ قادر تحسیں کرے دکھن میں
ہاشم علی عجب نیں یہ مرثیے کوں سن کر

اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گجرات اور دکھن کے شاعروں میں تعلقات بھی قایم تھے اور ایک جگہ کی خبریں دوسری جگہ پہنچ جایا کرتی تھیں - چنانچہ ہاشم علی نے اپنے مرحوم دکھنی دوستوں کو جس طرح یاد کیا ہے اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، وہ کہتے ہیں —

یہ غم کا بیاں سن کے لرزے گگن
عجب نیں ہے ہاشم علی بے سخن

سوروحی، و مرزا، اوقادر نہیں (مرثیہ ۱۶۵)
ہزار حیف نیں شاعران دکھن

---

(۳)

ہاشم علی صرف مرثیہ گو شاعر تھے، اور غالباً پیشہ ور - انھوں نے سوائے مرثیوں کے کسی اور صنف شاعری میں قلم نہیں اٹھایا - اور جس طرح دوسرے شاعر اپنی مختلف نظموں کو ایک جا کر کے انھیں ایک دیوان کی شکل میں حروف تہجی کے لحاظ سے ردیف وار مرتب کرتے ہیں ہاشم علی کو بھی اس کا شوق ہوتا ہے - چنانچہ وہ اپنے قسم قسم کے رثیوں کو ردیف وار جمع کرکے ایک جلد میں نقل کرتے ہیں، اور اس مجموعے کا نام " دیوان حسینی " رکھتے ہیں - کیوں کہ وہ امام حسین اور اُن کے ساتھیوں کے غم و الم پر مبنی ہے —

" و مسمی شدن ایں اوراق بہ دیوان حسینی "

کے تحت انھوں نے جو ۹ شعر لکھے ہیں ان کے آخری شعر یہ ہیں —

شاعراں نے شعر بولے گرچہ رنگیں دل کشا
اے عزیزاں یو سخن ہے اس دل بریاں کا
توں لکھا ہے کربلا کا یو بیاں ہاشم علی
ہے یو دیوان حسینی نام اِس دیوان کا (مرثیہ نمبر ۲)

اس کے علاوہ اپنے صرف مرثیہ گو ہونے کی نسبت انھوں نے صاف صاف کئی جگہ اعلان کردیا ہے - چنانچہ بعض شعر ملاحظہ ہوں —

۱- ہاشم علی ہمیشہ ثناخوان شاہ کا
جز مدح و منقبت سخن اُس نے لکھا نہیں (مرثیہ نمبر ۱۳۹)

۲- بجز مدح نیں شعر ہاشم علی
کہو راستی کے سخن پر سلام (مرثیہ نمبر ۱۱۴)

۳- شاعری میں یو مقرر ہے تجھے ہاشم علی
جز ثنا و مرثیہ شعر دگر کہنا غلط (مرثیہ نمبر ۷۴)

اور نہ صرف یہی، انہیں اپنے خالی مرثیہ گو ہونے پر فخر بھی تھا - ان کا خیال تھا چونکہ وہ مرثیوں کے سوا کسی اور صنف شاعری سے اپنے قلم کو گندہ نہیں کرتے اس لئے شعر بھی اچھے لکلتے ہیں - وہ کہتے ہیں —

۱- ہے سخن کوں مدح آل مصطفیٰ میں برتری
یو سبب در ریز ہے ہاشم علی کی شاعری
قدر جوہر کوئی نجانے کا سوائے جوہری
اے صبا یہ بے بہا گوہر اوپر صلوات بول (مرثیہ نمبر ۹۹)

۲- بول توں بلبل صفت ہاشم علی
صبحدم میں مدح اولاد علی
جب تلک دیکھے گلستان جہاں (مرثیہ نمبر ۱۷۲)

۳- ہاشم علی کے شعر جو مدح امام ہے

براین ثنا و اوس کی فصاحت کوں ہے درود (مرثیہ نمبر۷)

لیکن اگر کبھی انھیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں میرے شعروں میں کوئی نقص تو نہیں تو وہ یہ کہکر اس کی مدافعت کرنا چاہتے ہیں کہ میرا مقصد شعر و شاعری تو ہے نہیں ، میں صرف مرثیہ گو ہوں ، بھلا مجھے نکتہ چینیوں کی کیا پروا ؟ چنانچہ لکھتے ہیں -

۱- ہوس نیں شاعری یاراں مجھے ہے مدعا زاری
سخن میں گر خطا دیکھو کرم سیتیں گناؤ ست (مرثیہ نمبر۱۸۶)

۲- شعر ہاشم علی کے تئیں یاراں
مدح مولا منے دیکھو خالص (مرثیہ نمبر ۷۱)

یہاں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہاشم علی نے اپنے مرثیہ گو ہونے پر فخر اور نکتہ چینیوں سے بے پروائی کا ذکر صرف اس لئے کیا کہ وہ اس ذریعے سے اپنے عیب چھپانا چاہتے تھے - واقعہ یہ ہے کہ ان کا اعتقاد ہی اس طرح کا تھا - وہ ایک ادنیٰ درجے کے پیشہ ور مرثیہ گو نہیں تھے - وہ جو کچھ لکھتے تھے اس کی اہمیت اور حقیقت پر انھیں اعتماد تھا - وہ اُس کو اپنے مذہبی فرائض کا ایک جز سمجھتے تھے اور اس سے انھیں صرف دنیاوی منافع ہی کی امید نہیں تھی - انھیں یقین تھا کہ ان کے مرثیے انھیں آل نبی کی نظروں میں عزیز کردیں گے اور ان کے ذریعے سے وہ اپنی دینی زندگی میں سرخرو رہیں گے —

یہ صرف توقعات ہی نہ تھیں - انھیں ان کوششوں کے پھل بھی ملنے لگے تھے - انھیں یقین ہوتا جارہا تھا کہ شہدائے کربلا علیہم السلام ان کے مرثیوں سے خوش ہیں اور یہ کہ ان بزرگوں نے اپنی خوشنودی کا اظہار بھی کردیا ہے - ان کے برادر ایمانی حافظ فضل الدین نے سنہ ۱۱۴۸ ھ میں جو خواب دیکھا تھا اس کو خود ہاشم علی ہی کے لفظوں میں ہم نے اوپر نقل کردیا ہے۔ لیکن اس طرح کے خوابوں کا ذکر ہاشم علی نے ایک سے زیادہ موقعوں پر کیا ہے - چنانچہ دیوان میں ردیف "کاف" کو انھوں

نے ایک سلام سے شروع کیا ہے جس کی سرخی یہ لکھی ہے :-

" سلام الا (کذا) جناب سیدالمرسلین و اشارہ باین کہ چون سابق در عالم رویا جمال باکمال آنحضرت را دیدہ و آن خوابے است بسیار طولانی - درین سلام تمنائے بار دیگر نمودہ' و قسم حضرت شاہ کربلا دادہ' چنانچہ از فضل و کرم این آرزو برآمدہ' و بار دیگر با حسن وجوہے مشاہدہ جناب اقدس نبوی نمودہ" -

ایک اور مرثیے کی سرخی یہ ہے - اس میں ایک سے زیادہ خواب بیان کئے ہیں :-

" سلام الی جناب سیدالشہداء' و دراں اشارہ است بسہ خواب -
اول خواب است کہ جناب اقدس نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ را چنانچہ در سلام ردیف الف اشارہ بآں باشد —
دوم خوابے ست کہ جناب ولایت مآب علی مرتضیٰ' و حضرت علی بن موسی الرضا علیہ التحیہ و اشارہ مشاہدہ نمودہ قدمبوس و مصافحہ بجا آوردہ حضرت امیر بدست مبارک فکر باشارہ و بزبان می فرمودن کہ علی بن موسوں -
وسوم خوابے است کہ محب یکرنگ آل نبی امجد حاجی احمد درویش حضرت سیدالشہدا را دیدہ' و گویا این کمینہ نیز نزد حاضر بودہ و ارشاد و تعملے .دہ کہ بجا آوردہ شد "-

(مرثیہ نمبر ۸۹)

(اس میں بعض جگہ عبارت غلط ہے - میں نے حتی الامکان بعینہ نقل کردینے کی کشش کی ہے) —

ان خوابوں کے علاوہ خود مرثیوں میں کئی شعر ایسے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ہاشم علی کس قدر خلوص اور اعتقاد کے ساتھ مرثیے لکھتے تھے - حسب ذیل شعر ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خود متاثر رہتے تھے —

کہاں تک میں لکھوں اس غم کی باتاں
کہ دل کے جوش سوں پر حوں ہیں انکھیاں (مرثیہ نمبر ۲۲۷)

آج ہاشم علی لکھا غم سوں
بھر کے انجھو لوھو سیں سارے نین (مرثیہ نمبر ۱۵۲)

ہاشم علی کے سچے اعتقاد کا ثبوت اُن آرزوؤں سے بھی ملتا ہے جو انھوں نے اپنے متعدد شعروں میں بیان کی ہیں مثلاً ایک جگہ وہ چاہتے ہیں کہ کربلا جاکر خود مرقد امام علیہ السلام پر اپنے مرثیے سنائیں اور اس کی ان کو اس قدر تمنا تھی کہ وہ اپنے کلام کا کربلا جانا انتہاے عروج و قبولیت سمجھتے تھے - کہتے ہیں :-

بولاؤ ہاشم علی کوں سرور نجاوے دل میں یہ آرزو لے
کہ سارے جیتے یو مرثیے ہیں پڑے تہارے وطن میں غم تھیں (مرثیہ ۱۵۴)
(جتنے) (سے)

ہاشم علی لے آئے معباں نے یو خبر
دکھن سے ہوکے تیرے سخن کربلا چلے (مرثیہ ۲۲۵)

ان کی بعض دعاؤں اور خواہشوں کی نوعیت اور سنجیدگی ملاحظہ ہو :-

اے معباں التماس آمھن کی تم سوں رکھتا یہ گنہ گار روسیا
یا حسین اے خامس آل عبا عرض ہیں کے پانچ مطلب اے شہا
اول ہے یو آرزو دل میں مدام لطف سوں اپنے زیارت کوں بلا
دوسرا جب تئیں حیات مستعار رکھہ مجھے بے منت خلق خدا
تیسرا ہوفا قبول درگہت یو سخن لکھنا مرا تیری ثنا
چار میں یہ حاضراں و ذاکراں تم سوں پاویں اپنے دل کی مدعا
ہے تجے منصب شفاعت کا نصیب پانچواں سب کوں قیامت میں چھوڑا
وغیرہ (مرثیہ نمبر ۱۹)

ان کو امید تھی کہ قیامت کے دن امام حسین ان کی شفاعت کرکے انھیں

جنت دلائیں گے :-

حشر کے دیوان سیں جب نور چشم مصطفیٰ
روضۂ رضواں کوں بھیجیں گے محباں کوں چھوڑا
یاد کر ہاشم علی تجھہ کوں کہیں روز جزا
وہ ہمارا کمتریں مداح شاعر کاں گیا (مرثیہ ۳۱)

ایک اور شعر ملاحظہ ہو :

ہاشم علی کوں سرور گر لطف سے نوازیں
نیں ہے عجب عزیزاں ' ہے خاندان کرم کا (مرثیہ ۷)

ہاشم علی کے پیشہ ور مرثیہ گو ہونے کی بحث کے متعلق چند اور معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں - ایک تو یہ کہ ان کے چند شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر سال باضابطہ طور پر مرثیے لکھتے تھے - چنانچہ کہتے ہیں —

تجہ کوں ہاشم علی حسیں سرور
ہر برس مرثیہ لکھاتے ہیں (مرثیہ ۱۴۹)

لکھوں کہاں تلک میں بیان ستم
مجھے ہر برس لے کے تیر قلم
لگاتا رہا ہے کہاں دار غم
جگر پر مرے تیر آخر نہیں (مرثیہ ۱۹۵)

آخری مصرعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ مدت سے مرثیے لکھتے آئے ہیں اور یہ کہ جب تک زندہ رہیں گے انہیں ہر سال غم کرتے رہنا پڑے گا - ایک اور جگہ بھی انھوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے —

شاعراں نے ہر کدامیں نوبت اس غم کی بھرے
ہے تجے ہاشم علی اس درد کی باری ہنوز

اس سے یہ مطلب بھی نکالا جاسکتا ہے کہ ہم عصر مرثیہ گو مرثیے لکھتے مرگئے لیکن ہاشم علی کی باری ابھی ختم نہیں ہوئی -

پیشہ ور مرثیہ گوئی سے متعلقہ دوسری قسم کی معلومات بعض مرثیوں کے درمیانی اشاروں سے ہوتی ہیں - ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہاشم علی نے صرف منبر پر بیٹھ کر پڑھنے ہی کے لئے مرثیے نہیں لکھے بلکہ انہیں ماہ محرم کے عام رسم و رواج کا بھی لحاظ رکھنا پڑا - زیارت اور چالیسواں کے نیز الوداعی مرثیوں کے علاوہ (جو علموں اور تعزیوں کو ٹھنڈا کر کے واپس ہوتے وقت پڑھے جاتے ہیں) تابوت لے جاتے وقت راستہ سے پڑھتے ہوئے جانے کے لئے بھی انہوں نے علاحدہ مرثیے لکھے - چنانچہ مرثیہ نمبر ۱۵۵ اور ۱۶۹ ' دونوں میں پچاس پچاس شعر لکھنے کے بعد یہ اشارہ کرتے ہیں کہ :—

" ازیں جا روبرو ے تابوت ایستادہ شدہ بخوانند و آہستہ روانہ شوند "

زیارت اور چالیسویں کے مرثیوں کی ابتدا میں حسب ذیل نوٹ لکھے ہیں :-

۱ - " درمیان روز سیوم کہ در اصطلاح روز پھول وروز زیارت گویند' و ایں مرثیہ مخصوص آں روز است " —

۲ - مرثیہ چہلم کہ با صطلاح اہل ہند چالیسواں گویند - و مناسب است کہ در اں روز یا شب خوانده شود " —

---

(۴)

ہاشم علی کے مجموعہ مراثی ' یعنی دیوان حسینی میں کل ۲۳۸ مرثیے ہیں یہ ان کا مکمل دیوان نہیں ہے - کیونکہ کتاب میں اکثر جگہ (خصوصاً ہر ردیف کے آخر میں) بہت سے صفحے خالی چھوڑ دیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اور مرثیے نقل کرنا چاہتا تھا - بد قسمتی سے کتابت کی کوئی تاریخ نہیں ملتی - بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں یہ بیاض

لکھی گئی ہو گی —

ہاشم علی ایک اچھے مرثیہ گو تھے - اگرچہ مرزا ' غلامی ' اور قادر کے بعض مرثیوں کے مقابلے کے ' دیوان حسینی ' میں کوئی مرثیہ موجود نہیں ہے ' تاہم ہاشم علی کی استادی اور اعلی درجے کے شاعر ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا - اور بقول ان کے —

شعر ہاشم علی ہوے مشہور

نیں ہے دیوان کی کتاب ہنوز (مرثیہ ۶۲)

کوئی تعجب نہیں اگر وہ ' دیوان حسینی ' کے جمع ہونے سے پہلے ہی خاصے مشہور ہو چکے ہوں —

ان کی زندگی کی نوعیت پر ' افسوس ہے ' کہ ان مرثیوں سے کوئی روشنی نہیں پڑتی - ایک دو جگہ ایسے شعر ضرور مل جاتے ہیں جن میں مصنف کے خیالات کی کچھ جھلک ضرور نظر آتی ہے لیکن وہ کوئی زیادہ اہم نہیں - ذیل کے چند شعر ثابت کرتے ہیں کہ ہاشم علی کی زندگی عام انسانوں کی زندگی کی طرح صدموں سے آزاد نہیں تھی - یہ ایک غیر معمولی بات ہوتی اگر انہیں ٹھوکریں نہ لگتیں اور دنیا کی سرد مہریوں اور نیرنگیوں کی شکایت کرنے کا موقعہ نہ ملتا —

۱ - ہاشم علی زمانہ میں مہر و وفا نہیں

دلہاے پر نفاق موں صدق و صفا نہیں

ہرگز نہیں مروت و شرم و حیا نہیں

اس درد کے دوا کوں بغیر از خدا نہیں

فریاد یا محمد و یا مرتضی علی (مرثیہ ۲۳۳)

۲ - زندگی دنیاں کی ہے ہاشم علی خواب و خیال

جو رہا سو یا وو چوکا ' جاگتا ہے کا کہاں

ہے لحد کی نیند بھاری آج توں اس کوں سہوال
تا دکا ویں صبح محشر تجھ کو آساں نیند سوں

(مرثیہ ۹۵ بیاض)

اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم علی کی شاعری کے چند نمونے بھی پیش کئے جائیں تاکہ ناظرین کو اس کے متعلق خود کوئی اندازہ قائم کرنے کا موقع ملے۔ ہاشم علی نے کربلا سے متعلق تقریباً ہر واقعے پر مرثیہ لکھا ہے۔ لیکن یہاں صرف چار قسم کے مرثیوں کے انتخاب نقل کئے جاتے ہیں۔
۱ - عام مرثیے (یعنے وہ مرثیے جن میں کربلا کے واقعے پر عام طور پر غم کیا گیا ہو یا محرم کا آغاز بیان کیا ہو) ۲ - امام حسین کے مرثیے۔ ۳ - امام قاسم کے مرثیے ۴- امام زادہ علی اصغر کے مرثیے—

۱ - عام مرثیے کے چند شعر :—

افسوس چوکھن سیں ٹپکتا لوھو لوھو
ہو کر شفق گگن سیں ٹپکتا لوھو لوھو
عالم کے سب نین سیں ٹپکتا لوھو لوھو
سرور گیا، کفن سیں ٹپکتا لوھو لوھو

جس وقت اوپر شہید ہوا طفل خورد سال
سرور لے آئے گھر کوں تب اندوہ سیں کہال
بانو کے سر سیں ہوش گیا دیکھ کے یو حال
اصغر کے پیرھن سیں ٹپکتا لوھو لوھو

۲ - عام مرثیے کا انتخاب :—

یہ موسم خزاں ہے گلہا نہی کے سوکھے
اس دوکھ سوں آج بلبل نالاں رہا چمن میں

پیاسا جگر ہے شہ کا دلہا میں آگ لاگی
سب ہو لوہو پگھل کر بہتے چلے نین میں
سارہ نبی لوہو میں جب کربلا میں ڈوبا
تارے فلک کے اوپر روتے ہیں سب رین میں
یہ بوند ہے لوہو کی یا لعل بے بہا کا
ٹکہا ترے گلے پر ٹانکا ہے پیرھن میں
فانوس میں کھونگتھہ کے مانند شمع کریاں
ہے ہے رہی وہ دلہن جلتے اپس کے من میں

---

۳ - آغاز محرم :—

پھر گھٹا ہوی غم کے بادل کی گگن پر آشکار
کربلامیں میگھہ برسے لہو کی دھاراں بےشمار
تیغ چمکے سراوپر بجلی کےمانن(مانند) بار بار
کیا سما ہے، ہے پڑا سارا جہاں میانے اندھار

یہ جھڑی دس دن لگے گی ماہ غم عا شور ہے
کربلا کی موج غم سوں دل کی ندیاں پور ہے
نعرہ ہا کڑکیں گرج کر آج نفخ صور ہے
چوطرف گھن گھور ہے، لہو کی برستی ہے پھوار

نہیں نکلتاہے سورج سوکے تہیں سکھہ کے بھوَن
خون دل سوں جہاں تلک دیکھو ٹپکتی ہیں نین
تر ہوے ہیں اشکباری سوں، لرزتے ہیں بدن
آہ کا ہر دم ہوا ہے کا دلوں سیتیں پوکار

---

۴ - آغاز محرم -

دیکھو محرم کا ہلال ماتم ہوا نمایاں فلک میں غم تھیں (سے)
دلوں سیں ندیاں لوہو کی بہتیں چلیں اوبل کر نین میں غم تھیں

جھلکتے تارے نہیں فلک پر، ملک ہیں گریاں فراق سیتیں
پڑیں ہیں بوندیاں انجھو کے سارے انکھیاں سے ڈھل ڈھل زمیں میں غم تھیں

رہا ہے بلبل یو دوکھ سوں نالاں، گلاں کھل کر پڑے زمیں پر
رہ شہ کے سہرے کوں پھول مالی چونا ہے جب آ چمن میں غم تھیں

ہوا ہے چہرہ لوہو میں گل کوں، سوفید میانے مگن ہیں انکھیاں
پڑے ہیں گالوں اوپر اولجھ کر وہ زلف مشکیں شکن میں غم تھیں

۵ - شہادت حسین علیہ السلام پر حضرت فاطمہ کا ماتم -

آیا محرم اوڑتا دھولا را روتا ہے عالم اس غم میں سارا
خیرالنسا نے تب یوں پکارا میرا حسینا نا حق مارا

ہے ہے حسینا تیری جوانی! تھا قطب تارا تیری پیشانی
دوجا نہیں تھا کوئی جگ میں ثانی میرا حسینا نا حق مارا

جب تشنگی سوں توں تلملایا ساتوں سمندر تب کھل بلایا
نہیں ظالماں نے پانی پلایا میرا حسینا نا حق مارا

توں عرش کا تھا روشن ستارا تیرا شرف تھا سب آشکارا
ہے آج تیرا سرتن سوں نیارا میرا حسینا نا حق مارا

۶ - امام قاسم اور بی بی سکینہ کی شادی ہوتی ہے - ابھی دولہا دلہن سے برابر بات چیت بھی نہیں کرنے پاتا ہے کہ جنگ میں جانا پڑتا ہے - ایسے نازک وقت میں دولہا دلہن میں جو گفتگو ہوتی ہے، اس کا ہاشم علی نے ایک مرثیے میں

بیان کیا ہے جس کے چند شعر یہ ہیں :—

جلوہ سیں اوتھہ کے رن کوں چلا تب کہی دلہن
دامن پکڑ کے لاج سوں انجھواں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ہمن
تم بن رہے کا ھاے یہ سونا بھون مرا

کیسی یو کدخدائی و کیسی ہے یو برات
آتا فراق تم سوں یو جلوہ کے آج رات
گھر کوں نہ لے گئے ہو نہ بولے ہو ہم سوں بات
دیکھا نہیں جہاں کوں بھر کے نین مرا

اس کربلا کے بن منے اکیلی میں کیوں رہوں
تجھہ باج میں جہاں میں پور امید کیا دھروں
جد کے مدینہ کیوں کہ میں اس تھار سے پھروں
تم اپنے ساتھہ لیکے دکھاؤ وطن مرا

جاتے ہو چھوڑ رن کی طرف مجکوں تم رولا
نہیں شرم کا ہنوز یہ سرسوں گھونگتھہ کھولا
کرتے نہیں محبت و جاتے میا بھولا
اس زندگی سوں آج بھلا ہے مرن مرا

شعلہ لگا ہے دل منے اس غم کا کیا کروں
مجھہ کوں روا ہوا ہے اگر زہر کھا مروں
دوری میں ھاے تیرے میں دن رین کیوں بھروں
فرقت کی آگ سیتیں جلے کا بدن مرا

قاسم کھڑا تھا روتے نین سن دولھن کی بات
غمناک اپنا دیکھ کے دامن دولھن کے ھات
تب آہ دردناک سوں بولا دولھن کے سات
اے بوستان راحت و سرو چمن مرا

مج کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار
تیرے فراق سات میں جاتا ھوں اشکبار
میں کیا کروں علاج، نہیں حکم کردگار
حق نے کیا ھے رن میں مقرر رھن مرا

ھے داغ دل میں تیری جدائی کا، کیا کروں
نیں ھے امید رن سے پھر آکر تجھے ملوں
جو کچھ ھوا مقدروں میں راستی کہوں
وعدہ ھوا ھے حشر میں تم سوں ملن مرا

۷- حضرت شہر بانو امام زادہ اصغر کا ماتم کرتی ھیں —

آج پر خون کفن ترا اصغر آج سوکھا دھن ترا اصغر
لال ھے گلبدن ترا اصغر حیف یو بالپن ترا اصغر

کیوں ھیں زلفاں کے بال تاروں تار کیوں گلے سیں لوھو کے جاری دھار
تج کوں سوتے کبھو نہ لگتی بار حیف یو بالپن ترا اصغر

اوتھہ گلے کا لوھو دھلاؤں میں نیدآتی، تجھے سولاؤں میں
چل ترا پالنا جھولاؤں میں حیف یو بالپن ترا اصغر

کیوں جدا مجہ ستیں کئے تج کوں پھر میں گودی لئے پھروں کس کوں
کیوں نہ لاگے بلا تری مج کوں حیف یو بالپن ترا اصغر

الله الله کیا تجھے پالا من میں یوں تھا کروں گی بسم الله

ھائے ترا گیا جیا بالا حیف یو بالپن ترا اصغر

کس کا اب پالنا جھولاؤں گی لولی دے کے کسے سولاؤں گی

کس کوں چھاتی ستیں لگاؤں گی حیف یو بالپن ترا اصغر

۸۔ ماتم امام زادہ اصغر - حضرت شہربانو کہتی ھیں :-

کہتی ھیں بانو آج میں کس کا جھولاؤں پالنا

بالے اصغر باج میں کس کا جھولاؤں پالنا

سویا ھے گردن ڈال کیوں اولجھے زلف کے بال کیوں

رنگیں لوھو سیں گال کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

توں کھول انکھیاں سیں دیکھوں، توں بول بتیاں میں سنوں

روتا نہیں توں کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا

تھے کھیلنے کے دن ترے، کیا عمر، کیا تھے سن ترے

نہیں چین مج کوں بن ترے کس کا جھولاؤں پالنا

یہ بہن تیری غمگسار بیٹھی ھے روتی زار زار

توں اوٹھ سکینا کر پکار کس کا جھولاؤں پالنا

کہاں (کہاں) سیں اجل تھی گھات میں گئی لے کے تجھ کوں ھات میں

بالا گیا جی بات میں کس کا جھولاؤں پالنا

اے میرے پیارے لاڈلے! پھر آکے لگ توں مجھ گلے

انجھو نین سیں بہہ چلے کس کا جھولاؤں پالنا

۹۔ حضرت شہربانو کا ماتم علی اصغر کی شہادت پر :-

بالے اصغر کے تئیں بلاتی رھی سونا یہ پالنا جھولاتی رھی

جھولا تیرا پڑا رھا خالی ڈوری مجھ ھات میں ھلاتی رھی

هاے کیوں روٹھہ کر گیا مجھ سوں | میرے پیارے کے تئیں مناتی رهی
بھول کیوں توں چلا میا میری | آرے اصغر تجھے بولاتی رهی
میں سولاتی تھی جب لگا چھاتی | آنچل اپنا تجھے اوڑاتی رهی
رات دن میں کبھو نہ دی رونے | کر کے باتاں تجھے هنساتی رهی
تھا برس کا نتھہ کا تجھے ارماں | لال جاماں ترا سلاتی رهی
قاسم آیا هے جب بھیانے کوں | میں تماشا تجھے دکھاتی رهی
لھو بھرا کیوں ترا چندر مکھہ هے | جس کوں هاتھوں سے میں دهلاتی رهی
دودھ پیتا مرا گیا بالے | غم سوں چھاتی مری بھر آتی رهی
تجھ کوں بھاتی نہ تھی اندھاری رات | تیری خاطر دیوا جلاتی رهی
کر کے تعویذ دل اوپر رکھتی | بد نظر سیں تجھے چھپاتی رهی
کیوں نہ آخر هوئی عمر میری | تجھ بنا حیف مجھ جیاتی رهی

(۵)

جن جن شاعروں کے مرثیے اس کتب خانے کی "بیاض مراثی" میں موجود هیں اُن کی فہرست، حروف تہجی کے لحاظ سے، اُن کے مرثیوں اور اشعار کی تعداد کے ساتھ یہاں درج کی جاتی هے: —

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
۱	احمد	۷	۱۵۷
۲	اشرف	۱۳	۱۳۵
۳	اصغر	۱	۲۴
۴	افصح	۲	۲۹
۵	افضل	۱	۳۵ مصرعے (۷بند مخمس)
۶	اکبری	۱	۱۸
۷	الفی	۱	۱۱

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
٨	اسامی	٨	٦٩ شعر ٣٣ مصرعے (١١ بند مثلث)
٩	باقر	١	٤٢
١٠	برهی	١	٩
١١	بے خبر	٢	١٨
١٢	تراب	٥	٤٩
١٣	تقی	٢	٦٨
١٤	حمیدی	١	١٢
١٥	داس	٨	١٩٦
١٦	ذوقی	١١	١٣٢
١٧	رضا	١٥	٣٥٤
١٨	رضی	٩	٩٧
١٩	رمضانی	٤	٥٥
٢٠	روحی	٥	٤٦
٢١	سرور	١	١٧
٢٢	سری	٢	١٩
٢٣	سیوہن	٢	١٩
٢٤	سید	٩	١١٢
٢٥	سید محمد (؟)	١	١٤
٢٦	سیفن	٢	١٨
٢٧	شرف	٤	٨٧
٢٨	شہابی	١	١٣
٢٩	شہی (شاهی)	٢	٢٩

١٢٩٤٦

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
۳۰	شیدا[۱]	۱	۱۸
۳۱	صابر	۱	۵۰ مصرعے (۱۰ بند مخمس)
۳۲	صائم	۲	۲۴
۳۳	صلاح	۸	۱۲۱
۳۴	صوفی	۱	۱۲
۳۵	طاہر	۶	۱۶۸
۳۶	طفیل	۱	۱۱
۳۷	عابد	۱	۱۱
۳۸	عارف	۲	۲۹
۳۹	عترت (؟)	۱	۷
۴۰	عزت	۱	۴۴
۴۱	عزلت	۸	۲۰۵
۴۲	عطا	۱	۱۷
۴۳	عطائی	۱	۱۰
۴۴	علیم	۱	۳۵
۴۵	علی	۱	(؟)
۴۶	عین الدین توحید(؟)	۱	۲۰۶
۴۷	غالب	۱	۱۲
۴۸	غلام	۱	۲۷
۴۹	غلامی	۱۷	۳۷۳
۵۰	فائز	۱	۵۱
۵۱	فتح	۱	۲۸

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
۵۲	فضل	۲	۴۸
۵۳	قادر	۱۷	۳۰۵
۵۴	قائم	۳	۷۹
۵۵	قربان علی	۳	۴۰
۵۶	قطب ابن حسن	۴	۵۴
۵۷	کاظم	۱۰	۲۰۴
۵۸	گل	۲	۲۱
۵۹	مبتلا	۱	۱۱
۶۰	مرزا	۱۵	۲۰۵ شعر ۲۰ مصرعے
۶۱	مسکین	۱	۱۱
۶۲	مسیحا	۱	۲۹
۶۳	مسیح الدین	۲	۱۸
۶۴	موالی	۱	۹۴
۶۵	موسی	۱	۹۳
۶۶	معتبر خان عمر	۱	۲۵ مصرعے (۵ بند مخمس)
۶۷	مکھن	۱	۱۳
۶۸	ندا	۴	۳۹
۶۹	ندیم	۱۱	۱۵۲
۷۰	نظر	۴	۱۲۴
۷۱	نعیم	۱	۷
۷۲	ولی	۳	۲۸
۷۳	ہادی	۱	۴۳

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
۷۴	ہاشم (؟)	۱	۲۰
۷۵	ہاشم علی	۲	۴۴
۷۶	ہاشمی	۱	۱۰
۷۷	ہوشدار	۴	۸۸
۷۸	یاری	۲	۲۳
۷۹	یوسف	۲	۵۶
۸۰	نامعلوم شعرا	۷	۸۳ شعر ۶۵ مصرعے

کبیر

از

(جناب محمد حفیظ سید صاحب بی - اے - بی ٹی لکچرار اُردو الہ آباد یونیورسٹی)

روایت ہے کہ کبیر نے پچاس سے زیادہ تصانیف چھوڑی ہیں - لیکن ان میں اکثر اصلی نہیں ہیں اور باقیوں میں سے بھی بہت سی ایسی ہیں جو ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئی ہیں - "خاص گرنتھہ" جس کی نسبت دعوی کیا جاتا ہے کہ وہ کبیر کے اشعار کا مکمل مجموعہ ہے، فی الحقیقت اکیس دیوانوں پر مشتمل ہے - مگر ان میں سے چند ہی ایسے دیوان نکلیں گے جو تحقیق اور چھان بین کے معیار پر صحیح اُتر سکیں - "کبیر ساگر" یا "بدھ ساگر" کی ضخیم جلدوں کے مطالعے نے جسے زمانۂ حال کے مشہور کبیر پنتھی مصنف، سوامی یوگالانند، نے ترتیب دیا ہے اور ونکٹیشور پریس (بمبئی) نے شائع کیا ہے، اس غیر محققانہ سادگی پر استعجاب ہوتا ہے جو علم ادب کے ایسے مختلف مجموعے کو ایک ہی زبردست دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے - لیکن جہاں اندرونی شہادت کی بنا پر بسا اوقات بہت سی نظموں کو بے اصل سمجھ کر مسترد کر دیا جاتا ہے، وہاں یہ امر بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ باقی دواوین کے ہر بند کی صحت پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر لیا جائے - بیلویڈیر پریس (الہ آباد)

کے شائع کردہ " ساکھیوں " اور " شبدوں " کے ایڈیٹروں نے قطع و برید ، ترمیم و تنسیخ میں جس احتیاط اور محنت سے کام کیا ہے اسے دیکھ کر خواہ مخواہ دل سے داد نکلتی ہے ۔ لیکن انھوں نے تمباکو کی مذمت کے بند کو بھی شامل کر لیا ہے، حالانکہ اس کا رواج ہندوستان میں کبیر کی وفات کے کئی برس بعد ہوا ۔ بہر حال جہاں تک باقی لفظوں کا تعلق ہے ان سب سے کبیر کی شاعرانہ زبان، طرز بیان ، جذبات اور جوش کا اظہار ہوتا ہے ۔ حقیقت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ چند شاگردوں نے جو اپنے آقا اور استاد کے رنگ میں رنگے ہوے تھے اور شاعرانہ نغمہ سنجیوں سے پورے طور پر بہرہ اندوز تھے ، جوش عقیدت کے سبب اپنے نتائج فکر کو ان سے منسوب کر دیا ۔ ثانیاً ہر چھوٹے سے چھوٹے فرقے کے حامیوں نے جس میں کبیر پنتھی منقسم ہو گئے ہیں ، اپنے مخصوص عقائد کو بانیء فرقہ سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ثالثاً زمانۂ مابعد کے شعرا نے بجاے انفرادی طور پر شہرت حاصل کرنے کے اس دور کے طرز میں لکھنا زیادہ مناسب سمجھا اور جو کچھ لکھا اُسے اپنے استاد کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کیا ۔ سولھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک کلام کبیرکے جتنے جامع ، ایڈیٹر اور شارحین گزرے ہیں وہ سب کے سب تمام مجموعے کو کلام الٰہی سمجھتے تھے اور اس پر تنقیدی نگاہ ڈالے بغیر اس کے ساتھ اظہار عقیدت کرتے تھے—

بہر حال یہ انتخاب ایسا ہے جس پر کبیر کی اعلیٰ ذہانت و قابلیت کا نہ صرف ناقابل تردید نشان موجود ہے بلکہ اس میں ربط و تسلسل اور جامعیت بھی پائی جاتی ہے اور یہ وہ صفات ہیں جن کی وجہ سے یقین ہوتا ہے کہ وہ جعل یا تحریف سے بالکل پاک و مبرا ہے ۔ اس کا نام " بیجک" ہے اور وہ ہندی تصانیف میں زبان زد خاص و عام بھی ہے —

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن موجود ہیں، جو یا تو اصل کتاب کے اقتباسات

هیں یا اس کے مکمل نسخے هیں۔ ان کا مقام طباعت بنارس (سنه ۱۸۶۸ ع) کلکته (سنه ۱۸۹۰ ع)' لکھنؤ (سنه ۱۸۹۸ ع)' الهآباد (سنه ۱۹۰۵ ع)' اور بمبئی (سنه ۱۹۰۶ ع) اور همیرپور (سنه ۱۹۰۸ ع) هے ۔ ' آدی گرنتھ ' جو سکھوں کی مقدس کتاب هے ' بہت سے ایسے گیتوں اور اقوال پر مشتمل هے جن میں سے اکثر صحیح طور پر کبیر سے منسوب کئے جاسکتے هیں۔ اس طرح کبیر کے عقائد اور ان کی تعلیمات یا تو زیادہ تر "بیجک" میں ملیں گی یا ثانیاً آدی گرنتھ میں (مگر بڑی احتیاط کے ساتھ) یا ' ساکھیوں ' کے ' بیلوے تیر ' والے ایڈیشنوں سے اخذ کی جائیں گی ۔ شبد ' اکھراوتی' اور ' گیان گوداری ' ریختے جُھلنے وغیرہ بھی جنھیں الهآباد کے پریس نے شائع کیا هے ' اس قدر غیر مصدقه هیں که ان پر بالکل اعتماد نہیں کیا جاسکتا —

اسی طرح جو دوهے یا گیت وغیرہ کبیر کے نام سے مشهور هو گئے هیں وہ نقادانه تشریح کے سامنے بالکل بے وقعت رہ جاتے هیں ۔ علاوہ ازیں از منۂ وسطیٰ میں کبیر کے کلام پر جو شرحیں لکھی گئی هیں ' وہ محض ناکارہ هیں ۔ بالعموم ایسا معلوم هوتا هے که وہ فرقه دارانه جذبات سے متأثر هوکر لکھی گئی هیں ' جو بسا اوقات نه صرف مبهم هیں بلکه گمراہ کن بھی ثابت هوئی هیں ۔ مثالاً پاکھنڈ کھنڈینی کی شرح کو لیجئے' جس کی نسبت روایت هے که وہ ' مہاراجه وشواناتھ سنگھ ' والی ریوا کے زور قلم کا نتیجه هے ۔ یه شرح آسان سے آسان اور سادہ سے سادہ متن کی عبارت کو بھی مہمل اور گنجلک بنادیتی هے ۔ همیں امید تھی که سولھویں صدی کے نامور مورخ اور مذاهب مختلفه کے نقاد یعنی ' ابوالفضل' کی تحریروں سے کچھ امداد ملیگی مگر وہ بھی تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں ان کا ذکر کر کے چپ هو جاتا هے ۔ ' دبستان مذاهب ' بھی کوئی زیادہ مفید ثابت نہیں هوئی * —

---

* نو سارو احمد آباد ۔ ستمبر سنه ۱۹۲۳ ع —

موجودہ دور میں جن لوگوں نے کبیر کی زندگی اور تعلیمات کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے ان میں سب سے پہلا نام ایچ ' ولسن کا ہے جو مستشرقین کی فہرست میں بہت شہرت رکھتے ہیں - جن باتوں نے ان کی شہرت میں چار چاند لگائے ہیں ان میں سے ایک اس امر کا تسلیم کر لینا خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ ھندو مذھب اور تہذیب وتمدن کے مطالعے میں از منۂ وسطیٰ کا علم ادب بہت اھمیت رکھتا ہے- اس کے بعد خود بخود بہت سے یورپین اھل قلم نے جن میں گارسن دی تاسی کا نام زیادہ مشہور ہے ' " کبیر اور کبیر پنتھی " کے شائع ہونے کے زمانے تک جس کی ترتیب کا سہرا ایک مشہور مذھبی لیڈر کے صاحب زادے ریورنڈ جی ' ایچ ' ویسٹ کاٹ کے سر رھیگا ' دلچسپی ظاھر کرنی شروع کردی - انھوں نے اس مصلح کی زندگی اور تعلیمات پر اپنے خیالات پیش کرنے کے علاوہ ان کی بعض تصانیف کے حصوں کا ترجمہ بھی شائع کیا ہے - اور اُن کے مذھب کے بارے میں اپنی ذاتی تحقیقات کے نتائج بھی پیش کئے ہیں - بشپ ویسٹ کاٹ کے بعض خیالات اور نتائج سے " اجودھیا سنگھہ اُپادھیائے " نے اپنے " منتخبات کبیر " کے طویل اور فاضلانہ مقدمے میں اختلاف کیا ہے- منماتھہ ناتھہ دت نے اپنی تصنیف " انبیائے ھند" میں کبیر کا ذکر کیا ہے- اور منوھرلعل زتشی نے بھی اپنے سلسلۂ مضامین " ھندو پروٹسٹنٹزم" میں کبیر کے متعلق قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے- سر ولیم ھنٹر اور دوسرے مصنفین نے بھی اپنی اپنی تاریخوں میں مختصراً کبیر کا ذکر کیا ہے - سی ' ایف ' اینڈریوز نے بھی کبیر کے ارشادات اور شاعری پر عام تاریخی تبصرے کے ضمن میں بحث کی ہے - اسی طرح مگر کم کامیابی کے ساتھ جے ' این ' فارکور نے بھی کوشش کی ہے- مصر برادران نے زیادہ تر اس کے ادبی پہلو سے بحث کی ہے- اور ریورنڈ احمد شاہ نے اپنے بیجک کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں زیادہ تر اس معلم روحانی کی مذھبی و اخلاقی اور تاریخی حیثیت کو اپنے پیش نظر رکھا ہے - سر جارج گریسن نے اس پر اور بشپ ویسٹ کاٹ کی تصنیف پر ریویو کے دوران

میں نیز اپنی کتاب " ماڈرن ورنیکلر لٹریچر " میں مضمون زیر بحث کے سوانحی، ادبی اور فلسفیانہ پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے۔کبیر کے ترجمۂ کلام پر جسے رابندرا ناتھ ٹیگور نے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے، " ایولن انڈرہل نے اپنے دیباچے میں * گرو کے تصوف سے بحث کی ہے جو حسب توقع نہایت دلچسپ ہے - یہ تمام تنقیدیں ہمدردانہ انداز میں لکھی گئی ہیں اور آریا سماج فرقے کے بانی سوامی دیانند سرسوتی اور دوسرے کم درجے کے مذہبی مصنفین کی کم عالمانہ، غیر محققانہ اور غیر فیاضانہ تحریروں کے مقابلے میں دلچسپ تضاد پیش کرتی ہیں —

ہمارے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایسے کبیر پنتھیوں کی ان بے شمار مگر مختصر غیر تنقیدانہ تحریروں کی طرف کچھ اعتنا کریں، جو ہمارے علم اور معلومات میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں کرتیں —

قبل یا ما بعد کے کسی مصلح کے کلام اور تعلیم کی جانب اس قدر توجہ نہیں کی گئی، جتنی کبیر کے کلام اور تعلیم کی طرف کی گئی ہے اور اس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے - لیکن باوجود اس کے اُن کی شخصیت طرح طرح کے اوہام، توہمات اور قصص کے گرد وغبار میں چھپی ہوی ہے - ان کی طرز تحریر گنجلک ہوکر رہ جاتی ہے، ان کے معمے لاینحل رہ جاتے ہیں، اور ان کو معنی کا لباس پہنانا بسا اوقات نہایت مشکل ہوجاتا ہے - مگر ان باتوں کے باوجود از منۂ وسطیٰ کے مذہبی پیشواؤں، مصلحوں اور شاعروں پر ان کا بہت بڑا اثر تھا اور ان کی کامیابی اور ناکامی کا راز اس قدر زیادہ دلچسپ ہے کے ان کی زندگی، ان کی تعلیمات، ہندوستانی فلسفہ اور ہندو مذہب پر نظرثانی اور ہندی شاعری کی تاریخ میں ان کے درجے کے متعلق بحث کی گنجائش ہمیشہ باقی رہیگی —

روایتاً مشہور ہے کہ سنہ ۱۴۵۵ وکرمی میں کبیر بنارس میں ماہ'ر تارا تالاب

---

* ہنڈرڈ پویمس آف کبیر از رابندر ناتھ ٹیگور —

کے اِدھر روشنی کی چمک کے ساتھ بطور معجزے کے خودبخود ظہور میں آئے تھے - یا یہ کہ رامانند کی دعا کے اثر سے وہ ایک اچھوتی برہمن بیوہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے- یا یہ کہ بیوہ نے اپنے آپ کو لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچانے کی خاطر بچے کو تالاب کے قریب ڈالدیا تھا - وہاں سے انھیں ایک نئے نئے شادی شدہ مسلمان جلاھے ' نیرو ' اور اس کی بیوی ' نیما ' نے اٹھا لیا اور متبنی کرکے پال لیا - جتنے قاضی نام رکھنے کے لئے بلائے گئے تھے انہوں نے قرآن مجید کے اوراق باربار اُلٹے ' مگر اُنھیں صرف اکبر ' کبیر ' کبریا ' حق ' وغیرہ نام ملے جو اسمائے الٰہی میں داخل ھیں اور اسی وجہ سے انہوں نے بچے کو قتل کردینے کا مشورہ دیا لیکن نیرو نے ان اسمائے الٰہی سے یہ مطلب نکالا کہ یہ وھی خود بزرگ ترین ذات ھے اور دنیا میں سچے کلام کا پرچار کرنے کے لئے نازل ہوئی ھے اس کے بعد بچے کا نام کبیر رکھا گیا اور اگرچہ انہوں نے اسلامی گھرانے میں تعلیم پائی تاھم خدا کی عبادت وہ رام نام ھی جپ کر کرتے تھے - ان سے بسا اوقات بہت سی کرامتیں ظہور میں آئیں ' مثلاً جو حجام ان کا ختنہ کرنے کے لئے آتا وہ ڈر کے مارے بھاگ جاتا - وہ بیماروں کو شفا بخشتے تھے اور ذبح شدہ گائے کو پھر از سر نو زندہ کردیتے تھے - بار بار یہ طعنہ سن کر کہ وہ بے پیرے ھیں انہوں نے رامانند جی کا چیلا بننے کا تہیہ کر لیا - لیکن وہ مفروضہ اسلامی نژاد ہونے کی بنا پر مسترد کردیے گئے - بہرحال وہ اس طرح سے مسترد کردیے جانے سے گھبرائے نہیں - بلکہ انہوں نے ایک چال چلی اور وہ یہ تھی کہ وہ چھوٹے بچے کا روپ لے کر رامانند جی کے راستے میں لیٹ گئے ' گنگا جی کو جاتے ہوئے جب کبیر کے جسم کو رامانند جی کی کھڑاویں لگیں تو وہ لگے چلانے مگر رامانند جی نے انھیں چپ کیا اور آھستہ سے سر پر ھاتھ رکھ کر کہا کہ " کہو رام رام " - " میرے آقا ! تو کیا میں رام رام نام جپوں ؟ " رامانند جی نے فرمایا کہ " ھاں ' رام نام جپو " - کبیر نے اُسے اپنی بیعت قرار دیا اور اسے علانیہ شہرت دیدی - حیرت زدہ پیر نے جب وشنوجی کے پرستاروں کے طعنے سنے

تو صاف انکار کردیا کہ میں نے کسی مسلمان جلاہے کو اپنا مرید نہیں بنایا - لیکن بعد میں ان کا دل پسیج گیا اور انھوں نے کبیر کو اپنے روحانی حلقے کا باقاعدہ رکن بنالیا اور بالآخر اپنے ۱۲۸۴ مریدوں کا خلیفہ مقرر کردیا

بہت عرصے تک کبیر اپنی آبائی تجارت میں مشغول رہے - متعدد بار انھوں نے اس کپڑے کو خیرات میں دیدیا جسے وہ بغرض فروخت منڈی میں لےجاتے تھے - لیکن پرمیشور کے مافوق الادراک توسط کی بدولت تجارت میں اُلٹا سوگنا نفع ہوا- روگیوں کے روگ اور دکھیوں کے دکھد کو وہ کھو دیتے تھے، مردوں کو جلا دیتے تھے- عناصر اربعہ پر انھیں پورا قابو حاصل تھا، وہ بےرو رعایت سختی کے ساتھ مولویوں اور پروہتوں کی مذمت کرتے تھے اور اپنے عقائد کا ڈھڑ لے کے ساتھ پرچار کرتے تھے - انہوں نے رامے ' داس ' جہاں گشت شاہ ' اور سرداانند اور سب سے بڑھکر اس دور کے مشہور و نامور درویش اور صوفی گورکھ ناتھ کو نہ صرف مباحثوں میں بلکہ کرامتوں کے مقابلے میں نیچا دکھادیا - انھوں نے اپنے پیر کو دوبارہ زندہ کردیا، جب کہ وہ سلطان سکندر والی دھلی کے حکم سے اس سے ملاقات نہ کرنے کے جرم میں قتل کردئیے گئے تھے اور ساتھ ھی انھیں شدید جسمانی اذیت سے بھی نجات دلائی - کبیر نے سلطان دھلی کو بھی قریب قریب اپنی طرف مائل کرلیا تھا ' لیکن وہ پنڈتوں اور مولویوں کی (جن میں شیخ تقی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ھے) ابلہ فریبیوں کے باعث ان کا شدید ترین دشمن بن گیا - مگر سب کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ نہ تو آگ انھیں جلاسکی اور نہ پانی انھیں ڈبو سکا اور نہ خوں خوار درندے اور تیز دھار کے فولادی ھتھیار ھی انھیں کوئی اذیت پہنچانے میں کامیاب ھوسکے ---

اسی اثنا میں تقریباً تیس برس کی عمر میں کبیر نے ایک عورت لوئی نامی کو، جو اُن کی مرید تھی، اور ان سے غیر معمولی عقیدت رکھتی تھی اپنے پاک گھر میں داخل کرلیا - اِسے ایک سادھو نے عالم طفولیت میں' دریاے گنگا میں ' کمل میں لپٹا ہوا پایا تھا - جب وہ آئی تو تین مہینے کا ایک لڑکا ' کمال ' نامی اس کی

حفاظت و سپردگی میں دیدیا گیا - یہ لڑکا بھی دریا پر تیرتا ہوا پایا گیا تھا اور اسے بھی تقی کے کہنے پر کبیر نے زندہ کیا تھا -کمالی کو بھی جو پڑوسن کی نوجوان لڑکی تھی، کبیر ہی نے اپنی کرامت کے زور سے زندہ کیا تھا - گھر کے لوگ محنت مزدوری سے معمولی روزی کمالیا کرتے تھے- لیکن جوں جوں روحانی مہمانوں کا اضافہ ہوتا گیا، غائبانہ طور پر ان کی امداد ہوتی گئی - کبیر کی شہرت اب دوردراز مقامات تک پہنچ گئی، حتیٰ کہ سکھ فرقے کے بانی بابا نانک نے بھی ان کی مریدی اختیار کرلی —

بڑے بڑے راجہ ان سے دعا کے طالب ہوتے تھے، انہیں میں گجرات کے سولنکی خاندان کا راجہ بھی تھا، جس کے شیر جیسے چہرے والے بیٹےنر یوا کے باگھل خاندان کی بنیاد ڈالی - کبیر نے ہندوستان کی سرحد کے پرے باخ اور بخارا تک سیاحت کی، جو اُس زمانے میں علوم و فنون کے بہت بڑے مرکز تھے - دوران سفر میں ان سے بہت سی کراماتیں ظہور میں آئیں اور جہاں جہاں ان سے مناظرے ہوئے، وہ اِن سب میں فتحمند رہے - اور اس طرح سے انہوں نے معرفت کی روشنی پھیلائی—

جب ان کی عمر ۱۲۰ کے قریب ہوگئی تو کبیر نے دیدۂ و دانستہ بنارس کو خیرباد کہا، حالانکہ اس مقدس شہر کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ اگر وہاں موت واقع ہوجائے تو انسان سیدھا سورگ پہنچ جاتا ہے- بنارس سے وہ ضلع بستی کےایک گاؤں مگھر میں آئے، جس کے متعلق یہ عام اعتقاد ہے کہ اگر کوئی انسان وہاں مرجاتا ہے تو پھر وہ یقینی طور پر دوسرے جنم میں گدھے کی جون میں آتا ہے - ہندوؤں اور مسلمانوں میں ان کی لاش کے متعلق تنازعہ ہوا اور قریب تھا کہ جنگ و جدل کی نوبت پہنچ جائے کہ اتنے میں کبیر ظاہر ہوگئے اور لوگوں کو حکم دیا کہ دیکھو کفن کے نیچے کیا ہے ؟ - دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں تو پھولوں کا ڈھیر پڑا ہے - نصف پھول مسلمانوں نے دفن کردیے اور باقی نصف کو ہندوؤں نے جلا ڈالا - کبیر کی رفیق زندگی لوئی غالباً کبیر سے قبل ہی وفات پاچکی تھی - کمالی کی کسی

برھمن سے شادی کردی گئی تھی - کمال ناخلف نکلا اور اس لئے روحانی بیعت کا سلسلہ دھرم داس نے قائم و برقرار رکھا' جو سب مریدوں کے خلیفہ تھے اور تاجر پیشہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے —

کبیر جو ایک غریب گمنام مسلمان جلا ہے ' نیرو ' کے فرزند تھے اور ' نیما ' کے بطن سے پیدا ہوے تھے ' سنہ ۱۳۹۸ ع میں یا اس کے لگ بھگ بنارس میں تولد ہوے تھے - ان کا باقاعدہ ختنہ ہوا تھا اور ان کی تعلیم و تربیت ان کے طبقے کے افراد کے مانند ہوئی تھی - وہ صوفیوں اور فقرا سے حسن عقیدت رکھتے تھے اور بالعموم یہ وہ لوگ ہوا کرتے تھے جو اس پاک شہر میں جس سے کبیر کی قسمت وابستہ تھی ' کچھ دنوں کے لئے آکر اقامت گزیں ہوجایا کرتے تھے یہ اسلامی روایت کہ ' شیخ تقی کا کبیر کی شخصیت کی نشو و نما پر بہت گہرا اثر پڑا تھا ' غالباً صحیح معلوم ہوتی ھے - کبیر بالآخر رامانند کے چیلوں میں داخل ہوگئے تھے اور اس کاروائی میں انھیں یقیناً خاص مشکلات کا سامنا ہوا ہوگا - انھیں خدا پر نہایت زبردست اعتقاد تھا اور قرآن اور وید دونوں کو تسلیم کرنے سے انھوں نے انکار کردیا تھا - پیر پرستی سے وہ سخت بیزار تھے اور انھوں نے ظاھری رسوم اور عبادت کو بھی یک قلم موقوف کردیا تھا —

وہ خالص رھبانیت کو مکمل روحانی زندگی کا جز و خیال نہیں کرتے تھے - اُن کی ملہمانہ شاعری کے جوش و خروش سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ مشکل نہیں ھے کہ انھیں اپنی بیوی لوئی سے غایت درجہ ھمدردی تھی - ان کی روز افزوں شہرت اور اثر ' ان کے مواعظ اور عتاب آمیز کلمات کے باعث مُلا اور پنڈت ان کے سخت دشمن ہو گئے تھے اور ہر وقت ان کی ایذا رسانی کی فکر میں لگے رہتے تھے - انھوں نے سلطان سکندر لودھی (سنہ ۱۴۸۸ ع تا ۱۵۱۸ ع) جیسے ظالم بادشاہ تک سے امداد لینے میں پس و پیش نہ کی - اس بادشاہ کے ظلم کا یہ حال تھا کہ اس نے ایک برھمن کو محض اس جرم میں مروا ڈالا تھا کہ اس نے اسلام

اور ھندو مذھب کو برابری کا درجہ دے دیا تھا - مگر اس تعصب کے با وجود اس نے عملاً مداخلت کرنے سے انکار کردیا - ممکن ھے کہ وہ کبیر کو باقاعدہ صوفی قرار دیتا ھو' یا اسے ان کی عمر کا لحاظ ھو' یا یہ کہ اسے کسی فساد کے برپا ھو جانے کا اندیشہ ھو - بہر حال کچھہ ھی وجہ کیوں نہ ھو' اس مصلح قوم کو شمالی ھندوستان اور گجرات میں اپنے مشن کے پھیلانے کا خوب موقع مل گیا - مگر ان کے ' بلخ یا ' بخارا ' جانے کی تصدیق نہیں ھوتی - ان کے مرید تمام طبقوں اور جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے - ان کی بیٹی کی شادی برھمن لڑکے سے ھوئی ھے' اور ان کا روحانی سلسلہ دھرم داس نے جو وشنوجی کا پجاری تھا ' قائم و بر قرار رکھا' خود ان کی عمر بہت طویل ھوئی' اگرچہ یہ کہنا مشتبہ ھے کہ جب ان کا انتقال موجودہ ضلع بستی کے موضع مگھرا میں ھوا تو اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ سال کی ھو چکی تھی —

رامانند کے شاگردوں میں جو مذھبی علم ادب میں نمایاں حیثیت رکھتے ھیں ' گا کرن گڑہ کا ھندو راجہ ' پیپا دھنا ' نامی جاٹ ' سائیں نامی حجام ' اور راؤ داس موچی سب شامل تھے - مگر ان سب میں بڑہ چڑہ کر کبیر تھے —

کبیر کا کام یہ تھا کہ اپنے گرو کی تعلیمات کو انتہا تک پہنچا دیں اور جس بات کو امر حق جانیں اس کا بے دھڑک پرچار کریں - تمام اوھام باطلہ ' رسوم قبیحہ اور اُن باتوں کے خلاف جو تہذیب کی برائیوں کے نام سے موسوم ھیں ' استقلال کے ساتھہ جہاد جاری رکھیں - کہا جاتا ھے کہ صوفی دنیا کے سب سے بڑے عملی آدمی ھوا کرتے ھیں - کبیر با وجود صوفیوں کے سر تاج ھونے کے نہایت عملی مصلح بھی تھے - انہوں نے قدرتاً اپنی تعلیمات کے پرچار کے لئے ملکی زبان ھی کا استعمال کیا - ایک جانب خیالات کی آمد تھی اور دوسری طرف جذبات تھے کہ وہ اظہار کے لئے تڑپ رہے تھے- اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ ان کی

قوت گویائی بہت جلد انتہائی عروج کو پہنچ گئی - ان کی شاعرانہ قوت اعلیٰ وارفع تھی اور وہ ان کے مزاج کا قدرتی نتیجہ تھی - اس میں شبہہ نہیں کہ ان کے زمانے کی اسپرٹ (اقتضا) اور خود ان کی شخصیت ان کی کامیابی کا بہت بڑا وسیلہ تھی - لیکن اس سے قطع نظر ' والٹیر ' کی طرح ان کی درازی عمر بھی ان کی کامیابی کی بڑی وجہ تھی —

یہ اعلیٰ درجے کی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ کبیر نے اصلاح مذہب کے مرکزی نقطے کوکبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا' یعنی یہ کہ خدائے برتر کی خضوع وخشوع کے ساتھ عبادت کرنا اور اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا - خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور اس کی سلطنت کا مرکز اقلیم دل ہے —

ارشاد ہوتا ہے :—

پھولوں کے باغ میں نہ جا' اے دوست وہاں نہ جا !

خود تیرے جسم میں پھولوں کا باغ پوشیدہ ہے —

" تو کنول کی ہزارہا پتیوں میں اپنی جگہ بنا ' اور وہاں سے حسن لا زوال کا تماشا کر —

" ہمہ اوست ' کے خیال کی سختی کے ساتھ ترویج فرماتے ہیں :-

"مخلوق برھما (خالق) میں ہے اور برھما خود مخلوق میں موجود ہے" —

وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں اور ملے ہوئے بھی -

وہ خود درخت بھی ہے بیج بھی اور نمو بھی وہی ہے وہ خود پھول ہے — میوہ بھی اور سایہ بھی وہی ہے —

وہ خود سورج ہے' روشنی بھی اور ہر وہ چیز بھی جو روشنی سے منور ہوجائے وہ خود برھما ہے ' مخلوق بھی اور مایا بھی -

وہ خود مختلف صورتوں میں اور لا محدود مکان میں جلوہ گر

ہو تا رہتا ہے —

وہ خود سانس ہے، لفظ بھی اور لفظ کا مفہوم بھی وہی ہے۔

وہ خود حد ہے ' خودھی لا محدود بھی ہے ' اور محدود اور لا محدود کی حدود سے بالا تر بھی ہے -

وہ خود پاک ہے اور ہر آلائش سے مبرا ہے ' وہ برھما اور مخلوق میں سائر و دائر ہے ' —

اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ بت پرستی نہ صرف بیکار محض ہے' بلکہ خالصتاً مضرت رساں بھی ہے - کبیر فرماتے ھیں کہ " اگر پتھر کی مورتیوں کی پرستش در حقیقت خدا ے بر تر تک پہنچا دیتی تو میں سارے پہاڑ ھی کو پوجنے کے لئے آمادہ ھو جاتا - لیکن پتھر کی مورتی سے تو آٹے کی چکی ھی بہتر ہے جو انسان کے لئے آٹا تو پیدا کرتی ہے - اس کی پرستش کرنا نرا اندھا پن ہے - پروھتوں نے صرف اپنے ذاتی فائدے کے لئے یہ سب رسم و رواج بنا رکھے ھیں - ھم سب کا فرض ہے کہ اصلی نام کو جپتے رھیں" -

اپنے طعنہ آمیز رنگ میں وہ مندروں اور مسجدوں کی مذمت کرتے ھیں " دنیا مندروں کے آگے جھکتی ہے' لیکن فی الحقیقت خدا کے رھنے کی جگہ تو انسان کا دل ہے - کیا خدا ے تعالی بہرا ھو گیا ہے کہ ملا کو مسجد کے میناروں پر سے چلانے کی ضرورت پڑتی ہے ؟ افسوس صد افسوس دنیا کی حماقت پر ! جس نے اندھی تقلید کی پیروی کو ذریعۂ نجات سمجھہ رکھا ہے " —

" اے قاضی ! اب کو نسی کتاب کا وعظ تم کہتے ھو - تم تو ھر وقت جھگڑتے اور مباحثہ کرتے رھتے ھو - تم کو عقل و دانش کی کوئی بات نہیں آتی - تم مجھہ سے نذر یہ ابھی میں ختنہ کرانے کے لئے کہتے ھو - مگر بھائی ' میں تو اسے برداشت نہیں کرسکتا - اگر یہ ختنہ خدا کی طرف سے ہے تو فطرتاً انسان کیوں ایسا پیدا نہیں ھوتا ؟ اگر ختنے کے ذریعے کوئی شخص ترک بن سکتا ہے تو تمھاری عورتوں

کے بارے میں کیا کہا جائیگا ؟ بیوی کو تم آدھا جسم کہتے ہو - تو بھی تم اس کے بعد ہندو ہی رہے - زنار پہننے سے ایک شخص برہمن بن جاتا ہے' لیکن تم نے پہننے کے لئے عورتوں کو کیا چیز دی ہے ؟ عورت تو پیدائش ہی سے شو در ہے" —

"اے پانڈے ! تو کھاتا کیا ہے ؟ ہندو اور ترک ' یہ کہاں سے آے ہیں - یہ راستہ کس نے نکالا ہے ؟ اپنے دل کی تلاشی لو اور اچھی طرح سے تلاشی لو' بہشت کہاں ہے - کس نے اسے حاصل کیا ہے ؟ اے بیوقوف ! ان خالی خولی باتوں کو ترک کر اور رام نام جپ - تم تو بد معاشی کی باتیں کرتے ہو - اے کبیر ! جس نے آخری وقت میں رام کی حفاظت قبول نہ کی وہ سخت گھاٹے میں رہا " —

جانوروں کے بھینٹ چڑھانے یا قربانی دینے کی رسم کی بھی سخت الفاظ میں مذمّت کی گئی ہے :—

" اے بیوقوفو اور جاہلو ! تم راستے سے بھٹک گئے ہو ' کیونکہ تمھیں کسی وقت بھی رام کی خبر نہیں ہوتی - تم گاے پر حملہ کرتے ہو اور اس پر ضرب لگاتے ہو اور اس کی جان لینے کے واسطے اس کا گلا کاٹتے ہو - تم زندوں کی جان لینے کے لئے انھیں مردہ بنا دیتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تمھاری قربانی اللہ کے لئے ہے - اے بھائی ! یہ گوشت جسے تم مقدس شے جانتے ہو ' تمھیں خبر ہے کہ کس چیز سے بنا ہے ؟ گوشت خون اور نطفے سے مرکب ہے ' لہذا جو گوشت تم کھاتے ہو وہ ناپاک ہے - اے بیوقوفو ! تم اس جہالت کا اعتراف نہیں کرتے' بلکہ کہتے ہو کہ تمھارے بزرگ بھی ایسا ہی کرتے تھے - اس کا خون تمھاری گردن پر ہے اور نیز ان پر جلھوں نے تمھیں ایسی تلقین دی- شباب کے سیاہ بال جاتے رہے ہیں ' لیکن ابھی تک تمھارے دل میں سفیدی نہیں آئی - تمھارے روزے ' تمھاری نمازیں ' اذانیں ' تمھارا چھوٹی کوٹھریوں میں مرنا ' کس کام آئیگا ؟ ان کے وید اور پرانوں کو پنڈت پڑھتے ہیں اور مولوی اپنے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں - لیکن کبیر کا کہنا یہ ہے کہ وہ سب دوزخ کا ایندھن بنیں گے جو رام سے ناواقف رہیں گے "—

کبیر کی نظر میں روزے اور حج غیر ضروری ہیں، بلکہ وہ اس زہریلی بیل کی طرح ہیں جو درخت پر پھیل کر درخت کو تباہ و برباد کردیتی ہے۔ ان پر اعتقاد رکھنا مہلک دھوکا ہے۔ اصلی نام کو یاد رکھو اور گرو کو بھی۔ نیکی جو لین دین کے طریق پر کی جائے، بیکار محض ہے —

وہ مقدس جماعتیں جو مختلف قسم کے اوہام باطلہ کی حامی رہی ہیں اور جن میں متعدد افراد کی زندگیاں شوم فال رہی ہیں، کبیر کے غصے کا جائز طور پر نشانہ بنیں اور انہوں نے ان پر نہایت شدید نکتہ چینی کی ہے۔ فرماتے ہیں :-

(۱) " ایک گدھا برہمن سے بہتر ہے۔ ایک کتا مورتیوں سے افضل ہے۔ مرغا ملانے سے بہتر ہے اس لئے کہ وہ سوتے ہوئے شہر کو جگا دیتا ہے" —

(۲) کل جگ کا برہمن محض مسخرا ہے۔ اسے خیرات مت دو۔ وہ اپنے بال بچوں سمیت سیدھا دوزخ میں جائیگا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ججمانوں کو بھی لے جائیگا" —

اسی طرح جھوٹے گرو کی بھی انہوں نے بہت مذمت کی ہے۔ سخت سے سخت الفاظ بھی اس کی شیطانی سیرت اور اس کے نقصان رساں اثرات کو پورے طور پر ظاہر کرنے سے قاصر رہتے ہیں —

اچھی اور بری صحبت کے مضمون پر کبیر کے بہت سے ارشادات ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں :—

(۱) " اچھی صحبت خوشی پیدا کرتی ہے۔ بری صحبت تکلیف پہنچاتی ہے۔ جاؤ اور جا کر سادھوؤں کی صحبت میں بیٹھو۔

(۲) کبیر کہتا ہے کہ "اچھوں کی صحبت دوسروں کی تکلیف دور کر دیتی ہے" ؎

سب اشخاص کی رہنمائی کے لئے؛ خواہ وہ پر وہت ہوں یا مولوی، نو جوان ہوں یا بوڑھے؛ کبیر نے چند اخلاقی نصائح کئے ہیں جو اپنی رفعت کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ یا مہاتما بدھ، کنفیوشس یا زرتشت کے نصائح سے ملتی جلتی ہیں۔

اور ان میں سے بعض تو ضرب الامثال کے درجے تک پہنچ گئی ھیں :—

(۱) کبیر کا قول ھے کہ " کبھی غرور نہ کرو ۔ موت تم کو بالوں سے پکڑلیگی ۔ معلوم نہیں کہ وہ کہاں آجاے ' گھر میں یا باھر " —

(۲) اس دنیا میں آجانے کے بعد تکبر نہ کرو ۔ لے لو جو کچھہ تمھیں لینا ھے ۔ یہ منڈی بند ھو جانے کے قریب ھے " —

(۳) " انسانی زندگی بلبلے کے مانندھے' وہ صبح کے تاروں کی طرح آناً فاناً غائب ھو جاتی ھے " —

بلا شبہہ کبیر کی تعلیمات میں معاشرتی نظام کے بعض پہلوؤں سے بھی بحث کی گئی ھے ۔ ان میں ایک خدا ' اخوت انسانی اور گرو کی اطاعت پر زور دیا گیا ھے ۔ اور یہی تعلیم ذات پات کے اختلافات کا بطلان کرتی ھے ۔ نہ تو خود اُنھوں نے اور نہ ان کے بعد چیلوں میں سے کسی نے باقاعدہ تنظیم کے ساتھہ معاشرتی مصلح کی حیثیت اختیار کرنے کی کوشش کی ۔ عورتوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں ھوا ۔ بیواؤں کی ستی کی رسم کی انھوں نے مذمت نہیں کی ۔ صغر سنی کی شادی یا تعدد از دواج کو جوں کا توں برقرار رکھا' مگر اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس زمانے کی حالت معاشرتی نظام میں کسی وسیع تغیر کو قبول کرنے کے خلاف تھی —

یہی کبیر کی انتہائی کمزوری ھے — اس کے عملی نتائج یہ ھیں کہ ان کے بہت سے ماننے والے ابھی تک ھندو مذھب پر اعتقاد رکھتے ھیں اور ھندو عبادت اور ظاھری مذھبی رسوم کے بھی ایک حدتک پابند ھیں — ھندو مذھب میں جذب کرنے کی جو حیرت انگیز قابلیت موجود ھے — اسے اس کمزوری سے ایک گونہ طاقت حاصل ھوئی ھے — آج متعدد کبیر پنتھی اپنےباقی ھندو بھائیوں سے بہت زیادہ اختلاف نہیں رکھتے اور وہ کبیر کو ذات اعلیٰ کا اوتار سمجھتے ھیں اور ان کے گرو کو اس دنیا کے خلیفہ کا درجہ دیتے ھیں —

کبیر کو اوتار قرار دینا بطور خود ہندو اثرات کی بین مثال ہے - گرو کی تعظیم ایسے اشخاص کے لئے لازمی تھی جو چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرنے ، بتوں کی تعظیم کرنے ، روزے اور حج (جاترا) کرنے یا روحانی تسلی کے دوسرے ذرائع سے اپنے دلوں کو اطمینان نہ دے سکتے تھے - بہر حال اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اعتقاد میں پکے تھے اور نیز وہ جو ذرا ڈانواڈول رہتے تھے ، سب کے سب ایک ہی حلقے میں جکڑے رہے —

اُردو کے ان پڑھ شاعر

از

(جناب مرزا فداعلی صاحب 'خنجر' لکھنوی)

——:o:——

آباں

ان کا نام محمد یعقوب علی خان بن احسان علی خان اور 'آباں' تخلص تھا - مولد و مسکن دھلی - بڑے وحید و خوش منظر جوان تھے - 'تاباں' کی طرح دھلی کے کوچہ و بازار میں اِن کے حسن صورت نے شہرت و مقبولیت حاصل کرلی تھی اور اسی حسن و جمال کی بدولت ہر صحبت میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے - باوجود اس شکل و شباھت کے اطوار و عادات اچھے نہ تھے - آوارگی پسند خاطر تھی - بد صحبت نے بے اعتدالیوں کی طرف راغب کر رکھا تھا - ابتدائے عمر سے خصلت بگڑ چکی تھی - ہرچند پڑھنے بٹھائے گئے - سر پرستوں نے تعلیم و تربیت میں کدوکاوش کی ' لیکن 'آباں' دولت علم سے محروم رہے - مبدء فیاض سے طبیعت موزوں اور ذھن رسا عنایت ہوا تھا - اگرچہ پڑھنا لکھنا نہ آیا ' مگر درس گاہ سخن میں داخل ہوکر رشتۂ نظم میں در مضامین پرونے لگے - کلام صاف و بامزہ ہوتا ہے - ثقیل الفاظ بالکل نہیں ہوتے - آخر وقت میں اپنی غلط کاریوں کا احساس ہونے لگا تھا - جب گذشتہ زندگی کا نقشہ سامنے آتا تو نہایت قلق ہوتا ' جذبات شاعری میں ھیجانی کیفیت پیدا ہوتی اور وہ اُسی عالم میں اپنی آوارگیوں پر پشیمان

ہوتے ہوے یوں گُل‌فشاں ہوتے :—

ان خراباتیوں کی صحبت نے　　تجکو ' آباد ' کیا خراب کیا

'آباد' کے سنہ ولادت و وفات کا پتہ نہیں چلتا' لیکن بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ ع کے غدر میں جوان تھے - اِن کی طبیعت کا اندازہ ان تین اشعار سے محال ہے - پھر بھی کچھہ نہ کچھہ تو طبیعت کی اُفتاد سے اطلاع ہوسکتی ہے —

اُس کی قامت کی یاد میں ہم نے　　مصرع سرو انتخاب کیا

تونے دریا میں اک نگاہ کے ساتھہ　　قطرۂ آب کو شراب کیا

اِن خرا باتیوں کی صحبت نے　　تجکو ' آباد ' کیاخراب کیا

آزاد

یہ اُمی شاعر قصبۂ بدایون میں پیدا ہوا' نہایت وارستہ طبیعت و آزاد مزاج تھا - خاندان میں لوہاری کا کام چلا آتا تھا' اسے بھی یہی پیشہ تعلیم کیا گیا - اہل بدایون فطری طور پر شاعری کے دلدادہ ہیں - 'آزاد' کو گاہ گاہ اُن اہل ذوق کی حضوری کا شرف ملتا رہتا تھا - وہ اُن کے فیضان سخن سے لطف اندوز ہی نہیں ہوا بلکہ طبیعت کے میلان اور موزونی سے شاعر بھی بن گیا - مزاج میں ظرافت کا عنصر بقدر مناسب موجود ہے' جو اشعار میں نمایاں ہوکر پر لطف شیرینی پیداکردیتاہے۔

افسوس! اس اَن پڑہ شاعر کے حالات فراہم نہ ہوسکے' نہ کلام ہی زیادہ دستیاب ہوا جو اس کمی کی تلافی میں پیش کیا جاتا - ۱۸ نومبر سنہ ۱۹۲۷ ع ہفتے کو مسلم ہوسٹل الہ آباد میں صحبت مشاعرہ تھی' جس میں بیرونجات کے شعرا بھی شریک ہوے تھے- لکھنؤ سے بھی بعض حضرات تشریف لے گئے تھے - چنانچہ جناب 'آسی' بھی

بغرض شرکت مشاعرہ گئے تھے - وہاں جناب 'قمر' بدایونی سے ملاقات ہوئی اور 'آزاد' کا تذکرہ چھڑا - جناب 'آسی' کی معرفت ہمیں مذکورہ حالات اور ایک شعر دستیاب ہوا :-

'آزاد' کی ہے خانہ بدوشی کا یہ عالم
کاندھے پہ لئے پھرتے ہیں چھپر کئی دن سے

—— : o : ——

احمد

احمد علی نام 'احمد' تخلص - اصل شریف لیکن غربت و نکبت نے ادنیٰ درجے کی ملازمت پر مجبور کیا - چنانچہ 'احمد' کے والد نواب والا قدر وزیر مرزا بہادر مغفور کی ڈیوڑھی پر چوکیداری کی خدمت انجام دیا کئے اور والدہ محل میں خاصہ برداری کے کام پر مامور رہیں - خود 'احمد' کو صغر سنی سے ملازمت کی ضرورت پڑی اور بعض سرکاروں میں شاگرد پیشہ کی حالت میں بسر کی - خدمت گاری کے سلسلے میں ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے شہروں کی سیر و سیاحت بھی کی' جس سے خاصہ تجربہ حاصل ہوا' آدمی خوش قطع اور زندہ دل ہے - فی الحال کلکتے میں قیام ہے اور خوانچہ لگانے پر بسر اوقات - عادات و اطوار پر بد صحبت نے پورا پورا اثر کیا ہے' منہیات سے پرہیز نہیں' لہو و لعب میں وقت گزرتا ہے - چالیس بیالیس برس کا سن ہے' مگر نشہ کی چیزوں کے استعمال نے صحت کو بگاڑ دیا ہے —

ابتدائے شباب میں شاعری کا شوق ہوا تھا - لکھنا پڑھنا صرف اسی قدر آتا ہے کہ اپنا نام لکھ لیں یا قصہ کہانیاں جو جلی حرفوں میں لکھی ہوں اُنہیں ہجا کرکے گھنٹوں میں دس پانچ لفظیں پڑھ لیں' مگر جوانی کی ولولہ خیز اُمنگوں نے طبیعت میں ابال پیدا کیا اور گاہ گاہ دو چار شعر نظم کرنے لگے -

اُن دنوں مرزا سجاد علی 'دماغ' مرحوم حیات تھے اور 'احمد' اُن کے یہاں ملازمت کرتے تھے۔ ایک روز ڈرتے ڈرتے 'دماغ' مرحوم کے سامنے اپنی تصنیف کی ہوئی غزل اصلاح کے واسطے پیش کی۔ 'دماغ' مغفور کو شاعری کا بے حد شوق تھا اور شاعروں کی کمال عزت کرتے تھے۔ 'احمد' کو فن سخن کی جانب مائل دیکھا تو خوش ہوے اور ان پر خاص عنایت فرمانے لگے۔ حوصلہ افزائی کے خیال سے اصلاح کلام قبول کی اور غزلوں کو بنانے لگے' جن میں کی اکثر غزلیں اس زمانے کے رسالوں میں شائع ہوا کیں۔ ترتیب تذکرہ کے وقت رسالۂ 'پیام یار' میں ایک غزل مل گئی جو درج کی جاتی ہے:-

عارض یار پہ کاکل نہیں لہرائی ہے
صبح سے رات گلے ملنے کو یہ آئی ہے
دام اُلفت میں اُسی دن سے مرا دل ہے اسیر
خواب میں جب سے تری زلف نظر آئی ہے
مژدہ اے بادہ کشو! خوب کرو مے نوشی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہے ہوا اور گھٹا چھائی ہے
اب تو بچتی نہیں معجھ توبہ شکن کی توبہ
خوب اُٹھی ہے گھٹا' خوب گھٹا چھائی ہے
کون مارا گیا ناکام تمنا یا رب!
کیوں یہ روتی ہوئی مقتل سے قضا آئی ہے
کون غمخوار ہے میرا شب فرقت 'احمد'
ہمنشیں ایک فقط گوشۂ تنہائی ہے

—— : o : ——

اُمراؤ علی

منشی امراؤ علی خان نام اور 'امراؤ علی' تخلص تھا - کویل کے رہنے والے تھے۔ کھیل کود کی وجہ سے امی محض رہے' لیکن بلا کی طبیعت پائی تھی' خصوصاً قوت لسانی بہت بڑھی چڑھی تھی - گفتگو میں بند ہو نا تو آتا ہی نہ تھا - ہرموضوع پر تقریر کرنے کو آمادہ ہو جاتے اور اس بے تکلفی سے بحث کرتے گویا پوری معلومات حاصل ہے - ان کی اس خصوصیت پر عام تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے' چنانچہ مولوی عبد الغفور' نساخ' اپنے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں:

> " امراؤ علی خان' ساکن کویل مقیم اکبر آباد ہر چند حرف ناآشنا تھا' مگر بڑا ذہین و ذکی تھا - ستر برس کی عمر میں انتقال کیا"—

صاحب خمخانۂ جاوید اس عبارت میں ان الفاظ کے اضافے کے ساتھ رقم طرازہیں:

> " چرب زبان ایسے تھے کہ حریفوں کو سامنے بولنے کی مجال نہ ہوتی' اگرچہ امی تھے لیکن قوت بیانیہ' ذہن رسا اور تیزی حافظہ کی بدولت کاملوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے اور کسی سے بند نہ ہوتے " الخ —

مختلف زبانوں کے اکثر بلکہ ہزار ہا الفاظ از بر تھے' اردو فارسی کے علاوہ انگریزی' فرانسیسی' اور ترکی زبانوں کی لفظوں کے بھی حافظ و ماہر تھے' جنھیں دوران گفتگو میں بے تکلف استعمال کر کے سامعین کے قلوب میں اپنی وجاہت معلومات راسخ کر دیتے - آگرے میں زیادہ تر قیام رہتا' سنہ ۱۸۵۷ ع کے غدر سے پہلے ستر برس کی عمر پا کر انتقال کیا - منشی کہنے سے بہت خوش ہوتے تھے' اس لئے ان کے احباب نام کے ساتھ لفظ منشی ضرور استعمال کرتے' تذکروں میں صرف

دو شعر ان کے نام سے دیکھے گئے:-

نزع میں دیکھا تو بولے ضعف آیا ہے اسے
مرگ تک ہم سے رہیں کافر کی تھتے بازیاں

دو پھول گر کسی نے چڑھائے اُڑا دیے
باد صبا کو گورِ غریباں سے لاگ ہے

—— : o : ——

اُمی

روشن بیگ نام، اُمی تخلص۔ حمیدالدولہ کے بھائی تھے، جو ابوظفر آخری تاجدار دہلی کی سرکار میں بزمانۂ ولیعہدی داروغہ و منصرم تھے۔ خاک پاک دہلی سے خمیر ہوے اور وہیں تیرھویں صدی ھجری میں پیوند زمین ہو گئے۔ اکتساب علوم کی جانب بالکل توجہ نہ تھی، مدرسے میں کھیل کود کا شوق رہا۔ استاد سے جو کچھ پڑھا اسے طاق نسیاں پر دھرتے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم سے بالکل کورے رہے، منتہاے جہالت یہ ہے کہ اپنا نام بھی لکھنے سے معذور تھے، مگر مبدء فیاض نے قیامت کی ذہانت اور بلا کا حافظہ عطا کیا تھا۔ جس واقعے کو ذہن میں محفوظ کیا، ساری عمر فراموش نہ ہوا۔ اُن دنوں شاعری کا عروج تھا اچھے اچھے شاعر پیدا ہو رہے تھے، شاہ نصیر کا طوطی بول رہا تھا، اور اردو زبان ان کی گود میں پرورش پارہی تھی۔ شائقین سخن ان کے روز مرہ، صفائی بندش، حسن ادا، لطافت مضامین اور پاکیزگی تخیل پر سر دھن رہے تھے۔ شیخ ابراهیم ذوق، (جو بعد کو "خاقانی ہند" کے خطاب سے سر فراز ہوے) حکیم مومن خان، مومن، میر حسین

'تسکین' سے خوش فکر و خوش گو ہونہار شعرا ان کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ اسی کا عنفوان شباب تھا۔ جذبات کی فراوانی، اُمنگوں کی کثرت نے فن لطیفہ گوئی (شاعری) کی جانب متوجہ کیا۔ استعداد علم تو تھی ہی نہیں، فطری لگاؤ خضر راہ بنا۔ رسائی ذہن اور موزونی طبیعت کی بدولت کچھ کچھ نظم کرنا شروع کیا۔ شرفاے دہلی کی صحبت وہم نشینی نے مذاق سلیم اور ذوق صحیح پیدا کردیا۔ ابتداءً جو کچھ کہا، حلقۂ احباب میں پڑھ کر سنایا۔ اہل دہلی کا تمام تر رجحان صفائی بندش اور لطف زبان کی طرف تھا۔ اُسی کے کلام میں ان چیزوں کی کمی نہ تھی، ایک ایک شعر معاملہ بندی کا دفتر اور لطف روز مرہ کا منبع ہو رہا تھا۔ داد ملی اور امید سے زیادہ ملی۔ اب کیا تھا؛ ذوق سخن دونا ہو گیا، طبیعت نے دریا کی سی روانی اختیار کی، روز ایک دو غزلیں تصنیف ہونے لگیں۔ قدما کا کلام از بر تھا، موجودہ شاعری کی غزل سرائیاں سننے میں آ رہی تھیں، مشاعروں میں ایک سے ایک زیادہ لطیف شعر سامعہ نواز ہوتا اور اُسی کی معلومات کا ذخیرہ بڑھتا جاتا۔ طبیعت موزوں ہو تو عروض کی چنداں ضرورت نہیں پڑتی، جذبات قلبی خود بخود نظم کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔

شعر می گویم بہ از قند و نبات

من نہ دانم فا علاتن فاعلات (مولانا رومی)

الغرض اُسی کا میلان طبیعت اُن کو اُس طرف لے چلا، جدھر اُس زمانے کے شرفا نہایت سرعت و تیزی سے گام زن تھے۔ چونکہ راہ سے نا بلد، رستہ نا ہموار، ذرا سی لغزش میں منہ کے بل گر پڑنے کا اندیشہ، اِس لئے ایک راہبر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جب تک کہ اُستاد فن نکات شعر نہ سمجھاے، اُسی کے سے آدمی کے لیے اُن کا سمجھ لینا محال تھا۔ اُن دنوں عام خیالات شاہ 'نصیر' کی شاعری میں ڈوبے ہوے تھے۔ اُسی بھی اس اثر سے محفوظ نہ تھے۔ نصیر کی شیوہ بیانی،

دل میں گھر کر چکی تھی - یہی عقیدت و ارادت محرک ہوی اور یہ ایک روز اُن کی خدمت میں جا پہنچے ، موقعہ و محل سے اپنا عندیہ ظاہر کیا ' شاہ نصیر بہت ہی خلیق تھے ، کسی کی درخواست مسترد کرنا تو جانتے ہی نہ تھے - راضی تو ہوے لیکن اُمی کی جہالت کا تصور کر کے متفکر ہو گئے - گویا وہ شخص جس کو فن شہسواری سے کوئی علاقہ نہ ہو، منہ زور گھوڑے پر سوار ہو کر فنون سپہ گری اور چوگان بازی دکھانے کا خواستگار ہے - امتحاناً چند اشعار سنانے کا حکم دیا - اُمی نے تعمیل ارشاد کی - شعر سنتے تو حیران رہ گئے ' بہت خوش ہوے ' اُسی وقت غزل کو اصلاح دے کر حسن صوری و معنوی سے آراستہ و مزین کردیا —

اُس روز سے اُمی بھی حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے - اُستاد شفیق کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن دینے لگے - روز مرہ اور معاملہ بندی اُن کے کلام کی جان ہے - ثقیل الفاظ سے قطعاً احتراز کرتے ہیں - بعض اشعار سے جہالت ولا علمی اپنی جھلک دکھاتی ہے - باوجود اغلاط کی موجودگی کے بھی ایسے شاعر کو اُس کی طبع خدا ساز کی جو لانیوں کی داد نہ دینا غضب ہے ' افسوس ! اُمی مرحوم کا کلام دستیاب نہیں ہوتا - تذکروں کی ورق گردانی اور چھان بین کرنے سے جو اشعار فراہم ہوے' نذر نگاہ شائقین کئے جاتے ہیں :

جہاں زنجیر ہم سنتے ہیں' منگوا مول لیتے ہیں
تری زلفوں کے سودے میں یہ سودا مول لیتے ہیں

جی دھڑکتا ہے کہ پہنچے میں نہ آ جاے لچک
ہاتھ سے چھوڑ دیا میں نے ترا جان کے ہاتھ

گرمی مے سے زباں پر آبلے پڑتے ہیں کیا
اے مغاں ! اس میں مغیلاں کی بھی پڑتی چھال ہے

امیر

میر امیر علی نام امیرؔ تخلص شاہجہاں آباد کے باشندے اور میر مؤمن علی کے فرزند تھے، جو دہلی کے متوسط الحال شرفا میں شمار کئے جاتے تھے اور اُمرائے شہر کی سرکاروں میں ملازمت کرکے کسب معاش کرتے تھے۔ زمانے کو شرفا سے بیر ہے، اکثر خاندان اس جفا پیشہ کی ستمرانیوں سے مغلوب ہوکر دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوئے۔ بہتوں نے خستہ حالی اور درماندگی میں عمریں بسر کردیں، لیکن غیرت و حمیت ذاتی نے کسی ایسے فعل کی اجازت نہ دی جو اُن کے دامن خودداری پر بدنما دھبا بن کر نمودار ہوتا ـــ

میر مومن علی کے ساتھ بھی زمانے نے وہی سلوک کیا، جو اور شرفا کے ساتھ کرتا آیا ہے۔ ہمیشہ تنگ دستی اور نکبت و افلاس میں بسر ہوئی، یہی سبب تھا کہ ہونہار فرزند میر امیر علی 'امیر' کو تعلیم نہ دلواسکے، رسم مروجہ کے موافق مسجد میں بیٹھ کر درس و تدریس کرنے والوں میں سے کسی ملّا کے حوالے کردیا، جہاں غریب امیر کو علم حاصل ہونے کے بدلے خدمتگاروں کی طرح سودا سلف خریدنے کی کافی مہارت ہو گئی ـــ

بے چارے مدرسے سے نکلے تو بالکل ویسے ہی تھے جیسے داخل ہوئے تھے۔ ملا صاحب کے فیض تربیت نے علمی مفاد سے کلیتاً بے نیاز رکھا۔ اور تو اور اتنا بھی نہ ہوسکا جو ضرورت کے وقت اپنا نام لکھ سکتے ـــ

تحصیل علم کا زمانہ تو ملا صاحب کی خدمت گذاری میں بسر ہوا۔ اُس کے بعد وہ فصل شروع ہوئی جو جوانی دوانی کے نام سے مشہور ہے۔ جذبات نوجوانوں کو اکثر غلط راستوں پر لگا دیتے ہیں۔ لیکن امیر کے حصے میں وراثتاً شرافت آئی تھی۔ جوان ہوتے ہی علما و صلحا کی صحبت اختیار کی، ہر چند خود تو پڑھے لکھے نہ تھے مگر اُن کے عالمانہ مکالمے سن سن کے اچھی معلومات بہم پہنچالی۔ اس صحبت

نے ایک طرف اخلاق و عادات کی درستی کی تو دوسری جانب جلاے ذہنی کا کام کیا۔
انجام یہ ہوا کہ فن تقریر و خطابت میں دخل ہو گیا - باوجود جہالت کے جس موضوع پر
زبان کھولتے بے تکلف بولتے چلے جاتے، کسی مقام پر عجز طبیعت ظاہر نہ ہوتا - اکثر
تاریخی افسانے از بر تھے، جنھیں محل و موقع سے بیان کرکے سامعین کے قلوب کو
محظوظ و مسرور کرتے - اسی کمال کی بدولت 'امیر' سوسائٹی کی جان تصور ہونے
لگے - اُمرا کی دل چسپ و باکیف صحبتیں ان کی خوش گفتاریوں اور بذلہ سنجیوں
سے صحن گلزار بن گئیں، جہاں ترانۂ بلبل اور صوت ہزار کی سی کیفیت طاری رہتی۔
ہرچند اور لوگ علم مجلس سے اطلاع رکھتے تھے، لیکن امیر کی خصوصیت جہل نے
اُنھیں ہم عصروں پر فوقیت عطا کردی تھی - جو اُن کی تقریریں اور شیوہ بیانی
سنتا حیران و ششدر رہ جاتا - چوں کہ شعر و سخن کا بازار گرم تھا کوئی صحبت،
کوئی مجلس اس ذکر، اس فکر سے خالی نہ تھی، ادنیٰ و اعلیٰ برنا و پیر بادۂ سخن کے
متوالے ہورہے تھے - شاعری کے بغیر کسی کی دلچسپی ہی نہ ہوتی۔ خصوصاً 'امیر'
سے شخص کو، جسے اپنی تقریر دل چسپ و دل پذیر بنانے کے لئے جابجا اشعار کی آمیزش
سے رنگینی پیدا کرنے کی ضرورت تھی —

آخرالامر یہ ضرورت محرک سخن سرائی ہوی - خزانۂ قدرت سے طبع موزوں
اور ذہن رسا لائے تھے، اُس پر سخن سنجان دہلی کا فیض صحبت سونے پر سہاگا
ہوگیا - شعر گوئی کا سلسلہ شروع ہوا - ذوق صحیح نے رہبری کی، فکر بلند نے
ہاتھ تھاما اور 'امیر' شاعر بن گئے - طبیعت نزاکت پسند واقع ہوی تھی، طائر خیال
نے فضاے بسیط میں پرواز شروع کی - سامنے کے مضامین پسند نہ آے، نازک
و لطیف خیالات کو لفظوں کے رنگ و روغن سے رنگ رنگ کر مرقعے تیار کئے، مگر
کم استعدادی نے جوہر کمال پر پردہ ڈالا - جو مضامین بلند خاطرنشین ہوتے، اُنھیں
الفاظ نہ ملنے سے حسب دل خواہ اور بعنوان احسن نظم نہ کرسکتے -
بعض مقامات پر بندش کی سستی پھیکاپن ظاہر کرکے لطف شعر کو گھٹا دیتی،

جو محض کم علمی کا باعث ہے - لیکن ان خامیوں کی وجہ سے ان کا مرتبۂ شاعری پست نہیں ہوسکتا، کیوں کہ وہ معذور تصور کئے جانے کے قابل ہیں - اُنہیں پڑھے لکھے شعرا کی طرح علم سے بہرہ نہ تھا، جو قدما کے دواوین کا مطالعہ کرکے معلومات شعری میں اضافہ کرتے، یا تاریخ و سیر کی بدولت معلومات کے دائرے کو وسعت دیتے- اُن کے علم کی ساری کائنات وہ سنی سنائی روایتیں تھیں، جن میں واقعیت کا عنصر خفیف اور مبالغے کی بھر مار تھی - پھر بھی آفریں ہے اُس طبیعت پر جس نے باوجود عجز علمی ادب اُردو کی خدمت کی —

'امیر' کو فن سخن میں حکیم عزت اللہ 'عشق' سے استفادہ حاصل تھا- جو کچھ کہتے اُسے 'عشق' کی اصلاح سے مزین کرلیتے - مشاعروں میں شریک ہوتے اور حافظے کی مدد سے کلام سناکر شرکاے بزم کو لطف اندوز کرتے - دہلی ہی میں انتقال کیا، جس ارض پاک سے اُٹھے تھے اُسی خطے میں زمین کا پیوند ہوگئے - تذکروں نے کچھ حالات تو بتاے مگر کلام بہت کم نقل کیا، صرف چار شعر ملے جو درج ہوے :

هم کو حاصل کیونکہ ہو تیرے قد زیبا کی سیر
کب میسر ہوسکے ہے عالم بالا کی سیر

سبزہ رنگوں پہ زہر کھا کے موا   کوئی دیکھے تو اس 'امیر' کا دل

خوب دیکھا ہے ہم نے خوباں کو   پھول خوش رنگ ہیں پہ باس نہیں
بولا وہ دیکھ کر 'امیر' کا حال   اس کے جینے کی اب تو آس نہیں

—— : ٥ : ——

بدتر

شیخ بلاقی نام 'بدتر' تخلص، باشندۂ لکھنؤ - سبزی فروش تھا - موزوں طبع،

لطیفہ گو، زندہ دل اور حاضر جواب - امیروں، رئیسوں کو مزیدار باتوں، دلچسپ لطیفوں کے اثر سے اپنی جانب متوجہ کرلینے میں کمال رکھتا تھا - آم اور خربزے کی فروخت پر معاش کا دارومدار تھا - خربوزوں کی فصل میں خربوزے اور آم کی فصل میں قلمی اور تخمی آموں کی ڈالیاں اکثر امیروں اور نوابوں کی ڈیوڑھیوں پر حاضر ہوتا - کچھ اچھے دار باتوں، کچھ اپنے تصنیف کئے ہوے شعروں اور غزلوں کو سنا سنا کر خوش کرتا اور سودا بیچتا - وہ شاعری کے ذوق اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے منھ لگا کر بات کرتے اور خاطر خواہ قیمت دے کر پھل خرید لیتے - دونوں فصلوں میں اتنی یافت ہوجاتی کہ میاں 'بدتر' کو ترکاری کا کاروبار کرنے کی ضرورت نہ پڑتی اور سال بھر فراغت سے بیٹھ کر شعر شاعری میں بسر کرتے -

اس کا جہل اس حد پر تھا کہ تلفظ بھی صحیح نہ تھا، (ش) کو (س) اور (ق) کو (ک) سے بدل کر استعمال کرتا لیکن طبیعت کی موزونی اور ذہن کی رسائی نے ناظم بنادیا - مشاعروں میں غزل پڑھنے کا شوق بالکل نہ تھا - ایک بات یہ بھی تھی کہ ادنی پیشہ ور ہونے کی وجہ سے شعراے وقت اپنے ساتھ بٹھانا مناسب نہ سمجھتے تھے - 'بد تر' کسی کا شاگرد نہ تھا، جو وقت پر مل گیا، غزل بنوالی اور جہاں گیا بے تکلف اشعار سنا آیا - ایک مرتبہ 'مرزا بہادر' مرزا محمد عباس علی خاں 'جگر' مرحوم رئیس لکھنؤ کے حضور میں حاضر تھا - ٹوکرے میں قلمی آم چنے ہوے سامنے رکھے تھے اور پائین فرش بیٹھا ہوا لطائف و ظرائف بیان کررہا تھا - مرزا بہادر اور اہل صحبت 'بدتر' کی دل چسپ باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے- 'جگر' مرحوم کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے اور بیچ بیچ میں اس کی طبیعت داری کے متعلق کوئی گرما گرم فقرہ بھی چھوڑتے جاتے تھے - جسے سن کر وہ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ عرض کرتا "شاعری کیا کرتا ہوں، آم بیچنے کا ڈھنگ نکالا ہے- خدا کی عنایت اور سرکاروں کی بدولت ان دو فصلوں میں سال بھرکے لئے آسودہ

ہوجاتا ہوں" - ایک دعائیہ شعر بھی تصنیف کیا تھا جو ایسے موقعوں پر پڑھا کرتا تھا :

تم سلامت رہو اے آم کے کھانے والو!
ہم تو دن رات یہی دل سے دعا کرتے ہیں

شاید اس زمین میں 'بدتر' نے پوری غزل تصنیف کی تھی لیکن حافظے کی بیاض میں کوئی شعر محفوظ نہیں رہا ' یہ شعر مشہور ہو چکا تھا جو ضبط تحریر میں آیا—

بڑا منکسر تھا ' رئیسوں کے منھ چڑھنے کے زعم میں خود کو نہ بھولا ' جہاں جہاں جاتا وہاں کے عملے سے بعجز و مراعات پیش آتا - ایک دفعہ کسی نے مزاح کی راہ سے 'بدتر' تخلص اختیار کرنے کا باعث دریافت کیا تو جواب دیا "میاں! پڑھا نہ لکھا قوم کا کبڑیا بھی کہیں شاعری کر سکتا ہے؟ خدا کی قدرت اور لکھنؤ کی ہوا کا اثر ہے جو کچھ اوٹ پٹانگ بک لیتا ہوں ' جیسا کلام ویسا تخلص ' سچ یہ ہے کہ دنیا بھر کے شاعر خوشتر اور بلاقی بدتر ہے" —

ایک روز برسبیل تذکرہ بیان کیا کہ "مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوا - وہاں کے لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوا - شاعری کا ذکر چلا - اُن حضرات کے اشعار سنے' اپنا بکا ہوا گزارش کیا - سب خوش ہوے - تعریفوں سے حوصلہ افزائی فرمائی - ایک صاحب ظریف الطبع بھی تشریف فرما تھے ' میرے چھیڑنے کو یہ شعر موزوں کر کے پڑھا :—

ہیں دلی والے ' لکھنؤ والوں کے سامنے
ہو جیسے کوئی شیر غزالوں کے سامنے

مجھے یہ مذاق پسند نہ آیا - لکھنؤ والوں کو غزال کہہ کر شیران دہلی کا شکار بنایا گیا تھا - سر جھکا کر جواب دینے کی فکر کرنے لگا - فوراً مصرع ذہن میں آیا اور میں نے سر اُٹھا کر دست بستہ التماس کی حضور! میں نے اس شعر کو پہلے بھی سنا ہے - لیکن دوسرے مصرع کی ترکیب بدلی ہوئی ہے' اجازت ہو تو عرض

کروں ؟ " انھوں نے فرمایا : پڑھو - میں نے پڑھا :

ہیں دلی والے لکھنؤ والوں کے سامنے
ہو جیسے ڈیچوا کوئی کالوں کے سامنے

اور ہاتھ جوڑ کر گزارش کی : " سرکار ! آپ لوگ بڑے آدمی ہیں' بندوق سے شیروں بھیڑیوں کا شکار کر سکتے ہیں ' شجاعت و دلیری آپ کی میراث ہے - میں تکے کا کبڑیا' اتنا دل گردہ کہاں سے لاؤں جو ان خونخوار درندوں سے مقابلہ کروں - میری زندگی تو کھیتوں میں گذری ہے ان کی مینڈوں پر برسات کی فصل میں اسی قسم کے کیڑے مکوڑوں کو رینگتے دیکھا ہے اور انھیں کو جانتا پہچانتا ہوں-

'بدتر' کو لکھنؤ سے دلی محبت تھی' یہاں کے شعرا کو دنیا بھر کے شاعروں سے بہتر سمجھتا تھا - اسے دہلی و لکھنؤ کے مناقشے و مناظرے بہت زیادہ متأثر کرتے- ان موقعوں پر جہاں تک زبان کو یارا ہوتا وہ اپنی عقل و بساط کے موافق اہل لکھنؤ کی فضلیت ثابت کرتا اور صفت و ثنا بیان کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا - اس کے مزاج میں پر لطف شوخیاں تھیں' کوئی بات ظرافت سے خالی نہ جاتی- اکثر ستم ظریف حضرات 'بدتر' کو چھیڑنے کی نیت سے شعرائے دہلی کا چرچا کرتے ہوئے ان کی فضیلت و فوقیت ثابت کرتے' جس سے بگڑے دل امی شاعر چراغ پا ہو کر الٹی سیدھی تقریر شروع کر دیتا - مگر اتنا ضرور تھا کہ اشتعال کے وقت بھی مخاطب کا ادب و حفظ مراتب فرو گزاشت نہ کرتا —

اخیر عمر میں مرض ضیق النفس میں مبتلا ہو گیا تھا' جس سے نہایت پریشان رہا کرتا - ابتدا سے اکہرے ہاتھ پاؤں کا آدمی تھا ' اس مرض نے گھلا گھلا کر ہڈیوں کا ڈھانچا کر دیا تھا ' چند سال ہوئے (سنہ ۱۹۲۲ ع) کے کچھ قبل یا بعد فوت ہوا - اپنی یادگار ایک لڑکا چھوڑا ' جو فی الحال کانپور میں اپنا پیشہ کرتا ہے- اس کا کلام تو زیادہ تھا' لیکن وارستہ مزاجی کی بدولت سب ضائع ہو گیا ' چند شعر جو بعض حضرات کے حافظے میں موجود تھے ' دریافت کر کے تذکرے میں

تحریر کیے جاتے ہیں۔ ان سے میاں 'بدتر' کی طبع موزوں کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہے —

تڑپتا ہوں دردِ جدائی سے کیوں کر
اُدھر جانے والے اِدھر دیکھ لینا
جو سچ مچ ہے یہ عشق صادق ہمارا
تو خود ہوگا تم کو اثر دیکھ لینا

مر گیا وہ اس تمنا میں نہ سنا تم نے حال "بدتر" کا

وصل سے کردیا انکار ' یہ کیا تم نے کیا
دیکھو ! اک بات میں بس ٹوٹ گیا دل میرا

ڈسا اُس زلف کی ناگن کا بچتا ہے کہیں 'بدتر'
مرے جینے کی 'چارہ ساز کیوں تدبیر کرتے ہیں

تم سلامت رہو اے آم کے کھانے والو!
ہم تو دن رات یہی دل سے دعا کرتے ہیں

وفا داری میں کاٹی زندگی اُس کی سزا یہ ہے
ہماری لاش کو بھی کو بکو تشہیر کرتے ہو

اُس کی آنکھوں میں کب حیا آئی جان لینے کو یہ ادا آئی
جب سے اُس شوخ کا شباب آیا دل بیتاب کی قضا آئی

نہیں معلوم ہنسنے والوں کو   رونے والوں پہ کیا گذرتی ہے

صاف آتی ہے تیری زلف کی بو   جب اِدھر سے صبا گذرتی ہے

—— : o: ——

بشیر

محمد بشیر خاں نام '' بشیر'' تخلص' رام پور کے رہنے والے اور خمخانۂ جاوید جلد اول کی ترتیب کے وقت ساٹھ باسٹھ برس کے تھے - سپاہیانہ وضع کے دل دادہ اور خوش باش آدمی ' شاعری کا کمال شوق تھا - ابتدائے عمر سے ایلائے سخن پر دل نثار کر چکے تھے - خیر سے تحصیل علم کی جانب میلان طبع نہ ہوا' ایکی فنون شناوری و کُشتی میں ' فن مہارت حاصل کر لی - شعر و سخن سے مناسبت رکھتے تھے - ساتھ ساتھ مشق شاعری بھی جاری رہی - نواب فصیح الملک ' داغ ' جیسے معاملہ رس و شوخ طبع شاعر کے حضور میں زانوے شاگردی تہ کیا' فکر رسا اور تیس بتیس برس کی متواتر و مسلسل مشق نے معقول استعداد شعر گوئی پیدا کردی - واردات قلبیہ اور معاملہ بڑی صفائی سے نظم کرتے ہیں - بیان کی روانی اور کلام کی سلاست پر نظر ڈالنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کسی ان پڑھ کے اشعار ہیں - بقول لالہ سر یرام مؤلف ہزار داستاں :-

> " بظاہر الف کے نام بے نہیں جانتے مگر مبدء فیاض نے اس فن میں خاصہ حصہ دیا ہے - شعر اچھا کہہ لیتے ہیں اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کسی ان پڑھ کا کلام ہے " —

جن دنوں داغ ' مرحوم ' سرکار رامپور میں اپنے زمزموں سے اہل دربار کو مسرور کررہے تھے ' ' بشیر' کا عالم شباب تھا - ہمہ وقت استاد کی حضوری کے شرف نے آئینۂ طبیعت پر صیقل کردی تھی ' تیغ زبان کے جوہر اُبھرنے لگے تھے '

بالعموم ایک دو غزلیں تصنیف ہو کر شفیق استاد کے ملاحظے میں پیش ہوا کرتیں۔ حضرت "داغ" بھی اپنے اس اُمی شاگرد کے حال پر خاص عنایت و توجہ فرماتے اور غزلوں کو زیور اصلاح سے مزین کرتے وقت پورا لحاظ کرتے —

جہاں یہ سب تھا، وہاں بڑی قباحت یہ بھی تھی کہ "بشیر" معیشت کی جانب سے مطمئن نہ تھے - اکثر بے روز گاری کی وجہ سے پریشاں خاطر رہا کرتے، شاعری کے لئے جس فراغت و سکون قلب و دماغ کی ضرورت ہے، وہ اُنہیں میسر نہ تھا۔ آخر انہیں مصیبتوں سے تنگ ہو کر حیدرآباد چلے گئے اور وہیں کسی رئیس کی ملازمت اختیار کر کے کچھ نہ کچھ مطمئن ہو گئے - کلام یہ ہے

گردش چشم سے کب یہ دل مضطر پھرتا
بت وفا کرتے تو اِن سے کوئی کافر پھرتا
یہ اگاوٹ، یہ کرشمے جو نہ ہوتے تجھ میں
اے صنم کہہ تو خدا سے کوئی کیونکر پھرتا

نقد دل میں نے چھپایا تو برائی کیا کی
کوئی رکھتا نہیں دولت کو تونگر باہر

اُن کا وہ ناز سے کہنا کہ "عبث رو رو کر
پانی کرنا تمھیں خوب اپنا لہو آتا ہے"
دھوم رندوں میں ہے، مجلس سے نکل کر واعظ
آج میخانے میں کرنے کو وضو آتا ہے

تنہا لحد میں چھوڑ گئے آج وہ رفیق
ہوتے نہ تھے جو مجھ سے گھڑی بھر جدا کبھی

وہ چیز تھی شراب کہ اس پر جہاں میں
سب فاتحہ دلاتے جو ہوتی روا کبھی

تیغ قاتل پر گلو مقتل میں رکھہ دیں بڑہ کے خود
کر دکھائیں آج ہم بھی جو ہمارے دل میں ہے

بتوں کو بے وفا تونے بنایا، کیا وفا کم تھی
کمی کس کی تھی، کیا شے تیرے گھر میں اے خدا کم تھی
نگاہ غور سے دیکھا تو وہ دونوں برابر تھیں
نہ فرقت تھی قضا سے کم، نہ فرقت سے قضا کم تھی
بنایا آسماں بھی اور اک بھر ستم تونے
الٰہی! تیرے بندوں پر بتوں کی کیا جفا کم تھی

—— : o : ——

بنیاد

اِن کا نام شیخ بنیاد علی اور ' بنیاد ' تخلص ہے۔ شیخ صدیقی۔ قصبۂ اُلدن ضلع میرٹھہ کے باشندے اور ایک معزز خاندان کے رکن تھے۔ سارے قصبے میں ان کا گھرانا عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور زمینداری پر بسر ہوتی تھی۔ ' بنیاد ' اگلی وضع کے پابند، خلیق، متواضع اور بڑے ہی نیک مزاج واقع ہوے تھے۔ انھیں میرے دوست مولوی عبدالباری ' آسی ' کی ہم وطنی اور قرابت کا شرف حاصل تھا۔ طبیعت تیز اور ذکر رسا پائی تھی۔ قصبۂ اُلدن جس کی زمین مردم خیزی کے لئے مشہور ہے، اُسی شاعر بھی پیدا کرنے سے عاری

نه رهی اور ' بنیاد ' جیسی ذهین شخصیت پیدا کی' جس نے بے علمی کے عالم میں اپنی نظمیں الاپ کر اهل قصبه کو صرف محظوظ هی نهیں بلکه حیران و ششدر بنا دیا - چوں که اُلدن ' میرٹھ اور دهلی سے قریب تر واقع هوا هے - اس لئے ان هر دو مقامات کی شاعری سے متأثر هونا بعید نه تها - اچها خاصا اثر هوا' اُس کی خاک نے اچھے اچھے ادیب و شاعر پیدا کئے —

' بنیاد ' کو جب گھر کے دهندوں اور زمینداری کے مشغلوں سے نجات هوتی تو اهل برادری کی صحبت میں جا بیٹھتے اور اُن مجلسوں کے علمی و ادبی چرچے اُن کی ذهانت و طباعی پر جلا کرتے - جب ذی اختیار هوے تو شباب کے جوش اور ولولے نے غلط راستے پر لگا دیا - زندگی کے بیش قیمت اوقات لهوولعب میں ضائع هونے لگے " بد کام کا بد انجام " مثل مشهور هے' انجام کار آبائی زمینداری تلف هو گئی اور شیخ ' بنیاد ' کی شخصیت به اعتبار دولت و ثروت ادنی حالت پر پهنچ گئی - ادهر خانگی جهگڑوں اور باهمی مناقشوں نے عاجز و پریشان کرنا شروع کیا - خود ' بنیاد ' کے صاحبزادے مخالفت پر کمر بسته هوگئے اور شیخ صاحب کو صدمات و آلام روحانی میں مبتلا هونا پڑا - مصیبت کی گهڑیوں میں جب جذبات و حسیات میں هیجانی کیفیت پیدا هوتی هے تو قدرتاً طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف هو جاتا هے - جوانی کا زمانه ختم کرنے کے بعد ابتدائے شیب میں ' بنیاد' کو شوق شاعری دامن گیر هوا' چوں که " آلا کے راگ " سننے کا بهت شوق تها اس لئے پہلے پہل اُسی قماش کے دوهے منظوم کئے - خود تو ایک حرف بهی لکهنا پڑهنا نه جانتے تهے جو کچهه کهتے دوسروں سے لکهوالیا کرتے - شوق کی ابتدا تهی' طبیعت هر وقت حاضر رهتی - عالم شباب کی گرم جوشیاں تو سرد پڑ چکی تهیں ' غارت گرو تباه کن اشغال کا سلسله بالکل قطع هو گیا تها ' اب یا تو خانگی کام کاج دل بهلانے کا ذریعه تهے یا ایلاے سخن مونس و دمساز زندگی تهی - تهوڑے هی دنوں میں دوهوں کا اچها خاصا ذخیره جمع هو گیا - اُس زمانے میں

'آسی' نو عمر تھے لیکن شاعری کا آغاز ہو چکا تھا - شعر و سخن کی بساط بچھی تھی اور مضامین تازہ بتازہ کی چالیں چلی جا رہی تھیں۔ بنیاد کو 'آسی' سے بزرگانہ صحبت تھی اکثر اُن کے یہاں نشست رکھتے ' اپنے دوھے سناتے اور اُن کے اشعار سنتے۔ لطف یہ کہ ان موقعوں پر خوردی و بزرگی کا امتیاز بالاے طاق رکھہ کر بے تکلف دوست کی طرح داد کلام دیتے اور فذرانۂ تحسین قبول فرماتے۔ اگرچہ 'بنیاد' سن و سال میں حضرت 'آسی' سے بہت بڑے تھے لیکن شوق سخن ساتھہ ساتھہ شروع ہوا تھا۔ درمیان سے تکلفات کا پردہ اتھا دیا تھا - اس نشست و برخاست کا یہ نتیجہ نکلا کہ 'بنیاد' کی طبیعت نے پلتا کھایا 'دوھے' اشعار اور 'لاونیاں' غزلوں کی صورت میں تبدیل ہونے لگیں - خصوصاً اس دل‌چسپ مشغلے نے اس وقت اور ترقی کی جب شیخ 'بنیاد' نے اپنے فرزند سے کبیدہ خاطر ہوکر علیحدگی اختیار کرکے اپنی اهلیہ کے ساتھہ جناب 'آسی' کے هاں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی - ان کے انتقال کو چند سال ہوے -

ترتیب تذکرہ کے وقت جناب 'آسی' نے ان کے یہ حالات بیان فرماے تھے جو ناظرین کے سامنے پیش کیے گئے -

ان کے کچھہ اشعار جناب 'آسی' کو یاد تھے جو تبرکاً درج هیں - ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری معمولی تک بندی سے آگے نہ بڑھ سکی - نہ تو خوش گویان دهلی کی طرح کلام میں سلونا پن ہے نہ زبان کا چٹخارا - حسن تخیل تو بہت دور ہے - هاں دیہاتی اکھڑپن ہے' جس نے ظرافت کے بدلے اشعار کو مضحک بنا دیا ہے - تاهم ایک اَن پڑھ شاعر کی تک بندی بھی کچھہ توجہ کی مستحق ہے - الحال ساڑھے تین شعر 'بنیاد' کی کائنات سخن هیں :-

ناراض مجھہ سے غیر بھی' دشمن هیں اپنے بھی
دھوبی کا کُتا ہوں' نہ میں گھر کانہ گھاٹ کا

کوئی زھردار ان سے بڑھ کر نہیں ھے　　حسینوں کے کاٹے کا منتر نہیں ھے

میں تو اچھا ھوں مگر اے بنیاد　　لوگ کرتے ھیں برائی میری

(پہلا مصرع یاد نہ آیا)　　گُڑ کھاکے گُلگلوں سے پرھیز ھورھا ھے

—— : o : ——

پیرا

پیر علی نام 'پیرا' تخلص' قوم کا سقہ تھا - یہ شرف خاک پاک دھلی و لکھنؤ کو حاصل ھے کہ اس نے ایسے ایسے صاحب ذھن و دماغ اشخاص پیدا کئے جو باوجود بے علمی اور ادنی خاندان میں پیدا ھونے کے جہاں خیالات عالیہ نام کو نہیں پائے جاتے' تنگ ظرفی اور پست ھمتی کی بہتات ھوتی ھے' زمین سخن میں نہایت دل کش و فرحت بیز چمن آرائیاں کی ھیں - کم استطاعتی اور بے بضاعتی پر جب کہ فکر معیشت میں صبح سے شام اور شام سے صبح تک کولھو کے بیل کی طرح محنت و مشقت کرنے پر مجبور تھے - سکون قلب و آسائش دماغ کا نام و نشان نہ تھا' دن بھر کے تھکے ماندے گھر جاتے تو خرد سال بچوں کی چل پوں سے فکر سخن میں رکاوٹیں پیدا ھوتیں' لیکن اُن کی طبیعتوں کی روانی ان مشکلات کی مطلق پروا نہ کرتی - ھاتھہ پاؤں شل ھوتے تو ھوتے مگر دماغ اس وقت بھی افعال لطیفہ سے گریز نہ کرتا اور چلتے پھرتے' اُٹھتے بیٹھتے' لگے ھاتھوں ادب اُردو کی خدمت گذاری میں بدل کوشاں رھتے - چنانچہ 'پیرا' بھی دھلی کے چاندنی چوک میں صبح و شام پانی کی مشک کندھے پر رکھے پھرا کرتا - تشنہ لب راہ گیروں کو سیراب کرنا' اُن کی جود و بخشش اور فیاضی سے مستفیض ھوکر اھل و عیال کا رزق حاصل کرنا معمول تھا - بازار کے دکانداروں سے جان پہچان ھوگئی تھی - وہ لوگ

بھی بقدر ضرور خدمت لے کر سلوک کرتے اور 'پیرا' کی بسر گذر ہوتی چلی جاتی۔ طبیعت موزوں اور حافظہ تیز تھا' شعرائے نغز گفتار کے اکثر اشعار یاد تھے - چاندنی چوک کے چکر کاٹتے ہوے' شیریں و دلچسپ عنوان سے کوئی نہ کوئی غزل گنگنایا کرتا - اس مشق کا یہ نتیجہ نکلا کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوگیا - فطری لگاؤ نے رہنمائی کرکے باب سخن تک پہنچایا اور 'پیرا' کچھہ کچھہ موزوں کرنے لگا - ذوق سخن کسی کی میراث نہیں' جس کو مبدء فیاض عنایت کرے - ہو چلہ 'پیرا' بہشتی تھا' اس کو وہ صحبتیں نصیب نہ تھیں جہاں تبادلۂ خیال کرکے مضمون آفرینی کا مادہ پیدا کرسکتا' پھر بھی وہ اشعار جو از بر تھے اس کے قلب و دماغ میں مختلف مضامین کی شعاعیں ڈالتے جنھیں خاطر خواہ منظوم نہ کرسکتا - کچھہ بندش کا بھونڈا پن' کچھہ بیان کی اُلجھنیں' حسن تخئیل کے ساتھہ وہی ظلم کرتیں جو آئینے کے ساتھہ زنگار کرتا ہے - اب 'پیرا' کو ایک استاد شفیق کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا جو اس کے اشعار کو جملہ نقائص اور عیوب سے پاک کرکے اس قابل بنادے کہ ہر صحبت میں بے تکلف سنانے کے لائق ہوجائیں —

اس خدمت کے واسطے اس کی نگاہوں نے 'مجرم' دہلوی کو منتخب کیا اور ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوکر اصلاح کلام کی استدعا کی - 'مجرم' نے چند اشعار سنے اور بخیال حوصلہ افزائی' خوشی خوشی اپنے تلامذہ کے دائرے میں داخل کرلیا اور نام کی رعایت سے 'پیرا' تخلص' رکھا —

'پیرا' کے اشعار بالکل صاف صاف اور معاملات حسن و عشق کا سادہ سادہ بیان ہیں - کہتے ہیں بعض اشعار کی لطافت و نزاکت اور حسن تخئیل اچھے اچھے خوش فکر شاعروں سے ٹکر کھا جاتی تھی - مزاج میں انکسار کی صفت کمال درجہ موجود تھی - کبھی اپنی ہستی کو نہیں بھولا' کس و ناکس سے بہ لجاجت گفتگو کرتا' بات بات میں خاکساری اور عاجزی ظاہر کرتا - 'پیرا' کے اشعار تذکروں میں بہت کم نظر سے گذرے' نہ معلوم کم گو تھا یا کلام تلف ہوگیا - نمونے کے طور پر وہی اشعار لکھے

جاتے ہیں جو مختلف تذکروں کی ورق گردانی کرنے سے حاصل ہوے :-

شوق گریہ کو کہو روئیے کس پاس کہ اب
نام کو بھی نہ رہا آنکھہ میں قطرا باقی

تاکتے پھرتے تھے پہلے تو بتوں کو 'پیرا'
گھر میں بیٹھے ہوے اب یاد خدا کرتے ہیں

بھلا 'پیرا' کا دل بہلے گا کیوں کر حور و غلماں سے
اسے جنت میں بھی دلی کی گلیاں یاد آئیں گی

اِنسان نے بولنا اور لکھنا کیسے سیکھا

از

(مولوی محمد حسین صاحب ایم - اے ، بی - ای - ٹی
صدر مدرس مدرسۂ فوقانیۂ عثمانیہ بیدر)

عامیانہ خیال زبان کی نسبت عام خیال یہ ہے کہ جس وقت انسان کتم عدم سے منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا ، معاً اس کا نطق بھی آ موجود ہوا ۔ جس طرح کھانا ، پینا ، سونا ، جاگنا ، چلنا ، پھرنا وغیرہ لوازم حیوانی ہیں جو بغیر کسی زحمت و تکلف کے خود بخود قدرتی طور پر عمل میں آتے ہیں ٹھیک اسی طرح نطق و گویائی بھی انسان کا فطری خاصہ ہے جس کی تخلیق انسانی دماغ سوزی و جگر کاری کا نتیجہ نہیں - زبان قدرت کی ودایعت کردہ نعمت ہے جس میں انسان کے صنع و اختراع کو کچھ بھی دخل نہیں ہے - الغرض عام خیال کے مطابق زبان نے ابتداے تمدن ہی سے انسان کا ساتھ دیا ہے ، مذہبی معتقدات نے اس خیال کو اور تقویت پہنچائی ہے - چنانچہ اہل ہنود برہما کو مبداء آفرینش جانتے ہیں- ان کے اعتقاد کے مطابق ' برہما ' نے اپنے جسم خاص سے ' منو ' اور ' شتروپا ' کو پیدا کیا ، جن سے توالد اور تناسل کا سلسلہ جاری ہوا - خود ' برہما ' نے اس اولین انسانی جوڑے کو سنسکرت زبان کی تعلیم دی -

اور ' منو ' اور ' شترو پا ' کے ذریات اسی زبان میں متکلم ہوے - گویا ابتداے آفرینش ہی سے انسان ایک مکمل زبان سنسکرت کے استعمال پر قادر تھا - مجوسیوں کے اعتقاد کے مطابق دنیا میں کئی دور گذر چکے ہیں، ہر دور کے اختتام پر ایک مرد اور ایک عورت باقی رہ جاتے ہیں، جن کے توالد و تناسل سے ایک نئے دور کا آغاز ہو تا ہے - چنانچہ موجودہ دور ' مہ آباد ' سے شروع ہو تا ہے - جب ' مہ آباد ' کی اولاد بڑھی تو ان کی ہدایت کے لئے ' مہ آباد ' پر ایک سماوی کتاب (اوستا) ملہم ہوئی - چونکہ آسمانی کتاب کا خلق کی زبان میں نازل ہونا ضرور ہے تاکہ لوگ اوامر و نواہی سے واقفیت حاصل کر کے ان پر عمل کریں، لہذا مجوسیوں کے اعتقاد کے مطابق دنیا کی پہلی زبان د ساتیری یعنی اوستا کی زبان تھی، جس سے بہ امتداد زمانہ مختلف زبانیں مشتق ہو تی گئیں - وحدت لسان اور اس کی مابعد تفریق و اختلاف کے متعلق یہود و نصاریٰ کا اعتقاد بہ لحاظ غربت و ندرت اپنی نظیر آپ ہے - وہ حضرت آدم علیہ السلام کو افراد انسانی کے سلسلے کا مبدء قرار دیتے ہیں اور خیال کر تے ہیں کہ ان کی زبان عبرانی تھی، لیکن بعضوں کے نزدیک ان کی زبان آرامی تھی - بہر حال تمام مشاہیر علماے یہود و نصاریٰ اس امر پر متفق الراے ہیں کہ حضرت ابوالبشر کی زبان سامی الاصل زبانوں ہی میں سے کوئی نہ کوئی زبان تھی —

شہر ' بابل ' کے آباد ہو نے تک تمام سکان زمین اسی ایک زبان میں کلام کیا کر تے تھے - ' توریت ' کے گیارھویں باب اور پانچویں فصل میں مرقوم ہے کہ پہلے تمام اہل زمین کی زبان ایک ہی تھی - جس وقت اُنھوں نے مشرق کا سفر اختیار کیا تو اتفاقاً ' شنعار ' کی زمین میں دریاے فرات کے پاس ایک کف دست صحرا نظر آیا - یہ لوگ وہاں ٹھیرے اور آپس میں صلاح کی کہ آؤ اینٹیں بنا کر پژاوے میں پکائیں اور ان سے اپنے لئے شہر اور برج بنائیں، جس کا سر رفعت اور بلندی کے لحاظ سے آسمان سے ٹکر کھائے اور دنیا

میں ہماری نشانی اور ناموری باقی رہے - خود خداوند قدوس نے اس شہر اور برج کے ملاحظے کے لئے نزول فرمایا اور دیکھا کہ یہ تمام ہم زبان آدمی متفق ہو کر اس کام کو اختتام تک پہنچانا چاہتے ہیں اور اس ارادے سے کسی طرح باز نہیں آتے - پس خداوند تعالیٰ نے اُنھیں اس فرعونیت سے روکنے کے لئے ان کی زبان میں خلل ڈال دیا ' تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھیں- اِس طرح شہر اور برج کی تعمیر سے یہ لوگ باز رکھے گئے - وہ لوگ مختلف بولیاں بولتے ہوے متفرق اقطاع اور ممالک میں منتشر ہو گئے - یہ تو یہود اور نصاریٰ کے اعتقادات ہیں - مسلمان ملاؤں کے خیالات بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں ہیں - ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام جب جنت میں تھے تو اُن کی زبان عربی تھی - لیکن جب وہ خطاے نا فرمانی کی پاداش میں خلد بریں سے نکالے گئے تو حضرت جبرئیل و میکائیل نے اُن کے سر سے تاج اُتارا ' کمر سے پیٹی کھولی اور عربی بولنے کی قدرت سلب کر کے سریانی بولی ان کی زبان پر چڑھادی - چنانچہ ان کی اولاد کی زبان سریانی ہی تھی - ان ملاؤں کا یہ بھی خیال ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تو وہ پھر عربی زبان میں کلام کرنے پر قادر ہو گئے۔ یہ تمام مذہبی داستانیں اس واقعے کی مؤیّد ہیں کہ ابتداے آفرینش ہی سے انسان کسی نہ کسی مرتب و مکمل زبان کے بولنے پر قادر تھا —

لیکن یہ اختلافی مذہبی مفروضات عقل سلیم کو ضرور کھٹکتے ہیں- لہذا مناسب ہے کہ زبان کی ابتدا دریافت کرنے کے لئے ہم تحقیقات علمیہ کی طرف رجوع کریں - کسی بات کے دریافت کرنے ' کسی امر کا پتا لگانے ' کسی واقعے کی تحقیق کرنے کے دو پہلو ہیں ؛ ایک روایتی یا تاریخی ' جسے منقول کہتے ہیں دوسرا عقلی یا فطری جسے معقول کہتے ہیں - تاریخ زیادہ سے زیادہ صرف چار پانچ ہزار سال کے واقعات پر روشنی ڈال سکتی ہے ' لیکن زبان اور لسان کی

تحقیق میں جس کا دامن قدامت کے لحاظ سے خود آغاز آفرینش کے ساتھہ وابستہ ہے تاریخ ہماری کچھہ رہبری نہیں کرسکتی - اب رہیں مذہبی روایات سو وہ ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں - ہر مذہب کا پیرو اپنی گاتا ہے جس زبان میں اُس کی مقدس کتاب نازل ہوی ہے اُسی کو وہ اپنی مذہبی عصبیت کے زیراثر انسان کی اولین زبان ٹھیراتا ہے - علاوہ بریں مذہبی روایات بالعموم صرف شایستہ اور مہذب دور کے آغاز و ترقی کا ذکر کرتی ہیں اور اُسی دور اور اُس کے ما بعد کے لوگوں پر لفظ انسان کا اطلاق کرتی ہیں - دور متمدن کے قبل دور بربریت کے جنگلی انسان مذہبی روایات یا صحیفات میں دوسرے دوسرے ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں - مثلاً اہل ہنود کا خیال ہے کہ سنسکرت دیوتاؤں کی زبان تھی - لیکن دیوتاؤں کے قبل آریاورت کا خطہ راکشسوں (غیر مہذب انسانوں) سے آباد تھا - راماین میں صرف آریاؤں کو انسان یا دیوتا کے نام سے موسوم کیا ہے ' لیکن نا مہذب غیر آریائی اقوام کو راکشس ملیچھہ' ریچھہ ' بندر ' ناگ وغیرہ تو ہین آمیز ناموں سے یاد کیا ہے اور اُن کی زبانیں بھی دوسری بتائی گئی ہیں - مجوسیوں کے خیال کے مطابق موجودہ دور کے انسانوں کی اول زبان اوستائی تھی- لیکن اس کے قبل بھی کائنات پر کئی دور گذرچکے ہیں ممکن ہے کہ ان ماقبل دوروں میں ' اوستائی ' نہیں بلکہ دوسری زبانیں بولی جاتی ہوں - مسلمان ملاؤں کا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم علیہ‌السلام کے قبل دنیا میں اجنہ بستے تھے - سر سید علیہ‌الرحمۃ نے بڑے شدو مد سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اجنہ سے مراد بادیہ نشیں ' صحرائی اور بدوی انسان تھے - حضرت ابوالبشر کی زبان توخیر ' سریانی ' تھی ' لیکن اجنہ کی بھی آخر کوئی زبان ضرور ہوگی - الغرض ہمیں صرف یہ پتہ لگانا مقصود نہیں ہے کہ مہذب اور شایستہ انسان کے مورث اعلیٰ کی زبان کیا تھی ' خواہ وہ مورث سوئمبھو منو ہوں یا مہ‌آباد یا آدم علیہ‌السلام - اصل تحقیق طلب امر یہ ہے کہ دور تمدن کے قبل دور بربریت کے ابتدائی انسان قوت گویائی سے کہاں تک بہرہ یاب تھے - ظاہر ہے کہ ملفوظات

اس میدان تحقیق میں لاچار محض ہیں لہذا ہمیں معقولات کی استمداد سے واقعات کی اس طرح چھان بین کرنی چاہیے کہ عقل سلیم اُسے قرین قیاس سمجھے —

موجودہ تحقیق

موجودہ تحقیق کے روسے یہ خیال کہ گویائی انسان کی سرشت میں داخل ہے اور ابتدائے آفرینش ہی سے انسان ایک مرتب، مکمل اور باقاعدہ زبان بولنے پر قادر تھا بالکل بے بنیاد اور کاواک ثابت ہوا ہے۔ فی الحقیقت زبان کوئی فطری یا وہبی چیز نہیں ہے بلکہ تحصیل و اکتساب کا نتیجہ ہے - چنانچہ ایک تحقیق دوست یونانی بادشاہ نے چند نومولود بچوں کو آبادی سے دور ایک بھونرے میں پرورش دلائی تھی اور اہتمام کیا تھا کہ انائیں صرف دودھ پلائیں اور خاموش رہیں تاکہ بچوں کے کان انسانی آواز سے آشنا نہ ہونے پائیں۔ جب یہ بچے بڑے ہوے تو سوائے چیں پیں کے اور کوئی کلمہ زبان سے ادا نہیں کرسکتے تھے - اسی طرح ہندوستان میں خاندان مغلیہ کے سر آمد بادشاہ ' جلال الدین محمد اکبر ' نے انسان کی فطری زبان دریافت کرنے کے شوق میں کئی نوزائیدہ بچوں کو آبادی سے باہر گرنگی اور بہری کھلائیوں کے زیر نگرانی پرورش دلائی تھی اور یہ بچے بھی بڑے ہونے پر یونانی تہ خانوں میں پلے ہوے بچوں کی طرح گویائی سے بے بہرہ پائے گئے - وہ صرف وہی آوازیں منہ سے نکالتے تھے جن کو اُنھوں نے جنگل کی چڑیوں سے سنی تھیں - فی زمانہ اخباروں میں کئی بار اس قسم کی خبریں شایع ہوئی ہیں کہ بعض شکاریوں کو جنگل میں انسانی بچے دستیاب ہوے ہیں جن کو بھیڑیوں نے اپنے بھٹوں میں پالا تھا - ان بچوں میں درندگی کے تمام خصائل موجود تھے - وہ چاروں ہاتھ پانوں پر چلتے اور بھاگتے پھرتے تھے اور انسانی بولی سے یکسر محروم تھے ' البتہ بھیڑیوں ہی کی طرح چلاتے اور غراتے ضرور تھے - انسان کی فطری زبان کے تلاش کرنے والوں کو ان امور پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اگر کسی بچے کا پانو کچل جائے تو صرف ' قیں ' کی آواز اُس کے منہ سے نکلتی ہے - اگر کسی کے زور سے چٹکی لی جائے تو سوائے ' سی ' کے اور اگر کسی کو یکایک

ذرا دیکھئے تو بجز 'هو' کے اور اگر کسی کو مبتلاے مصیبت دیکھہ کر ترس آے تو صرف 'تہ تہ' یا 'چہ چہ' کے اور کچھہ زبان سے ادا نہیں ہوتا - ان موقعوں پر چونکہ انسان کو غور کرنے اور پھر سوچ کر با معنی الفاظ نکالنے کی فرصت یا مہلت نہیں ملی اس لئے اس کے منہ سے وهی آوازیں نکلیں جو فطری کہلانے کی مستحق هیں - توتا هزار " نبی جی بھیجو " یا "سیتا رام " جپا کرے لیکن جب بلی تیٹوا آن دباتی هے تو اُسے بجز اپنی فطری آواز "تیں تیں " کے اور کچھہ نہیں سوجھتا - یہی حال انسان کا هے - یکایک خوف ' استعجاب ' مصیبت یا خوشی کے موقعوں پر اس کی زبان سے اضطراراً چند مہمل اور بے معنی آوازیں نکلتی هیں ' یہی انسان کی فطری بولی هے - مندرجۂ بالا تمام واقعات پر غور کرنے سے هم اس نتیجے پر پہنچتے هیں کہ گویائی انسان کا فطری خاصہ نہیں هے بلکہ کد و کاوش سے حاصل هوئی هے —

آج کل علمی دنیا میں نظریۂ ارتقا کا زور شور هے - اسی نظریے کی روشنی میں هر شے کے بدو و آغاز کا سراغ لگایا جاتا هے - حقیقت یہ هے کہ ارتقا کا مسئلہ معرکۃ الآرا هونے کے علاوہ اس قدر عام اور همہ گیر هے کہ کوئی علم' کوئی فن' کوئی هنر بلکہ کوئی شے اس کے اثر و نفوذ سے خالی نہیں- خود انسان کی آفرینش اور تمدن کی عہد بعہد ترقی کا مطالعہ اسی نظریے کی روشنی میں کیا جاتا هے - اس نظریے کی رو سے انسان کتم عدم سے یکایک معرض وجود میں نہیں آیا هے اور نہ وہ کسی دیوی یا دیوتا کے جسم اطہر سے پیدا هوا هے ' بلکہ اس نے جسم حیوانی سے رفتہ رفتہ ترقی کرکے جامۂ انسانی زیب تن کیا هے —

یہ امر مسلم هے کہ تمدن کے ابتدائی دور میں انسان کی حالت صحرائی جانوروں کی سی تھی' گو کہ وہ اُس حالت میں بھی اور حیوانات سے اشرف ضرور تھا - اب همیں اس کا کھوج لگانا هے کہ حیوانات میں بولنے اور اپنی خواهشات و احساسات کے ظاهر کرنے کی کہاں تک صلاحیت هے - اس کے بعد هم اندازہ لگاسکیں گے کہ ابتدائی دور کے انسان کی گویائی کی کیا حالت تھی - علاوہ بریں

اس امر پر بھی تمام حکما کا اتفاق ہے کہ ایک فرد بشر کو طفولیت سے لے کر پختہ عمر ہونے تک جسمانی، ذہنی اور اخلاقی ارتقا کے جتنے مدارج طے کرنے پڑتے ہیں اتنے ہی منازل سے نسل انسانی کو دور توحش سے لے کر دور تمدن تک پہونچنے میں گذرنا پڑتا ہے - گویا ابتدائی انسان بمنزلہ طفل شیر خوار کے تھا، اس کی ضروریات خواہشات اور احساسات بھی بچوں کے سے تھے - لہذا بچوں میں رو کر، چلاکر، ہنس کر یا دیگر ذرایع سے اپنی خواہشات اور احساسات کے اظہار کی جتنی صلاحیت ہوگی اتنی ہی یا اس سے کسی قدر بڑھکر ابتدائی انسان کی بھی ہوگی —

ابتدائی انسان کی قوت گویائی

اب ہمیں غور کرنا ہے کہ آیا جانور بول سکتے ہیں یا نہیں ؟ بولی کا اطلاق اس کے وسیع معنی میں ان تمام وسائل پر ہوسکتا ہے جن کے ذریعے دماغی کیفیت اور مافی‌الضمیر اوروں پر ظاہر کیا جاسکے خواہ یہ وسائل آواز کی شکل اختیار کریں یا اشارات و کنایات کی - پہلے لوگوں کا خیال تھا کہ صرف انسان ہی بول سکتا ہے اور تمام جانور گویائی سے محروم ہیں - گویا بولنا ہی انسان اور حیوان کے درمیان مابه‌الامتیاز تھا - لیکن علماے یورپ نے دریافت کیا ہے کہ جانور بھی بول سکتے ہیں ، اگرچہ ان کا بولنا وسعت و حلاوت کے لحاظ سے انسانی بولی کا عشر عشیر بھی نہیں ہے - بقدر بہت قسم کی آوازیں بول کر ایک دوسرے پر اپنی خواہشات، جذبات، احساسات اور ضروریات کا اظہار کرتے ہیں - کتے یا بلی کو دیکھو یہ جانور بھوک کے وقت، خوف کے وقت، غصے کے وقت، آپس میں لڑتے وقت، اپنے بچوں کو پیار کرتے وقت مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں - بایں ہمہ جانوروں میں مرکب یا مسلسل خیالات کے اظہار کا مادہ نہیں ہوتا - وہ انسان کی طرح کسی اصول یا مسئلے کے بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں - مثلاً وہ ایک دوسرے سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ "زمین گول ہے" یا "ایمانداری بہترین چیز ہے" - جانور محض بھوک، پیاس، خوف، خوشی، درد،

تکلیف، غصے، پیار یا اسی قماش کے دیگر جذبات، احساسات یا ضروریات کا خاص خاص آوازوں سے اظہار کرتے ہیں - اس قسم کا بولنا جس سے ضروریات و جذبات کا اظہار ہوسکے کتے، بلی، بلھڑ یا اور اعلیٰ قسم کے حیوانات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ کیڑے مکوڑے وغیرہ جیسی ادنیٰ اور پیش پا اُفتادہ مخلوق بھی اپنے خاص انداز سے باہم متکلم ہوتی ہے - شہد کی مکھیاں، چیونٹیاں، بھڑ وغیرہ حشرات جو جماعت اور جھنڈ میں رہتے ہیں اچھی طرح اپنا مطلب اور عندیہ ایک دوسرے پر ظاہر کرتے ہیں - اگر وہ اپنی خواہشات و ضروریات کا اظہار نہ کرسکتے تو اُن کی جماعت کا شیرازہ بکھر جاتا - مافی الضمیر کے اظہار کی صلاحیت جماعتی زندگی کا لازمہ ہے - اگر یہ مفقود ہو تو جماعتی زندگی کا قیام غیر ممکن ہو جاے - اکثر کیڑوں کا طریقۂ تکلم عجیب و غریب ہوتا ہے - ان کیڑوں کی لمبی لمبی مونچھیں ہوتی ہیں جو تعداد میں دو یا تین سے زیادہ نہیں ہوتیں- اصطلاح میں اِنہیں ملمس کہتے ہیں۔ دو کیڑے اپنے ملمسوں (مونچھوں) کو باہم ملا کر ایک دوسرے کا عندیہ معلوم کر لیتے ہیں —

گفتگو سیکھنے سے بہت قبل انسان کے بچے بھی مختلف آوازوں سے اپنی خواہشات و ضروریات کا اظہار کرتے ہیں - بچہ بھوک کے وقت روتا ہے، ماں کو دیکھہ کر ہنستا ہے، اچھی اور خوشنما چیزوں کو لینے کے لئے ہاتھہ بڑھاتا اور چلاتا ہے - الغرض وہ بھوک، پیاس، خوشی، تکلیف وغیرہ کو مختلف آوازوں سے ظاہر کرتا ہے - ہم ایک شیر خوار بچے کے چہرے مہرے سے اُس کی خواہشات و جذبات کا پتا لگاسکتے ہیں - بچے کا رونا چلانا اُس کے آئندہ تکلم کا پیش خیمہ ہے رونا چلانا اور بولنا دونوں ہم عنصر ہیں، یعنی وہ ایک ہی چیز سے بنے ہیں جسے ہم آواز کہتے ہیں - دونوں سے ایک ہی قسم کے اغراض بھی پورے ہوتے ہیں - مختلف قسم کی چیخ پکار مختلف معنی رکھتی ہے - گویا بچوں کا رونا، چلانا، چیخنا، پکارنا وغیرہ زبان کا نقش اول ہے —

ایک قابل غور سوال یہ بھی ہے کہ آخر انسان یا حیوان آواز نکالنے پر قادر کیسے ہوئے؟ ان کو بولنا کس نے سکھایا؟ مسئلہ نہایت صاف اور سہل ہے۔ ہر شخص پہلی ہی نظر میں معلوم کرسکتا ہے کہ انسان کی گویائی کا پہلا اُستاد سانس ہے - سانس کیا ہے؟ وہ ہوا ہے جو پھیپھڑوں کی حرکت سے اندرجاتی اور اندر سے باہر آتی ہے اور کانوں کے ذریعے سے محسوس ہوتی ہے - یاد رکھنا چاہئیے کہ انسان کا گلا موسیقار یا قنقس پرندے سے کم نہیں ہے - جس طرح انسان تمام حیوانات کے افعال و حرکات کی قدرت رکھتا ہے اُسی طرح اُس کا گلا بھی تمام جانوروں کے گلوں کا کام کرسکتا ہے - قدرت نے اول ہی سے انسان میں ہر ایک آواز کی صلاحیت پیدا کردی ہے اور اس کا اظہار زیادہ تر سانس کی مدد سے ہوتا ہے - ایک حکیم کا قول ہے کہ انسان کا گلا اگر اچھا ہو تو آلات موسیقی سے بہتر ہے - ابتدائی انسان میں بھی آلہ تنفس تو اپنی مکمل حالت میں موجود تھا کیونکہ بقاے حیات کے لئے وہ لازمی شے ہے - لیکن دیگر آلات صوت پورے نمو یافتہ نہ تھے - زبان کی حرکت منہ کی بناوٹ ، ہونٹوں کی ہیئت ، حلق کی ساخت وغیرہ میں کچھ ایسا بھونڈ تھا کہ آج کل کی طرح انسان بولنے اور بات چیت کرنے پر قادر نہ تھا - ان تمام اُمور سے واضح ہوتا ہے کہ ابتداے تمدن میں انسان کے پاس آلات تنفس اور آلات صوت جو قدرت کی و دیعت کردہ نعمتیں ہیں موجود تو ضرور تھے لیکن تربیت اور مشق کی کمی کے باعث پوری طرح کام نہ دیتے تھے - تمدن کے لحاظ سے اُس وقت انسان ارتقا کی ابتدائی منزل میں تھا اور اس کی حالت جانوروں یا شیر خوار بچوں سے ایک ہی دو قدم آگے تھی - لہذا وہ کسی مرتب اور با قاعدہ زبان کے استعمال پر قادر نہ تھا بلکہ حیوانات یا شیر خوار بچوں کی طرح چند بے معنی اور مہمل اصوات کے ذریعے صرف اپنی ضروریات ، خواہشات ، جذبات اور احساسات کا اظہار کرسکتا تھا —

عہد رموزی

لیکن انسان دوسرے حیوانوں کی طرح محض جذبات ہی کے اظہار پر قادر نہ تھا بلکہ اس کے علاوہ وہ شروع ہی سے دوسروں پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی بھی قدرت رکھتا تھا جس سے دیگر حیوانات قاصر تھے - غرض اظہار خیالات کی صلاحیت ہی انسان اور دیگر حیوانات کے درمیان مابہ‌الامتیاز تھی - قدرت نے ابتدائے آفرینش ہی سے انسان کو عقل و تمیز، حافظہ و متخیلہ، ادراک و تصور کی نعمتیں عطا کر کے اشرف‌المخلوقات کا تاج اُس کے سر پر رکھا تھا - لیکن حیوانات ہمیشہ سے اظہار خیالات سے قاصر ہیں - انسان مدنی‌الطبع‌واقع ہوا ہے، وہ جماعت سے الگ رہ کر انسانی زندگی بسر نہیں کرسکتا - ارسطو کا قول ہے کہ جو شخص ہیئت اجتماعی زندگی کے دائرے سے باہر رہ کر تنہائی و عزلت کی زندگی گذارے وہ یا تو فرشتہ ہے یا حیوان مطلق، وہ ہرگز انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے - جماعت میں رہنے سے لا محالہ تبادلۂ خیالات اور اظہار مطلب کی ضرورت پیش آئی ہوگی تاکہ ابتدائی زندگی کی ضروریات میں ایک انسان کو دوسرے سے مدد ملتی اور سب کے کام بسہولت انجام پاتے - اس مقصد کے لئے اول اول صرف اشارات و علامات، رموز و کنایات مقرر ہوے جن سے ادائے مطلب کا کام ناقص طور پر انجام پاتا تھا، یعنی جو لوگ نظر کے سامنے ہوتے اور ان سے کچھ کہنا ہوتا تو طریقہ یہ تھا کہ ٹوٹی پھوٹی چند مہمل اور بے معنی آوازوں کے ساتھ جسم کی حرکت، اعضا و جوارح کی جنبش، دست و ابرو کے اشارے وغیرہ سے خیالات ظاہر اور مطلب ادا کیا جاتا - لیکن جب نسل بڑھی اور ایک ہی گروہ کے افراد دور دراز اقطاع میں جا بسے تو نظر سے دور اور غائب اعزہ اور احباب پر خیالات کا اظہار مشکل ہو گیا لہذا ان کے پاس کوئی مادی شے بھیج کر ادائے مطلب کا کام انجام پاتا تھا اور اس طرح سے خیالات کو دوسروں پر ظاہر کرنے کی رسم متمدن زمانے میں بھی قایم رہی - کتنے اُمور ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی ضرورت اور ان کا فائدہ مفقود ہو جانے پر بھی وہ بطور رسم و رواج

عرصہ دراز تک قایم رہتے ھیں - مثلاً شادی بیاہ کی رسموں میں اب بھی بعض باتیں ایسی پائی جاتی ھیں جن میں قدیم طریقوں کی جھلک پائی جاتی ھے - اسی طرح متمدن دنیا میں پڑھنے لکھنے کا رواج عام ھوجانے پر بھی اشیاے مادی کی ترسیل کے ذریعے نامہ و پیام کا کام لیا جاتا رہا ھے جس سے ' عہد رموزی ' کی یاد ھمیشہ تازہ ھوتی رھی ھے - مثلاً سکندرنامہ میں مرقوم ھے کہ ' دارا ' نے سکندر رومی کے پاس رائی کے تھیلے بھیجے تھے لیکن سکندر نے شاھی کبوتر خانے کے کبوتروں کو چھڑوادیا جنھوں نے رائی کا ایک ایک دانہ چگ لیا - ' نظامی ' گنجوی مصنف " سکندر نامہ " نے اس واقعے کی یوں تعبیر کی ھے کہ دارا نے سکندر کو جتانا چاھا تھا کہ میرے پاس رائی کی طرح بے شمار فوج ھے اس لئے تم میرا مقابلہ نہیں کرسکتے - سکندر نے اشارتاً یہ جواب دیا کہ اگرچہ میری فوج تعداد میں کم ھے لیکن ایسی تہوّر شعار اور بہادر ھے کہ تمھاری تمام بز دل سپاہ کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیگی - دوسری جگہ بھی مولانا نظامی فرماتے ھیں کہ دارا نے سکندر کے پاس گیند اور چوگاں بھیج کر یہ ظاھر کرنا چاھا تھا کہ تم ابھی طفل مکتب ھو ' ملک‌گیری اور کشور کشائی کے خیال خام سے باز آو اور گیند بلے سے کھیلا کرو - لیکن سکندر نے اُسے فال نیک تصور کیا اور کہا کہ گیند بمنزلہ کرۂ ارض کے ھے میں اپنے چوگاں یعنے اسلحہ سے تمام عالم کو مسخر کروں گا - اسی طرح پورس نے سکندر کو تلوار پیش کر کے عاجزی اور شکست کا اظہار کیا - آج بھی تلوار پیش کرنا، علم کو سر نگوں کرنا اطاعت اور مسکنت کی علامت ھے - جلال‌الدین محمد اکبر کے در باری بذلہ سنج و ظریف ملا دو پیازے کے سامنے جب ایرانی مولوی خم ٹھونک کر مقابلے کے لیے آیا تو دونوں میں اشارات و کنایات کے ذریعے بحث مباحثے کا سلسلہ اس طرح چھڑا کہ پہلے ایرانی مولوی نے ایک اُنگلی دکھائی تو ملا دوپیازے نے جواب میں دو اُنگلیاں دکھائیں - پھر اس نے تین‌تو اُس نے چار، اِس نے پانچ تو اُس نے گھونسا اِس‌نے انڈا تو اُس‌نے پیاز دکھائی اور مباحثہ ختم ھو گیااور اِس طرح

ملا کی جیت ہوئی - جب اُس کی تشریح چاہی گئی تو ایرانی مولوی نے نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ اُس کی اِس طرح توضیح کی کہ میں نے ایک اُنگلی سے باری تعالیٰ کی وحدت کا اظہار کیا تو ملا نے دو اُنگلیاں دکھا کر کہا کہ خدا کے ساتھ رسول کا ہونا لازمی ہے - میں نے تین اُنگلیوں سے رسول ' بنت رسول و خویش رسول کی طرف اشارہ کیا تو ملا نے اصحاب اربع کی یاد دلائی - میں نے پانچ اُنگلیوں سے پنجتن پاک کی طرف اشارہ کیا تو ملا نے گھونسا دکھا کر کہا کہ خدا سب پر غالب ہے - میں نے انڈا دکھا کر ظاہر کیا کہ زمین گول ہے تو ملا نے پیاز نکال کر اشارہ کیا کہ نہیں بلکہ زمین پیاز کی طرح تہہ بہ تہہ ہے اور اس کے سات طبق ہیں - لیکن جب اسی واقعے کی تشریح کے لیے بذلہ سنج ملاسے فرمایش کی گئی تو اُس نے ظرافت آمیز پیرائے میں اُس کی اس طرح صراحت کی کہ ایرانی مولوی نے ایک اُنگلی دکھا کر کہا کہ تمہاری آنکھ پھوڑدوں گا میں نے جواب میں دو اُنگلیاں دکھا کر اشارہ کیا کہ تمہاری دونوں آنکھیں اندھی کردوں گا - تب اُس نے تین اُنگلیوں سے گزند پہنچانے کا اشارہ کیا تو میں نے چاروں شانے چت گرانے کی دھمکی دی- اُس نے تھپڑ مارنے کو کہا تو میں نے جواب میں گھونسا مارنے کو کہا - اُس نے انڈا دکھایا تو میں نے اشارتاً کہا کہ اُسے پیاز کے ساتھ تل کر کھاجاونگا- اگرچہ یہ ایک مسخرے پن کا قصہ ہے' لیکن ایک صاحب بصیرت اِس سے یہ نکتہ اخذ کرتا ہے کہ جب انسان گویائی کی پوری قوت نہیں رکھتا تھا تو اسی طرح اشاروں سے اداے مطلب کا کام انجام دیتا ہوگا —

سنسکرت زبان کی ایک کہانیوں کی کتاب 'بیتال پچیسی' میں حرکات جسمانی اور اشیاے مادی کے ذریعے اظہار خیال کی ایک عمدہ مثال ملتی ہے - کاشی کے شہزادے ' بجرا مکت' کی آنکھیں مہادیو کے مندر میں ایک نوخیز حسین و جمیل شہزادی سے دوچار ہوئیں اور عشق کی برچھی اس کے سینے کے پار ہوئی - ادھرشہزادی کوبھی پریم کےدیوتا 'کام دیو' نے مسحورکردیا - چلتےوقت شہزادی کو شرم و حیانےاجنبی شہزادے

کے ساتھہ ہم کلام ہونے سے باز رکھا لیکن جذبۂ عشق نے اشارات اور کنایات کے ذریعے اظہار حال پر اُسے مجبور کردیا - چنانچہ نزدیک کے تالاب سے شہزادی نے ایک کنول کا پھول لیا' اپنے کان پر رکھا' پھر دانت سے کاٹا' اس کے بعد پانو سے کچلا اور آخر میں اُس پامال پھول کو اُٹھاکر سینے سے لگایا - جب وہ پری پیکر شہزادے کی نظروں سے غائب ہوگئی تو ہجراں نصیب عاشق ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا - ہزار چاہا کہ دل پر قابو رکھے لیکن اس کی بے قراری اور بے چینی بڑھتی گئی - بالآخر اس نے سارا ماجرا اپنے قلبی دوست وزیر زادے سے بیان کیا - وزیر زادے نے اسے تسلی دی اور شہزادی کے رموز و کنایہ کی یوں تعبیر کی کہ کان پر پھول رکھہ کر شہزادی نے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ کرناٹک کی رہنے والی ہے' کیونکہ سنسکرت میں کان کو "کرن" کہتے ہیں - پھول کو دانت سے کاٹنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ راجہ دنتاوت کی بیٹی ہے کیونکہ دانت کو سنسکرت میں "دنتا" کہتے ہیں - پانو سے پھول کُچل کر اس نے یہ ظاہر کیا کہ اس کا نام پدماوتی ہے کیونکہ "پد" پانو یا قدم کو کہتے ہیں - پھول کو سینے سے لگا کر اس نے یہ ظاہر کیا کہ اس کا دل بھی پیکان عشق سے گھائل ہوگیا ہے - آج کل بھی ریل گاڑی کا محافظ سبز یا سرخ جھنڈی دکھاکر انجن چلانے والے کو گاڑی چلانے یا ٹھیرانے کی ہدایت دیتا ہے —

مندرجۂ بالا واقعات سے ایک اہل نظر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ تمدن کے ابتدائی دور میں جب انسان زبان کی نعمت سے محروم تھا تو وہ محض اشارات و علامات کے ذریعے اپنا مافی‌الضمیر دوسروں پر ظاہر کرتا ہوگا - علمائے لسانیات اس دور کو عہد رموزی کے نام سے موسوم کرتے ہیں - چونکہ دور بربریت کے ابتدائی عہد میں ضروریات زندگی محض سادہ اور بالکل تقاضائے فطرت کے مطابق ہوتی تھیں' آبادیاں نہایت قلیل تھیں' پیٹ بھرنے کے لئے بناس پتی' جڑیں' پھل پھلاری یا شکار کا گوشت' تن ڈھانکنے کے لئے چوڑی پتیاں یا جانوروں کی کھالیں' شدائد موسمی سے محفوظ رہنے کے لئے پہاڑ کے غار یا درختوں کے کھوکھلے تنے کافی تھے'

اس لیے عرصۂ دراز تک رموزی زبان یعنی چند مہمل آوازوں کے ساتھ ساتھ جسم کی حرکت، دست و ابرو کے اشاروں یا اشیاے مادی کے ذریعے ان کے تمام کام حسب مرضی نکالتے رہے - خلاصہ یہ کہ اشارات و علامات ہی وہ قدیم آلے تھے جن کے ذریعے تبادلۂ خیالات، اظہار مافی الضمیر اور اداے مطلب کا کام بہت دنوں تک انجام پاتا رہا

عہد صوتی

لیکن رفتہ رفتہ آبادیاں بڑھنے لگیں، انسان کی ضروریات میں وسعت اور اضافہ ہونے لگا، معاملات گنجلک اور معاشرت پیچیدہ ہوتی گئی، اب خارجی دنیا اور خود انسانی زندگی کے متعلق معلومات کا ذخیرہ اس قدر بڑھ گیا کہ اشارات و علامات اداے مطلب کے لئے بالکل ناکافی ثابت ہونے لگے - علاوہ بریں اشیاے مادی کے ذریعے اظہار خیال میں غلط فہمیاں بھی ہونے لگیں- اوپر دکھایا جاچکا ہے کہ راعی کے تھیلے یا گیند اور چوگان بھیجنے سے دارا کا منشا کچھ تھا لیکن سکندر نے ان کے معنی کچھ اور ہی لیے - ملا دو پیازہ اور ایرانی مولوی کے درمیان بذریعۂ رموز و کنایات جو بحث مباحثہ ہوا اس کی تعبیر دونوں نے بالکل جدا جدا بیان کی- اسی طرح عہد "رموزی" میں بھی غلط فہمیاں پیدا ہوجایا کرتی تھیں، جن کی وجہ سے معاملات میں خلل واقع ہوتا تھا لہذا اظہار خیالات کے لئے دیگر وسائل کی دریافت کی جانب انسان کا ذہن رجوع ہوا —

واضح رہے کہ قواے ذہنیہ کے لحاظ سے ہر زمانے میں، یہاں تک کہ دور بربریت کے ابتدائی دور میں بھی انسان کو دیگر حیوانات پر برتری حاصل تھی - قواے ذہنیہ کا مستقر دماغ ہے، جو کاسۂ سر میں واقع ہے - یہ ایک پیچیدہ عضو ہے، جو متعدد حصوں پر منقسم ہے، ہر حصے کے لئے ایک خاص کام مقرر ہے - مثلاً کوئی حصہ بصارت سے متعلق ہے تو کوئی سماعت سے، کوئی تخیل سے تو کوئی حافظے سے، الغرض تمام قواے ذہنیہ کے لئے کوئی نہ کوئی حصہ مخصوص ہے- کسی بیماری یا چوٹ

یا کسی اور وجہ سے اگر دماغ کے کسی حصے کو گزند پہنچے تو جو ذہنی قوت اس حصے سے متعلق ہوگی وہ معطل ہوجائے گی۔ مغز یا دماغ کا وزن اور بلندیاں، جنھیں اصطلاح میں "تلافیف" کہتے ہیں، جتنی زیادہ ہوں گی، قوائے ذہنیہ اتنے ہی زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہوں گے۔ انسان کا دماغ اس کے مساوی جسم کے تمام حیوانات سے زیادہ بڑا اور وزنی ہوتا ہے۔ قوی الجثہ اور دیو ہیکل جانوروں کے دماغ کا وزن ممکن ہے کہ انسانی دماغ سے زیادہ ہو، تاہم بہ اعتبار عقل و فہم، فراست و ذکاوت انسان کا درجہ سب سے بلند ہے۔ کیونکہ جانوروں کا دماغ مسطح اور ہموار ہوتا ہے لیکن انسان کے دماغ میں بے شمار نشیب و فراز یعنی "تلافیف" پائے جاتے ہیں۔ گویا تلافیف ہی کے باعث انسان کو حیوان پر برتری حاصل ہے۔ بہر حال ہم یہاں دماغ کی ساخت، مخ و مخیخ کے فرائض اور نخاع کے وظائف وغیرہ کا بیان بخوف طوالت نظر انداز کیے دیتے ہیں۔ قارئین کرام عضویات پر کسی کتاب کی طرف رجوع کریں۔ یہاں ہمیں صرف گویائی سے بحث ہے دماغ میں جس طرح مختلف قوائے ذہنیہ کے لئے مختلف مرکز مقرر ہیں۔ اسی طرح اس کا ایک حصہ گویائی سے مختص ہے، جسے اصطلاح میں "مرکز گویائی" کہتے ہیں۔ اسی مرکز کی موجودگی اور بروز و ترقی نے انسان کو تمام حیوانات پر اشرف و ممتاز کیا ہے۔ کیونکہ دوسرے جانوروں میں دماغ کا یہ حصہ بالکل مفقود ہوتا ہے۔ اگر یہ حصہ مع نمو یافتہ "تلافیف" کے جانوروں میں بھی موجود ہوتا تو وہ بھی حیوان ناطق بن جاتے اور پھر حیوان مطلق اور حیوان ناطق کی تفریق ہی اٹھ جاتی۔ عضویات کوئی قدیم علم نہیں ہے بلکہ معاشیات، ارضیات، معدنیات، اثریات وغیرہ کی طرح دور حاضر کی تخلیق ہے۔ قدما اس علم سے ناواقف تھے، انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ انسانی دماغ کا کوئی حصہ گویائی کے لئے بھی مختص ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں ایک فرانسیسی عالم "بروقا" نامی نے پہلے پہل دماغ میں "مرکز گویائی" کی موجودگی اور اس کی جائے وقوع دریافت کی۔ اسی انتساب سے وہ حصۂ دماغ جو گویائی سے متعلق ہے "رقبۂ بروقا" کہلاتا ہے۔

اگر ہم دماغ کا مطالعہ ایک دوسرے نقطۂ نگاہ سے کریں اور اس حصے کو تلاش کریں جو اعضا و جوارح کے حرکات و سکنات کو قابو میں رکھتا ہے تو معلوم ہو گا کہ " رقبۂ بروقا " دماغ کے اسی حصے میں واقع ہے جہاں ہونٹ، دانت، زبان، حلق اور جبڑوں وغیرہ کے اعصاب و نسیجات منتہی ہوتے ہیں - اور جو آلات گویائی کے حرکات و سکنات کو بس میں رکھتا ہے - لیکن یہ امر ذہن نشین رہے کہ " رقبۂ بروقا " یعنی مرکز گویائی اور وہ حصہ جو آلات گویائی کو متحرک کرتا ہے دونوں جداگانہ حصے ہیں - یہ حصے ایک دوسرے پر منطبق نہیں ہیں، گو کہ متصل ضرور ہیں دونوں حصوں کی جائے وقوع مخ کے اگلے حصے میں بائیں جانب ہے واضح رہے کہ آلات گویائی کا محض متحرک رہنا قوت گویائی کا کفیل نہیں ہو سکتا - اگر کسی وجہ سے " رقبۂ بروقا " میں اختلال واقع ہو جائے لیکن دماغ کا وہ حصہ جو آلات گویائی کے حرکات و سکنات کو قابو میں رکھتا ہے صحیح و سالم رہے تو انسان ہونٹ، زبان، حلق، دانتوں اور جبڑوں کو حرکت دے سکتا ہے، لیکن بول نہیں سکتا - بعض آدمی ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جن کے دماغ کے "رقبۂ بروقا " میں خلل واقع ہو گیا ہے - یہ لوگ اس اختلال کے باعث گویائی سے محروم ہو گئے ہیں - تاہم وہ چند لفظوں کو بے سمجھے بوجھے مثل توتے کے دہرا سکتے ہیں، یا صرف "ہاں" اور " نہیں " بول سکتے ہیں - اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ " ہاں " اور " نہیں " یا اور الفاظ جو ان کے تکیہ کلام تھے بوجہ کثرت استعمال دماغ پر ایسے گہرے منقوش ہو گئے تھے کہ مرکز گویائی میں اختلال واقع ہونے پر بھی ان کے مٹنے مٹنے سے نشانات صفحۂ دماغ پر باقی رہے - بہر حال دماغ کے حصۂ گویائی یعنی " رقبۂ بروقا " کے متعلق ہمارا علم مکمل نہیں بلکہ ابھی بہت سی باتیں دریافت طلب ہیں - لیکن یہ امر مسلم ہے کہ حصۂ گویائی کا وجود ضرور ہے اور وہ دماغ کے دوسرے حصوں سے آزاد اور بے تعلق ہے - اس کا ثبوت مندرجۂ ذیل واقعات سے ملتا ہے - مختلف افراد کی قوت گویائی مختلف ہوتی ہے، گو کہ وہ دیگر قوائے ذہنیہ

کے لحاظ سے مساوی درجے هی کی کیوں نه هوں - بعض فلاسفه اور مشاهیر ادبا آهسته آهسته اور رک رک کر تقریر کر تے هیں' بر خلاف ان کے بعض معمولی دل اور دماغ کے انسان ایسے چرب زبان اور لسان هو تے هیں که اپنی دلکش تقریر سے مجمع کو مسحور کر دیتے هیں - اگر کسی شخص میں تحریر و تقریر دونوں کا ماده بدرجۀ اتم موجود هو تو اسے بڑا خوش نصیب سمجھنا چاهئے- کارلائل اور اڈیسن اعلی درجے کے ادیب اور انشا پر داز تھے لیکن تقریر کر نے سے عاجز - ان سب باتوں سے ظاهر هوتا هے که دماغ میں مختلف قوتوں کے لئے مختلف حصے مقرر هیں جو ایک دوسرے سے متا ثر هوے بغیر تنها اور آزادانه ترقی کر سکتے هیں - بعض لوگوں کے دماغ کا حصۀ گویائی پوری طرح نمو یافته هو تا هے لیکن دوسرے حصے خام اور ناقص هو تے هیں - ان کے بر عکس بعض اشخاص ایسے بھی دیکھے جا تے هیں جن کا حصۀ گویائی هی ناقص اور دوسرے حصے مکمل هو تے هیں - چنا نچه انگلستان کے مشهور شاعر گولڈاسمتھ کے متعلق کہا جاتا هے که وه تحریر اور انشا پردازی کا بادشاه تھا لیکن تقریر کر نے اور بولنے میں هیرامن توتے کا بھی مد مقابل نه تھا —

الغرض اس طومار سے صرف یه بتانا مقصود هے که شروع سے قدرت نے انسانی دماغ کے ایک حصے کو گویائی کے لئے مخصوص کردیا هے لیکن ابتدائے آفرینش میں چو نکه یه حصه بچوں کے دماغ کے حصۀ گویائی کی طرح ارتقا کی ابتدائی منزل میں تھا اس لئے انسان دوسرے جانوروں یا بچوں کی طرح محض چند مهمل اصوات کے ذریعے سے صرف جذبات اور احساسات کے اظهار پر قادر تھا - چو نکه حیوانات کے دماغ میں گویائی کا حصه سرے سے تھا هی نهیں اس لئے ان کی آواز میں آ ج تک ترقی نهیں هوئی - لیکن انسان کے دماغ میں ایک حصه گویائی کے لئے بھی وقف تھا اسی لئے جس طرح اس کے جسم ' ذهن اور اخلاق میں رفته رفته ترقی هو تی گئی اسی طرح اس کی گویائی بھی روز افزوں ترقی کر تی گئی - جب تمدن کی ترقی ' خیالات کی وسعت اور معاملات کی پیچیدگیوں کی وجه سے

انسان نے رموزی طرز اظہار کو بالکل نا کافی پایا تو اس کا خیال ہوا کہ جس طرح جذبات و احساسات کا اظہار آ وازوں سے خواہ وہ کتنی ہی کرخت ' ثقیل اور بھونڈی کیوں نہ ہوں کیا جاتاھے' اسی طرح تمام ضروریات' خواہشات اور خیالات بھی مرتب اصوات کے ذریعے سے ظاہر کئے جا سکتے ہیں - چونکہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ آوازوں نے بھی ترقی کر لی تھی اس لئے اصوات کے ذریعے متکلم ہو نے اور ہوا کو واسطہ بنا نے میں زیادہ دقت پیش نہ آ ئی - خلاصۂ کلام یہ کہ جب حرکات جسمانی رمز و کنا یہ ' دست و چشم کے اشارے اور علامات اشیاے مادی اداے مطلب کے لئے ناکافی ثابت ہوے تو انسان نے ہوا اور اصوات کے توسط سے تبادلۂ خیالات اور اظہار مافی الضمیر کا اہتمام کیا - تاریخ انسان کے اس دور کا نام " عہد صوتی " ھے- یہ بہت بڑا انقلاب تھا ' جو زبان کی مملکت میں پیدا ہوا ' کیونکہ یہیں سے زبان کی حقیقی تاریخ شروع ہو تی ھے — ×

زبان کی تدریجی ترقی

اول اول جب انسان نے ہوا کو تکلم کا واسطہ بنایا اور آوازوں کے ذریعے سے اداے مطلب کا اہتمام کیا تو وہ صرف اُنہیں معدودے چند سہل المخرج آوازوں کے نکالنے پر قادر تھا جنہیں بول کر چھوٹے بچے اپنی خواہشات و جذبات کا اظہار کر تے ہیں - لیکن جوں جوں انسان کو آلات گویائی کے استعمال میں مہارت ہو تی گئی' وہ حسب ضرورت اُنہیں چند سہل المخرج اصوات کے اونچے نیچے سروں میں ادا کر کے یا اُن میں اتار چڑھاؤ پیدا کر کے یا ان کو گھٹا بڑھا کر مختلف معنی پیدا کر تا گیا - صاحب فرہنگ آ صفیہ کا خیال ھے کہ " شروع شروع جب انسانوں نے اصوات کو اداے مطلب کا ذریعہ بنانا چاہا تو اُنہوں نے صرف تین مفرد حرکتوں یا آوازوں کو منضبط کیا ' جنہیں ہم اعراب یا حرکات ثلاثہ کے نام سے نامزد کر تے ہیں ـ یہ تینوں آوازیں یعنی اَ اِ اُ وہی ہیں جو زمانہ پیدائش سے اُن کے ساتھ سانس کے ہمراہ آئی تھیں اور سہل المخرج

ہونے کے سبب ہر شخص سے بہ آسانی اپنے اپنے موقع پر سرزد ہوجایا کرتی تھیں یعنی درد کے موقع پر درد کا سماں ان میں تھا - دریا کی موجیں' ہوا کی لہریں' گنبدوں کی گونجیں' اُترنے کی سیڑھی' چڑھنے کا زینہ' خدا اور اپنے پیاروں کو پکارنے کی ندا' ہر قسم کی صدا' ہاتھیوں کی چنگھاڑ' شیروں کی دھاڑ' اور بادلوں کی گرج' بھنبھیری کی بھنبھناہٹ' مگس کی طنین' قریب اور بعید کی چیزوں کے اشارے' دنیا کے ابتدائی دھندے ' اُن ہی تین آوازوں یعنی ' اَ - اِ - اُ ' میں موجود تھے - اور ہر ایک کیفیت اُن ہی کے گھٹانے بڑھانے سے حاصل ہوجاتی تھی'' - لیکن یہ رائے غلو اور مبالغے سے پر اور حقیقت سے دور معلوم ہوتی ہے - مختلف خیالات' جذبات اور واقعات کو صرف ایک ہی آواز کی تین صورتوں کی مدد سے بیان کرنا اور لوگوں کا متکلم کے منشا کو معلوم کرلینا بعید از قیاس ہے - ننھے بچے بھی مندرجۂ بالا حرکات ثلاثہ کے علاوہ چند اور سہل المخرج آوازیں بولتے ہیں - جیسے : ماما' بابا' دادا' اھا وغیرہ - لہذا انسان بھی عہد رموزی ہی میں اپنے جذبات چند قسم کی آوازوں سے ظاہر کرتا ہوگا - لیکن "عہد صوتی" میں ضروریات و احتیاجات' خیالات و معلومات میں اضافہ ہوجانے کے باعث زیادہ آوازوں کی ضرورت آن پڑی - چونکہ طویل مُدت کے گزر جانے سے دماغ کے حصۂ گویائی کی بھی پہلے سے زیادہ نشو و نما ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ آلات گویاءی مثلاً ہونٹ' ناک' منہ' زبان' تالو' حلق' دانت وغیرہ کی ساخت اور ہیئت میں بھی کسی قدر ترقی ہوگئی تھی' اس لئے انسان کو اُن کی مدد سے مختلف قسم کے اصوات نکالنے میں سہولت واقع ہوئی - انسان نے آوازوں کو اس طرح ترقی دی کہ کسی کو دونوں ہونٹ ملاکر' کسی کو تالو سے' کسی کو حلق سے' کسی کو زبان کی نوک سے' کسی کو ناک کی شرکت سے نکالا - اب مختلف قسم کی آوازیں انسان کے قابو میں آگئیں - پس مختلف مفرد آوازوں سے مختلف قسم کے خیالات یا اشیا کا اظہار ہونے لگا - لیکن روز افزوں حاجتوں اور ضرورتوں کے سبب سے یہ محدود مفرد آوازیں تمام معلومات کے اظہار

کے لیے ناکافی ثابت ہوئیں - لہذا مفرد اصوات کے اختلاط سے تمام اشیا کے نام رکھے جانے لگے - اول اول جس شے کی جو فطری آواز تھی اُسی کی مناسبت سے اسما بنائے گئے' کیونکہ یہ طریقہ سہل اور قدرتی بھی تھا - جیسے ہوا کے چلنے کو سائیں سائیں اور پانی برسنے کو جھم جھم' کُتے کے بھونکنے کو بھوں بھوں' بلی کی بولی کو میاؤں میاؤں وغیرہ سے تعبیر کیا' اُسی طرح جھیں جھیں کرنے والے جانوروں کا نام جھینگر' ٹرٹر کرنے والے کا 'ٹرو' بھن بھن کرنے والے کا بھونرا' جھر جھر بہنے والے پانی کا نام 'جھرنا' پڑا - جس شے کے ساتھہ کوئی فطری آواز وابستہ نہ تھی' اس کا جو کچھہ مناسب سمجھا گیا نام رکھہ دیا گیا - اس طرح ایک معقول تعداد اسما کی تیار ہوجانے پر زبان کو غیر معمولی گرانباری سے بچانے کے لیے یہ اصول مد نظر رکھا گیا کہ اگر کسی نئی شے میں دو یا زیادہ اشیاء کی صفات یا مشابہات پائی جائیں تو اُس شے کا ایک نیا نام تجویز کرنے کے بجاے اشیاے معلومہ کے اسما کی آمیزش سے مرکب لفظ بنالیا جاے - مثلاً 'کنسلائی' اُس سلائی کے مانند باریک کیڑے کو کہا جو کان میں رینگ جاتا ہو - 'کنکھجورا' اُس کیڑے کا نام پڑا جو کھجور کے مشابہ ہو اور کان میں بیٹھہ جاے - 'اجگر' (اج بکرا × گر - نگلنے والا) اُس اژدھے کو کہنے لگے جو بکرے کو نگل جاے - اگر کوئی جانور دو یا زیادہ جانوروں کے مشابہ ہو تو اس کا نام ان ہی مشابہ جانوروں کے اسما کا مجموعہ قرار پایا - مثلاً 'شتر مرغ' گاؤ میش' فیل مرغ' شتر گاؤ پلنگ (زرافہ) وغیرہ - بعض جانوروں کے نام ان کی صفات یا خواص کی مناسبت سے رکھے گئے - مثلاً 'ہاتھی' یعنی ایک ہاتھہ والا جانور' سونڈ ہاتھہ کے بجاے سمجھی گئی - چیتا وہ درندہ ہے جس کی کھال پر چتیاں ہوتی ہیں - سمندر (سام - آگ × اندر درمیان) اس کیڑے کا نام پڑا' جو آگ میں رہے - بعض چیزوں کے نام ان کے افعال کے باعث رکھے گئے' مثلاً مارخور' چوھے مار' چڑی‌مار' نیولا (نیو یعنی بنیاد کھودنے والا) وغیرہ - الغرض ان‌ہی اصول پر تمام اشیا کے اسما قرار دیے گئے - اوپر کی تمام مثالیں فرہنگ آصفیہ سے دی گئی ہیں -

لیکن مندرجۂ بالا بیانات سے ہرگز یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ابتدائی دور تمدن میں اشیاء کے وہی نام تھے جو اوپر بیان کیے گئے اور دور بربریت کا انسان اردو بولنے پر قادر تھا - محض اصول سمجھانے کے خیال سے ایسے الفاظ کی مثالیں دی گئی ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں - ابتدائی انسانوں نے ان ہی اصول پر اشیا کے نام رکھے - نام کچھ ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اُن کے مقرر کرنے کے لئے اصول وہی تھے جو اوپر بیان ہوے - یہی وہ ابتدائی زینے تھے جن پر رفتہ رفتہ گامزن ہوکر زبان نے اعلیٰ زینے تک صعود کیا - واضح رہے کہ افعال کے نام بھی پہلے فطری آوازوں ہی کی مناسبت سے رکھے گئے - مثلاً 'پھونکنا، گڑگڑانا، غرانا، کھٹکھٹانا وغیرہ - جہاں قدرتی آوازوں کا فقدان تھا وہاں جو کچھ مناسب سمجھا گیا فعل کا نام رکھ دیا گیا - اکثر افعال کے نام اسماے اشیا سے بنائے گئے - ' ھتھیانا ' یعنی کوئی شے ہاتھ میں لینا اور اس پر قابض ہوجانا، 'برقانا ' یعنی کسی شے میں بجلی گذارنا - وغیرہ - انگریزی زبان میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملیں گی - اس کے بعد اسما میں باہم نسبت دینے کے لئے روابط قائم کیے گئے - جب اسماء، افعال اور روابط مقرر ہوچکے تو گویا ایک باقاعدہ زبان کا ڈھچر تیار ہوگیا - رفتہ رفتہ اس کالبد کی مناسب عضو بندی ہوتی رہی، یہاں تک کہ بالآخر ایک گٹھا ہوا، سڈول جسد تیار ہوگیا اور علم و فن کی ترقی نے آگے چل کر اس میں جان ڈال دی - تشبیہ و استعارہ کا نقاب ہٹانے پر سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ معاشرت کی ترقی، احتیاجات کے اضافے، ضروریات کے ہجوم، معاملات کی پیچیدگی، زندگی کی کشاکش کے زیر اثر "زبان صوتی" دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی گئی، ذخائر الفاظ میں اضافہ ہوتا گیا اور لغات بڑھتی گئیں - جس طرح بچوں کی معلومات محض اشیاے مادی و محسوس و مقرون تک محدود ہوتی ہیں اور انہیں مجردات کا تصور نہیں ہوتا، اسی طرح ابتدائی انسان کی واقفیت مادی اور مرئی چیزوں تک محدود تھی - لیکن تمدن کی ترقی اور ارتقاے ذہن کے باعث خیالات میں لطافت اور پاکیز گی

آتی گئی اور مجردات و توصیفات کے لئے بھی نام تجویز کئے گئے- رفتہ رفتہ اداے مطلب کے لئے عمدہ پیرایۂ بیان اور اظہار خیالات کے لئے حسن اسلوب کی جانب ذہن انسانی رجوع ہوا - چنانچہ بمرور زمانہ ایک مرتب اور باقاعدہ زبان کی مستقل ہیئت قائم ہو گئی - آبادی اور تمدن کی ترقی کے ساتھہ ساتھہ زبان بھی ترقی کرتی گئی - جوں جوں زمانہ گذرتا گیا' پچھلے الفاظ زبان کی رگڑ کھا کھا کر منجھتے ' صاف ہو تے اور گھل گھل کر سلیس ہو تے گئے - چنانچہ امتداد زمانہ سے الفاظ زبان کی خراد پر چڑہ کر تراش خراش پا تے گئے - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر زبان میں شستگی' حلاوت اور گھلاوٹ پیدا ہو گئی - لیکن تقریری زبان میں اس حد تک ترقی ہو نے پر بھی رسم خط و طرز تحریر ہنوز پردۂ خفا میں تھی - الفاظ و خیالات ابھی ضبط تحریر میں آ کر پابند سلاسل نہیں ہوے تھے - دیوتاؤں کے بھجن ' پیشوایان دین کی تعلیم ' دانشمندوں کے اقوال ' راجاؤں اور سورماؤں کے کارنامے عرصۂ دراز تک محض زبانی طور پر نسلاً بعد نسل منتقل ہو تے رہے —

اختلافات السنہ

کسی زبان کی پیدائش اور اُس کی ترقی کے مختلف مدارج اوپر بیان ہو چکے ' لیکن یہ پتا لگانا بہت دشوار ہے کہ ابتداے تمدن میں ایک ہی زبان بولی جا تی تھی یا کئی - جن اقوام کا یہ مذہبی عقیدہ ہے کہ تمام انسان ایک ہی ابوالبشر کی اولاد سے ہیں - خواہ وہ یہود و نصاریٰ و اہل اسلام کے خیال کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام ہوں یا مجوسیوں کے قول کے مطابق " مہ آباد " یا ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق " سویمبھو منو " - یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ابتدا میں ایک ہی زبان تھی' جس سے دیگر السنہ مشتق ہوئی ہیں - لیکن وہ ابتدائی زبان کونسی تھی اور اس کی ہیئت کذائی کیا تھی ؟ اس کے جواب میں قومیں مختلف الآرا ہیں - ہرقوم اپنے خیالی مورث اعلیٰ کی زبان کو تمام دیگر السنہ کا ماخذ قرار دیتی ہے - کو ئی ' سریانی ' کو' کو ئی ' ارامی' کو کو ئی 'سنسکرت' کو اور کو ئی 'استاوی' زبان کو اُم 'الالسنہ' قرار دیتا ہے - سا سانی

مجوسیوں کا قول ہے کہ " مہ آباد " نے جس کی زبان استاوی تھی ' اپنے شاگردوں کو مختلف زبانوں کی تعلیم دے کر مختلف ممالک میں بھیجا ۔ اس طرح مختلف قطعات ارض میں مختلف زبانیں بولی جانے لگیں - اگر یہ واقعہ سچ بھی ہو تو وہ اختلاف زبان کی وجہ قرار نہیں دیا جا سکتا' بلکہ اس سے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف قطعات ارض پہلے سے آباد تھے - اور ہر جگہ کی زبان الگ الگ تھی ۔ اس لئے ہر ملک کے لوگوں کو اُنھیں کی زبان میں اصول مذہب کی تعلیم دینے کے لئے ' مہ آباد ' نے اپنے شاگردوں کو مختلف زبانیں سکھا ئیں ۔ توریت کے گیارھویں باب میں زبان میں پھوٹ پڑ جانے کی جو وجہ بتائی گئی ہے' وہ ہم شروع ہی میں بیان کر آئے ہیں ۔ لیکن دور حاضر کے دانایان فرنگ کا خیال ہے کہ انسان کسی فرد واحد کی اولاد نہیں ہے' بلکہ اُس نے جسم حیوانی سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے اور ارتقا کے بے شمار مدارج طے کرنے کے بعد ' جامۂ انسانی زیب تن کیا ہے - لہذا اُن کا خیال ہے کہ ابتدائے تمدن ہی میں دور دراز ممالک کے وحشی انسان مختلف زبانیں بولتے ہو گئے ۔ بہر حال اگر یہ مسئلہ غیر فیصل ہی چھوڑ دیا جائے کہ ابتداءاً انسان کی زبان ایک تھی یا متعدد' تو بھی یہ امر مسلم ہے کہ اُس وقت آج کل کی طرح لاکھوں زبانیں نہیں بولی جاتی تھیں - ماہرین عمرانیات نے انسان کے خط و خال ' جسمانی ساخت ' قد و قامت ' چہرے مہرے' کاسۂ سر اور جبڑوں کی بناوٹ اور رنگ وغیرہ کا مقابلہ کر کے انسان کو سات نسلوں میں تقسیم کیا ہے ۔ یعنی (۱) آریائی (۲) سامی (۳) تاتاری (۴) ملائی (۵) امریکی (سرخ وحشی) (۶) حبشی (۷) آسٹریلیائی-لیکن اس زمانے کی تحقیق نے اس دائرۂ تبویب و تقسیم کو محدود کر کے سات کے بجائے تین ہی نسلیں قرار دی ہیں ۔ علمائے انسانیات اول الذکر دو نسلوں کو ایک ہی وسیع کاکیشیائی نسل کی شاخیں سمجھتے ہیں ۔ ثانی الذکر تین قومیں ایک ہی نسل منگولی کی فروع ہیں - ان کا خیال ہے کہ منگولی نسل کی جو شاخ اپنے قدیم آبائی وطن میں مقیم رہ گئی

وہ تاتاری قوم کہلاتی ہے - جو شاخ جانب جنوب کوچ کر کے سیام ' انام ' ملایا' سماترا ' جاوا وغیرہ میں جا بسی وہ ' ملائی' قوم کہلانے لگی - تیسری شاخ شمال کی طرف بڑھی اور آبنائے بیرنگ' کو جو قدیم زمانے میں خاکنائے تھی' عبور کرکے امریکا کے مختلف حصوں میں آباد ہو گئی - اسی شاخ کا آگے چل کر امریکی یا سرخ وحشی قوم نام پڑا - آخرالذکر دو نسلیں یعنی حبشی اور آسٹریلیائی ایک ہی نسل ایتھیوپی (اسودااللون) سے متفرع ہیں - ماہرین ارضیات کا قیاس ہے کہ قرنوں پہلے دنیائے قدیم کے جنوبی حصے کی شکل ایسی نہ تھی جیسی آج کل ہے' بلکہ افریقہ ' ہندوستان اور آسٹریلیا بذریعۂ خشکی باہم متحد تھے - اس وقت اسوداللون قوم کی شاخیں افریقہ سے چل کر ہندوستان اور آسٹریلیا میں جا بسی تھیں - چنانچہ ہندوستان کی قدیم وحشی اقوام اسی اسوداللون نسل سے تعلق رکھتی ہیں - عرصۂ دراز کے بعد خشکی کا بڑا حصہ زیر آب چلا گیا اور آسٹریلیا ہندوستان اور افریقہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے - الغرض ابتدائے تمدن میں اگر ایک نہیں تو تین یا زیادہ سے زیادہ سات زبانیں بولی جاتی ہوں گی - اور امتداد زمانہ سے انھیں سے بے شمار زبانیں نکلتی گئیں - اب ہمیں زبان میں اختلافات پیدا ہونے کی وجوہ پر غور کرنا چاہئے —

مذہبی روایات کا دار و مدار ظنیات پر ہے' لیکن علمی تحقیقات کا تعلق واقعات اور عقلیات سے ہے - لہذا اختلافات السنہ کی جو وجوہ توریت اور انجیل یا مجوسیوں کی کتاب مقدس میں درج ہیں ' انھیں ہم نظر انداز کردیتے ہیں - اور اپنی بحث کو معقولات ہی کے دائرے کے اندر محدود رکھتے ہیں - علمی لحاظ سے اختلاف السنہ کی سب سے بڑی وجہ متفرق ممالک کی آب و ہوا اور دیگر جغرافی خصائص کا اختلاف ہے - جب مادر وطن میں اُس کے تمام فرزندوں کے لئے کافی جگہ اور گنجایش باقی نہیں رہی تو فاضل آبادی دوسرے ملکوں میں ہجرت کرنے لگی - مثلاً آریاؤں کا قدیم وطن وسط ایشیا تھا' لیکن عمران و آبادی کی

کثرت نے انھیں وطن کو خیر باد کہہ کر دوسرے ملکوں میں جا بسنے پر مجبور کیا - ان کا اکثر و بیشتر حصہ مغرب کی جانب تلاش معاش میں چل کر تمام یورپ پر چھا گیا - کچھ لوگ جنوب کی طرف روانہ ہو کر ایران اور ہندوستان میں آ بسے - یہی حال دوسری نسلوں کا ہوا - الغرض مرکزی وطن سے ہجرت مختلف قطعات زمین کی آبادی کا باعث ہوئی - اُس زمانے میں آج کل کی طرح دور دور ملکوں کے درمیان رسل و ترسیل اور حمل و نقل کے ذرائع موجود نہ تھے - اس لئے ایک ہی نسل کے لوگوں کے جو مختلف بلاد میں جا بسے تھے' باہمی تعلقات منقطع ہو گئے - متفرق ممالک کی آب و ہوا اور دیگر جغرافی خصائص کے زیر اثر نہ صرف مختلف قوموں کے عادات و خصائل' میلانات و رجحانات' ضروریات و خصوصیات رسم و رواج ہی ایک دوسرے سے متغائر ہو گئے بلکہ ان کے قد و قامت' جسمانی ساخت' آلات گویائی کی بناوٹ' منہ' زبان' ناک' دانتوں' حلق' ہونٹوں اور صوتی نلیوں وغیرہ کی ہیئت اور ساخت میں بھی افتراق پیدا ہو تا گیا - لہذا اُن کے لب و لہجہ' آواز و اصوات' مخارج و تلفظ' طرز ادا' اسلوب بیان وغیرہ بھی ایک دوسرے سے متباین ہو گئے - مثلاً پہاڑی علاقوں کے لوگوں کی آواز میں خشونت' میدانی قطعات کے باشندوں کی آواز میں ہمواری' سلاست اور روانی' تری کے رہنے والوں کی زبان میں نرمی اور لوچ' معتدل آب و ہوا میں زندگی بسر کرنے والوں کی بولی میں شیرینی اور حلاوت پیدا ہو گئی - یہ تو لب و لہجہ کا تغیر ہوا' ایسی ہی تبدیلیاں مخارج اور تلفظ میں بھی رونما ہوئیں - مختلف مرز بوم کی آب و ہوا کے زیر اثر بعض قوموں کے آلات گویائی کی ساخت میں کچھ ایسا بجوگ آ پڑا کہ وہ بعض آوازوں کے بولنے سے قاصر ہو گئے - مثلاً پ - چ - ژ - ڑ - ڈ' گ وغیرہ کا تلفظ عربوں کے لئے نا ممکن ہے - اسی طرح انگریز ت' ع' غ' خ' ق' وغیرہ کا تلفظ نہیں کر سکتے - بھ' پھ' تھ' دھ' کھ' اور ٹ' ڈ' ڑ وغیرہ خاص ہندی النسل اصوات ہیں-

جن کے ادا کرنے سے دنیا کی اکثر قومیں معذور ہیں - اِس اختلاف تلفظ کی وجہ سے ایک ہی لفظ نے مختلف ممالک میں پہنچ کر مختلف شکلیں اختیار کرلیں، مثلاً ایران کی دختر ہندوستان میں آ کر " دو ہتر " اور انگلستان میں پہنچ کر " ڈاٹر " بن گئی - " باپ " کو لاطینی میں " پاٹر " فارسی میں " پدر " سنسکرت میں " پتر " اور انگریزی میں " فادر " کہتے ہیں - اسی طرح گائے کو فارسی میں ' گاؤ ' سنسکرت میں ' گئو ' اور انگریزی میں " کاو " کہتے ہیں - ظاہر ہے کہ ابتدا میں یہ ایک ہی لفظ تھے - لیکن مختلف مرز بوم کی آب و ہوا نے تلفظ اور لب و لہجہ میں تفریق پیدا کردی - پس ایک ہی لفظ کا تلفظ مختلف قوموں میں جا کر مختلف ہو گیا - علاوہ بریں ایک ہی ملک میں بھی کسی زبان کے الفاظ بمرور زمانہ منجھے اور شستہ ہوتے اور تراش خراش پاتے رہتے ہیں - اس لئے زبان کی ہیئت بتدریج بدلتی رہتی ہے - الزبتھ کے عہد کی انگریزی اور موجودہ انگریزی یا سترھویں صدی کے آواخر کے ریختے اور آج کل کی اُردو میں زمین آسمان کا فرق ہے - زبان کے اختلاف کی ایک بڑی وجہ نئے الفاظ کی توضیع و تسکیک ہے - مادر وطن میں جگہ کی قلت اور ذریعۂ معاش کی تنگی کے باعث ایک نسل کے لوگ ابتدائے تمدن ہی میں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے - چونکہ اُس وقت اُن کی ضروریات نہایت سادہ اور معلومات محدود تھیں، اس لئے ان کے الفاظ کا ذخیرہ بھی نہایت قلیل تھا - لیکن جوں جوں تمدن بڑھتا گیا اور ضروریات اور احتیاجات میں اضافہ اور معلومات و خیالات میں وسعت پیدا ہوتی گئی، مختلف ملکوں میں اشیا کے لئے نئے نئے نام اور ادائے مطلب کے لئے نئے نئے اسالیب بیان گھڑے گئے - چونکہ اُس وقت سلسلۂ مواصلت و نامۂ و پیام مفقود تھا - اس لئے ہر جگہ کی بولی اور اسلوب بیان جداگانہ ہوتا گیا - یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ایک ملک کی بعض نباتی، حیوانی اور جمادی پیداواریں دوسرے ملک کی پیداواروں سے متباین ہوتی ہیں - اس لئے

کسی ملک کی مخصوص چیزوں کے لیے جو نام وہاں مقرر ہوے وہ دوسرے ملک کی زبان میں نا پید تھے - جس طرح مختلف ممالک کے باشندے وہاں کی آب و ہوا اور ملکی خصائص کے زیر اثر بہ لحاظ قد و قامت، خط و خال، جسمانی ساخت، صورت شکل، ایک دوسرے سے نہیں ملتے، اُسی طرح مختلف قوموں کے خیالات و افکار، مذاق اور پسند بھی جداگانہ ہوتے ہیں - ہر قوم نے اپنے افکار و آرا کے اظہار کے لئے اپنے مذاق کے مطابق ایک علحدہ طرز ادا اور اسلوب بیان اختیار کیا - پھر ذیف مندرجۂ بالا تمام وجوہات کی بنا پر ہزاروں زبانیں معرض وجود میں آئیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاے گا آئندہ بھی آتی رہیں گی - دور حاضر میں حمل و نقل کی سہولت اور تجارت کی ترقی کے باعث مختلف اقوام کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع ہاتھ آتا ہے - آپس میں کار و بار چلانے اور لین دین جاری رکھنے کے لیے ایسے وسائل کی ضرورت پڑتی ہے جنھیں سب سمجھ سکیں - لہذا مختلف زبانوں کے باہمی تصادم سے ان پر اثر و تاثر کا عمل شروع ہوتا ہے - رفتہ رفتہ اُن زبانوں کے اختلاط سے ایک نئی زبان معرض وجود میں آتی ہے - اول اول یہ محض کار و باری اور بول چال کی زبان ہوتی ہے لیکن بتدریج مستقل ہیئت اختیار کر لیتی ہے اور اُس کا دامن علمی اور فنی جواہر ریزوں سے بھرنے لگتا ہے - آخرش اُس کا بھی شمار دنیا کی اہم علمی زبانوں میں ہونے لگتا ہے - چنانچہ اردو اسی قسم کی ایک زبان ہے جو مختلف السنہ کے باہمی اختلاط سے پیدا ہوئی ہے - واضح رہے کہ ابھی زبانوں کے اختلافات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے بلکہ آے دن نت نئی زبانیں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں - الغرض تمدن کی ترقی، عمران اور آبادی کی فراوانی، معاملات و معاشرت کی پیچیدگی کے باعث ربع مسکون کا ہر حصہ آباد ہو گیا ہے - بہ امتداد زمانہ نہ صرف زبانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ طرز ادا اور اسلوب بیان میں شستگی اور رنگا رنگی بھی پیدا ہوتی گئی —

تحریر کا هیولی

اب هم بتانا چاهتے هیں که رسم تحریر کا خیال کس طرح پیدا هوا اور شروع شروع لکھنے کا کیا طریقه تها - عوام کا قاعده هے که وه هر شے کا موجد کسی نه کسی دیوتا یا پیغمبر یا دانشمند یا بطل کو ٹهیرا لیتے هیں جو انهیں کے اسلاف میں سے هو تا هے - مثلاً نجاری کے استاد اول نوح علیه السلام ، آهنگری کے موجد داود علیه السلام - خیاطی کے معلم اول ادریس علیه السلام ، پارچه بافی کے بانی آدم علیه‌السلام قرار دیے جا تے هیں - اسي طرح فن تحریر کی ایجاد کا سهرا هر قوم اپنے کسی بزرگوار کے سر باندھ دیتی هے - چنا نچه کو ئی قوم ، گنیش ، کو کو ئی ، جمشید ، کو کو ئی ، جوپیٹر، (فاهید) کو کو ئی ، سلیمان علیه السلام، کو کو ئی آدم علیه السلام کو فن تحریر کا بانی خیال کر تی هے - لیکن اگر تحقیق و تلاش اور غور و فکر سے کم لیا جاے تو واضح هو گا که دنیا میں کو ئی علم ، کوئی هنر ، کوئی فن ، کو ئی صنعت ، شاید هی ایسی هو گی جو اپنے وجود کے لئے کسی فرد واحد کی قوت اختراعیه کی منت پذیر هو - بڑے سے بڑا عاقل یا فن کار کسی شے کو نیست سے هست ، عدم سے وجود میں یا پردۂ خفا سے تماشا گاه عالم پر نهیں لا کھڑا کرتا - بلکه پهلے سے هر شے کا هیولی یا ماده موجود هوتا هے ، جسے وه ترقی دیتا هے - یا اپنے اسلاف کی منتشر معلومات کو باهم مربوط اور ان کی اچھی طرح شیرازه بندی کر کے اصول و قوانین کی شکل میں مرتب و منضبط کرتا هے- اور موجد ، مخترع ، مبتدع، مجتهد، مکشف ، اور نه معلوم کیا کیا بن بیٹهتا هے - فی الحقیقت رسم تحریر کسی واحد فرد بشر کی جولانی طبع یا دماغ سوزي کا نتیجه نهیں هے اور نه حروف کی اشکال اور تحریر کے قواعد ممالک متحده امریکا کے دستوری آ ئین و قوانین کی طرح کسی کانگریس یا مؤتمر میں باهمی قرارداد کے مطابق گھڑے گئے هیں- حقیقت امر یه هے که دور بربریت هی میں تحریر کا هیولی یا نقش اول قائم هو چکا تها ، عهد بعهد اس کی هیئت بدلتی اور اس میں ترقی هوتی گئی، یهاں تک که ارتقا کا زینه آج کل کی سهل النقش

طرز تحریر تک پہنچ گیا —

اب ھمیں غور کرنا ھے کہ تحریر کے ھیولی یا نقش اول کی ھیئت کیا تھی - اس زمانے کی تحقیق کے رو سے یہ امر مسلم ھے کہ قدامت کے لحاظ سے آرایش کا خیال ستر پوشی سے بھی مقدم ھے - بہت سی وحشی قوموں کے افراد سخت جسمانی تکالیف محض اس غرض سے اُٹھاتے ھیں کہ اپنے جسم کو گدوا کر خوبصورت بنائیں - وہ موسم کی سخت سے سخت گرمی سردی کی بھی برداشت کر لیتے ھیں لیکن انھیں رفع کرنے کی کوشش نہیں کرتے - جرمنی کے ایک مشہور فلسفی سیاح ' ھمبولٹ ' کا بیان ھے کہ " اوری نو کو ' کے وحشی باشندے جسمانی آرام و راحت کی طرف سے تو بالکل غافل ھیں مگر دو دو ھفتے تک صرف اس غرض سے محنت مزدوری کرتے ھیں کہ اپنے بدن کو رنگنے کے واسطے رنگ خرید سکیں تا کہ ان کو رنگا ھوا دیکھ کر لوگ واہ وا کریں - وھی وحشی عورت جو اپنی جھونپڑی سے بالکل برھنہ باھر نکلنے میں کچھ پس و پیش نہیں کرتی' اس کی اتنی جرأت نہیں ھوتی کہ اپنے بدن کو رنگ لگائے بغیر باھر چلی جائے اور اس بدسلیقگی کی مرتکب ھو" - تاریخ انگلستان کے مطالعے سے واضح ھوتا ھے کہ قدیم برطانیوں میں بھی بدن کو نیلا رنگنے کا عام رواج تھا - تن ڈھانکنے کے لئے کسی جانور کی کھال اور کپڑا میسر آئے یا نہ آئے لیکن جسم کو نیلا رنگنا اور کچھ عرصے بعد گدوانا لازمی تھا - یہ رسم فرنگی سپاھیوں میں ابھی تک پائی جاتی ھے جن کو ھم ھندوستان میں بھی دیکھتے ھیں - یہ گورے سپاھی اپنے گُدے ھوئے ھاتھوں کی نمائش کے لئے تقریباً ھر وقت قمیص کی آستینیں چڑھائے رھتے ھیں - بحری سیاحوں نے یہ بھی معلوم کیاھے کہ وحشی قومیں سوتی کپڑے اور بانات کی نسبت رنگین مالاؤں' انگوٹھیوں اور چھلوں وغیرہ کو زیادہ عزیز رکھتی ھیں - راقم الحروف کو عرصے تک چھوٹا ناگپور کے صدرمقام رانچی میں رھنے اور وھاں کے جنگل باسی کولوں کے طرز زندگی کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا ھے - وحشی 'کول' آس پاس کی جھاڑیوں اور جنگل سے آ کر دن بھر شہر میں محنت

مزدوری کرتے ہیں اور شام ہوتے ہی جنگل کا راستہ لیتے ہیں - اس قوم کے ذکور و اناث دونوں نیم برہنہ رہتے ہیں - مردوں کی کمر پر صرف ایک چھوٹی سی لنگوٹی اور عورتوں کی کمر سے گھٹنوں کے اوپر تک ایک تہمد بندھا رہتا ہے - لیکن ان وحشیوں میں آرایش کا خیال اس قدر ہے کہ عورت تو پھر عورت ہی ہے، مرد بھی لمبی لمبی زلفیں رکھتے ہیں، جو ہر وقت شانہ کی ہوئی رہتی ہیں - دو تین چھوٹے چھوٹے مدور آئینے اور اتنی ہی کنگھیاں بالوں میں اٹکائی ہوئی رہتی ہیں - بندھی ہوئی زلف کے گردا گرد پھول کے ہار حلقہ کیے ہوتے ہیں - اور گردن مونگے کی سرخ مالاؤں سے مزین ہوتی ہے کپتان اسپیک اپنے افریقی رفقا کا ذکر کرتے ہیں کہ مطلع صاف ہونے کے وقت تو یہ لوگ بکری کی کھال کے کوٹ پہنے اِدھر اُدھر شان سے اکڑتے چلتے ہیں، مگر بارش کے وقت اُن کو تہہ کر کے رکھ دیتے ہیں اور مینہ میں تھر تھر کانپتے پھرتے ہیں - وحشی باشندوں کی طرز معاشرت کے واقعات در حقیقت اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جسم کی زینت اور آرایش ہی نے ترقی کرتے کرتے لباس کی شکل اختیار کی۔ اسی طرح مکان کی آرایش نے ترقی کر کے تعمیر کی شکل اختیار کی - بیانات مذکورۂ بالا ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ دور بربریت کے انسان بھی زینت اور آرایش کے دلدادہ ہوتے تھے - جن جانوروں کا وہ شکار کرتے تھے، یا جو چیزیں اُنہیں خوبصورت نظر آتی تھیں، یا جن حیوانات و نباتات کی وہ پرستش کرتے تھے، ان کی تصویریں بنانے کی وہ کوشش کرتے تھے - پہلے یہ تصاویر بچوں کی بنائی ہوئی تصویروں کی طرح بھدی اور بھونڈی ہوتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ ان ابتدائی فن کاروں کی مشق و مہارت بڑھتی گئی، وہ ہڈی اور سینگ کے ٹکڑوں پر انسانوں اور جانوروں کی تصویریں کندہ کر کے اُن سے اپنے رہنے کے جھونپڑوں کو آراستہ کرتے تھے - یا اگر ان کا بسیرا غاروں میں ہوتا تو اُن کے در و دیوار پر وہ معمولی سنگ تراشی بھی کرتے تھے - موجودہ دور تمدن میں بھی ہندوستان

کے دھقانی اپنے مکان کے در و دیوار پر اکثر ھاتھی - اونٹ - گاے - گھوڑے - شیر - سپاھی یا دیوتاؤں کی تصویریں خوبصورتی کے لئے بناتے ھیں - آگے چل کر معلوم ھوگا کہ آرایش مکان کے لئے جو تصویریں بنائی جاتی تھیں ' وھی تحریر کا ھیولی یا نقش اول تھیں -

تصویر نویسی*

دور بربریت کے انسان ھڈی اور سینگ کے ٹکڑوں پر جو تصویریں بناتے تھے اُس سے اول اول وہ محض اپنے رھنے کے غاروں یا جھونپڑوں کو آراستہ کرتے تھے - تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ جوں جوں ذوق نفاست پسندی اور جذبات جمالیہ ترقی کرتے گئے ' ان تصویروں کی قدر و قیمت بڑھتی گئی ' یہاں تک کہ وہ ایک بیش بہا خزانہ متصور ھونے لگیں جب معاشرت نے اور ترقی کی اور شایستگی کا قدم اور آگے بڑھا ' لوگ خاندانوں اور قبیلوں پر تقسیم ھو گئے تو خاندانوں یا قبیلوں کے سردار ان تصویر دار ھڈیوں اور سینگوں کو ایک دوسرے کے پاس بطور تحفۂ و ھدیہ بھیجنے لگے - کچھ عرصے بعد یہ تصویریں بجاے تحفۂ و ھدیہ کے نامۂ و پیام کا وسیلہ بن گئیں - الغرض اس وقت تک تصاویر پر تین دور گذر چکے تھے - دور اول میں وہ صرف زیبایش کی چیزیں تھیں ' دور ثانی میں وہ بطور تحفۂ و ھدیہ استعمال ھونے لگیں اور دور ثالث میں ان سے نامۂ و پیام کا کام انجام پانے لگا اوپر بیان ھوچکا ھے کہ " عہد رموزی " میں مادی اشیا بھیج کر نامۂ و پیام کا کام نکالا جاتا تھا - لیکن بھاری اشیا کی ترسیل زحمت طلب تھی ' خصوصاً اُس زمانے میں جب کہ ذرائع حمل و نقل مفقود تھے ' لهذا بغرض سہولت خود ان چیزوں کا بھیجنا موقوف کردیا گیا اور صرف ان کی تصویریں بھیج کر خیالات کا اظہار کیا جانے لگا - لیکن چونکہ ابھی تک اداے مطلب کے لیے ان تصویروں کی تخصیص نہیں ھوئی تھی' اس لیے اس طریق نامۂ و پیام سے اکثر مافی الضمیر سمجھنے اور بھیجنے والے کا عندیہ دریافت کرنے میں غلط فہمیاں پیدا ھو جایا کرتی تھیں - مثلاً فرض کرو کہ ایک سردار نے

---

* Hieroglyphics —

دوسرے کو تصاویر کے ذریعے سے کسی جشن یا ضیافت میں شرکت کی دعوت دی لیکن دوسرے نے غلطی سے اُس کو مبارزت نامہ یا صلاے مقابلہ سمجھہ لیا تو اس کا نتیجہ خطرناک جنگ یا سخت جماعتی تصادم ہوتا - اس قسم کی غلط فہمیوں کے باعث نظام معاشرت میں اختلال واقع ہونے لگا' لہذا قوم کے دانشمندوں نے باہمی قرار داد کے مطابق خاص خاص جانوروں یا دیگر اشیاء کی تصویریں خاص خاص مطالب کے اظہار کے لیے متعین کردیں۔ اس تعین و تخصیص کے بعد غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا' اب لوگ ایک دوسرے کا مافی‌الضمیر آسانی سے سمجھنے لگے - رفتہ رفتہ تصویروں کا استعمال عام ہو گیا - یہی تصویر نویسی رسم تحریر کا اول زینہ تھی - جس طرح چھوٹے بچوں کے معلومات محض اشیاے مادی تک محدود ہوتی ہیں اور انہیں مجردات کا تصور نہیں ہوتا' اسی طرح ابتداے تمدن میں انسانی علم صرف مادی اور محسوس چیزوں کے ساتھہ وابستہ تھا ۔ مجردات اُن کی ذہنی دسترس سے بالا تر تھے تصویروں کے ذریعے محض مادی اشیا کا اظہار ہوتا تھا - مثلاً انسان' چو پاے' پرند' درخت' پھل' پھول وغیرہ کا خیال اُن کی تصویروں سے ظاہر کیا جاتا تھا - لیکن جب ذہنی و اخلاقی ترقی کی وجہ سے خیالات و افکار لطیف و مجرد ہونے لگے تو ان کے اظہار کے لیے بھی تصویریں معین کرنے کی ضرورت پڑی - مثلاً عقاب کے پر کی تصویر راستی اور صداقت کی' شاخ زیتون کی تصویر صلح اور آشتی کی' ترازو کی تصویر عدل و انصاف کی' سفید لباس کی تصویر معصومیت کی مظہر قرار پائی - تاریخ‌لسان کا یہ دور "عہدتصویرنویسی" کہلاتا ہے- قدیم مصر میں‌فن‌تصویر نویسی‌اپنے پورے شباب کو پہنچ گیا تھا - وہاں جب بڑے بڑے فراعنہ تخت نشیں ہوے اور ان کی شہرت' قوت' سطوت اور جاہ و حشمت کا ڈنکا تمام اکناف عالم میں بجنے لگا تو اُنھیں‌صرف‌اس بات سے تشفی‌نہیں ہوئی کہ ان‌کےعظیم‌الشان کار نامے محض زبانی طور پر ایک پشت سے دوسری پشت تک منتقل ہوا کریں - انہیں

خوف ہوا کہ ان کے کار نمایاں کہیں گرداب فراموشی میں غرقاب نہ ہوجائیں' یا اُن کے دشمن اُن کے خلاف کوئی جھوٹا قصہ نہ گھڑلیں- لہذا انھوں نے اپنے کارناموں کو طاق نسیاں کا گلدستہ بننے سے بچانے کے لئے اپنی عظیم الشان تاریخ یا تذکرے کو پتھر' اینٹ' کھپریل' وغیرہ پر کندہ کرایا' جو آج کل زمین کے نیچے سے بر آمد ہورہے ہیں۔ مصر میں تصویر نویسی کی یادگاریں صرف پتھر کی لاٹوں ہی پر کندہ کی ہوئی نہیں ملتیں بلکہ قدیم مندروں' مقبروں اور محلوں کے شکستہ در و دیوار پر بھی جنھیں امتداد زمانہ نے زیر زمیں مدفون کردیا ہے' رنگی ہوئی پائی جاتی ہیں- علاوہ بریں قدیم اہل مصر نے اپنے عروج کے زمانے میں تصویری تحریر میں پوری پوری کتابیں بھی تیار کی تھیں - جو کتان یا "پپیرس" پر تصویری خط میں لکھی گئی تھیں- پپیرس ایک قسم کا پودا ہے جو قدیم مصر میں بکثرت اُگتا تھا- لیکن آج کل حبش' شام اور جزیرۂ صقلیہ میں بہ افراط پایا جاتا ہے - اس کے ڈنٹھل مثلث نما اور قریب ایک انچ موٹے ہوتے ہیں۔ قدیم اہل مصر ان ڈنٹھلوں کو پتلے پتلے ورقوں میں تراش کر انھیں ایک دوسرے کے ساتھ گوند سے چپکا دیتے تھے اور دباکر انہیں موجودہ کاغذ کی شکل کا بنالیتے تھے - کاغذ کی ایجاد کے قبل اہل مصر اپنی کتابیں "پپیرس" ہی پر لکھا کرتے تھے - مصر کے بعد جس ملک نے تصویر نویسی میں نمایاں ترقی کی وہ شمالی امریکا کا جنوبی حصہ ہے جو 'میکسیکو' کہلاتا ہے- جب اہل یورپ پہلے پہل امریکا میں داخل ہوے تو انھیں ایک لال رنگ والی وحشی قوم سے مقابلہ کرنا پڑا - یہ قوم آسٹریلیا کی جنگلی قوموں سے بہ اعتبار تہذیب و تمدن کئی قدم آگے تھی - اس قوم کے لوگ آئین حکومت و نظام معاشرت سے روشناس تھے - ان کی سب سے نمایاں ترقیءتمدن کی مثال یہ ہے کہ یہ لوگ تصویر نویسی سے واقف تھے۔ یوروپی قومیں جب میکسیکو میں داخل ہوئیں تو دیکھا کہ وہاں کے سرخ وحشی باشندے شاہ باوط اور صنوبر کی چھال پر تصویریں بناکر تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے - آج کل وہاں کھدائی کا کام جاری ہے اور تصویر نویسی کی بہت سی یادگاریں

زمین کے نیچے سے برآمد ہو رہی ہیں۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا قدیم ہندی قوموں میں فن تصویر نویسی رائج تھا یا نہیں۔ مصر اور میکسیکو کی طرح یہاں زمین کے نیچے سے اب تک کوئی تصویر نویسی کی یادگار برآمد نہیں ہوئی ہے۔ تاہم بعض دیوتاؤں یا راکشسوں کی تصویریں زبان حال سے کہے دیتی ہیں کہ قدیم زمانے میں اہل ہند کو بھی تصویر نویسی میں کچھ شد بد تھی۔ سناتن دھرمیوں کا عقیدہ ہے کہ راون کے دس سر تھے، لیکن آریا سماجی اس قسم کی عجیب الخلقت مخلوق کے وجود سے منکر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ راون دیو ہیکل اور قوی الجثہ انسان تھا۔ اور طاقت جسمانی کے لحاظ سے وہ اکیلا دس آدمیوں پر بھاری تھا، لہذا دانشمندوں نے راون کی تصویر میں دس سر بنا دیے تاکہ معلوم ہوکہ وہ اکیلا دس آدمیوں کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ یہی حال چتر بھج یعنی چار ہاتھ والے دیوتاؤں یا دیبیوں کا ہے۔ چار ہاتھ سے ان کی فوق البشر قوت کا اظہار مقصود تھا۔ علم کے 'دیوتا' گنیش کو ہاتھی کا بہت بڑا سر عطا کیا گیا تھا۔ جس کا منشا غالباً ان کی اعلیٰ ذہنی اور دماغی قوت کو ظاہر کرنا تھا۔ اگر ان خیالات کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ قدیم اہل ہند کسی حد تک تصویر نویسی کے ذریعے سے اظہار خیالات کرلیتے ہوں گے

رموز تصویری کا انکشاف

آج کل تمام ممالک متمدنہ میں ایک نیا سررشتہ قائم ہوا ہے، جو محکمۂ آثار قدیمہ کہلاتا ہے اور جس کا منشا یہ ہے کہ قدیم تہذیب و تمدن کی یادگاریں قائم اور محفوظ رکھی جائیں اور اسلاف کی شاندار تاریخ اور روایات کو زندہ کیا جائے۔ قدیم تاریخ کے تسلسل میں جہاں جہاں کھانچے پڑے ہوے تھے وہ اب آثار قدیمہ کی مدد سے پر کیے جارہے ہیں۔ اسی محکمے کی ایک شاخ "حضریات" بھی ہے۔ 'حضر' کے معنی زمین کھودنے کے ہیں۔ اس شعبے کے زیر نگرانی زمین کھود کر قدیم شاہی محلوں، مندروں، مقبروں اور دیگر عمارتوں کے کھنڈر اور قدیم تہذیب و تمدن کی متنوع یادگاریں بر آمد

کی جاتی ھیں- چنانچه مصر کی حضریات سے بہت سے پتھر اور تابوت وغیرہ پر منبت کاری کے نمونے دستیاب ھوے ھیں- ان کے علاوہ قدیم مندروں' مقبروں اور محلوں کے شکستہ در و دیوار پر رنگی ھوئی تصویریں بھی پائی گئی ھیں - بہت دنوں تک لوگوں کا خیال تھا کہ یہ تمام منبت کاریاں اور تصویریں محض آرائش اور زیبائش کے لئے بنائی گی تھیں- لیکن جب چند سر بفلک اھرام مصری توڑے گئے تو ان کے اندر سے بادشاھوں کی لاشیں اور ان کے آس پاس ضروریات زندگی کی مختلف اشیا بر آمد ھوئیں - قدیم اھل مصر کو اس قسم کا مسالا معلوم تھا' جس سے وہ لاشوں کو سڑنے گلنے سے محفوظ رکھتے تھے- ان لاشوں کو "ممی" کہتے ھیں- ممیوں کے پاس پیپرس کے پلندے بھی پاے گئے جو تصاویر سے بھرے پڑے تھے - اب لوگوں کو معلوم ھوا کہ یہ پلندے در اصل کتابیں ھیں اور تصویریں محض نمائش اور آرائش کے لئے نہیں بنائی گئی تھیں بلکہ انھیں کے ذریعے پہلے خیالات ضبط تحریر میں لائے جاتے تھے' تصاویر ھی گویا حروف یا الفاظ تھیں' جن کی ترکیب سے جملے لکھے جاتے تھے- اس واقعے کے اکتشاف کے بعد بھی لوگ ان تصویری تحریروں کے پڑھنے سے قاصر تھے - بڑے بڑے علما نے ان کے پڑھنے کی جان توڑ کوششیں کیں لیکن ناکام رھے - عرصۂ دراز کے بعد حسن اتفاق سے سکندریہ کے نزدیک بمقام 'روزیطه' نپولین اعظم کے ایک فوجی عہدے دار کو پتھر کی ایک بہت بڑی لوح ملی' جو کچھہ عرصے بعد انگریزوں کے ھاتھہ آئی - چنانچہ آج کل وہ پتھر ' نوادر خانۂ برتانی' لندن میں محفوظ ھے - جگہ کی مناسبت سے اس پتھر کو "حجر روزیطه" کہتے ھیں - اس حجری لوح پر ایک ھی عبارت تین قسم کی کتابت میں تحریر ھے - ایک تو قدیم "تصویری تحریر" ھے' جو بہت مقدس سمجھی جاتی تھی اور صرف پیشوایان مذھب اسے استعمال کرتے تھے - دوسری "دیہاتی تحریر" ھے جو مصر کی کاروباری زبان میں لکھی ھوئی ھے' تمام سیاسی' معاشرتی اور کاروباری معاملات اسی طرز تحریر میں لکھے جاتے تھے - "دیہاتی تحریر" فی الحقیقت تصویر نویسی ھی کی ایک ترقی پائی ھوئی صورت

تھی - لہذا وہ زیادہ سہل النقش بھی تھی - لیکن پیشوایان مذھب کی قدامت پسندی نے اُنھیں "تحریر تصویری" ھی کا پابند رکھا - تیسری تحریر یونانی حرفوں اور زبان میں ھے' جسے یورپ کے علما عموماً جانتے ھیں- واضح رھےکہ قدیم مصری حکومت کے انحطاط کے زمانے میں ایرانیوں نے مصر پر حملہ کیااور اس پر قابض ھو گئے - لیکن زمانے نے ایک اور پلٹا کھایا اور ایرانیوں کو سکندر اعظم نے شکست دی اور اپنے نام سے ایک شہر سکندریہ آباد کیا - اب مصر پر یونانیوں کا پورا تسلط ھوگیا- چونکہ سکندرکی کوئی اولادنہ تھی' اس لئےاس کے مرنے کے بعد اس کے فوجی عہدےداروں نے اس کی وسیع مملکت اور علاقہ جات مفتوحہ کا آپس میں حصہ بخرہ کر لیا - چنانچہ مصر میں سکندر کا جانشین ' بطلیموس اول ' ھوا اور وھاں کی حکومت اسی کے خاندان میں منتقل ھو تی رھی- مورخین کا قول ھے کہ ' بطلیموس ' پنجم کے زمانے میں حجر روز یطہ نصب کیا گیا تھا - یہی وجہ ھے کہ اس کی آخری تحریر یونانی میں ھے - یونانی حروف میں جو عبارت کندہ تھی 'اس کو علما نے بہ سہولت تمام پڑھ لیا اور اس کی مدد سے بڑی کد و کاوش کے بعد " دیہاتی تحریر " پڑھنے میں بھی کامیاب ھوے - زاں بعد " دیہاتی تحریر" کی مدد سے ڈاکٹر ٹامس ینگ نے چند تصویری نشانات و علامات کی آواز یا مساوات دریافت کي ' لیکن اتنی سی دریافت تصویر نویسی کے راز سر بستہ کو منکشف نہ کر سکی' باالآخر ژین فراں کو ' ' شمپولین ' نے بڑی دماغ سوزی اور جگر کاوی کے بعد ان نقوش کے پڑھنے کا گُر معلوم کر لیا - اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ دریافت کر لیا کہ کونسی تصویر کس آواز یا کس لفظ کی مظہر ھے - مثلاً اس نے معلوم کیا کہ حجر روز یطہ ' کے کتبے میں عقاب کی تصویر سے (اَ) پاؤں کی تصویر سے (ب) اُلو کی تصویر سے (م) چوزے کی تصویر سے (ی) کی آواز کا اظہار ھوتا ھے - کہیں کہیں کسی تصویر سے مفرد آواز کے بجائے کوئی پورا لفظ ظاھر کیا گیا ھے - جیسے دونوں ھاتھ بلند کئے ھوے انسان کی تصویر سے لفظ عبادت یا پرستش مراد ھے'

اس کے قبل بعض تحقیق دوست ماہر لسانیات، تصویری خط میں لکھی ہوئی چند فہرستوں کو جن میں بادشاہوں ' شہزادوں اور اعیان حکومت کے نام درج تھے پڑھنے میں کامیاب ہو چکے تھے - ان فہرستوں میں بادشاہوں کے نام امتیاز کے لئے بیضوی حلقوں میں درج تھے- بہر حال مختلف فہرستوں اور حجر روز یطہ کا باہمی مقابلہ کر کے علما نے تصویری کتابت کے پڑھنے کا گُر معلوم کر لیا' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آجکل تصویری کتبے یا کتابیں نہایت آسانی سے پڑہ اور سمجھہ لی جاتی ہیں - ' حجر روزیطہ ' کا کتبہ پڑھنے والوں کا بیان ہے کہ اس میں تفصیلی ہدایات درج ہیں کہ ایک جلیل القدر بادشاہ کا جشن سالگرہ کس طرح منانا چاہئے - علاوہ بریں اہرام مصری کے اندر مقابر میں بہت سی تصویر نویسی کی کتابیں پپیرس پر لکھی ہوئی پائی گئی ہیں - ان کے پڑھنے میں بھی علما نے کامیابی حاصل کرلی ہے- ان کتابوں میں سب سے معر کہ آرا وہ مقدس مذھبی کتاب ہے ' جسے ' کتاب الموتیٰ ' کہتے ہیں - اور جو آجکل برطانوی نوادر خانے میں محفوظ ہے - اس کتاب کی بہت سی نقلیں کی گئی ہیں-اس کی چند عبارتیں مقبروں کی دیواروں پر لکھی ہوئی ملتی ہیں-کہیں کہیں ممیوں کے نزدیک یہ کتاب کُلّاً یا جزءاً رکھی ہوئی پائی جاتی ہے جن میں ہدایات درج ہیں کہ متوفی کو حیات بعد الممات میں زیر زمین کس طرح زندگی بسر کرنی چاہئے - الغرض اس کتاب سے قدیم مصریوں کے مذھبی اعتقادات اور اور اُن کی طرز بود و باش پر کافی روشنی پڑتی ہے- اس مشہور کتاب کے علاوہ تصویر نگاری کی اور بہت سی کتابیں پپیرس پر لکھی ہوئی ملی ہیں' جو بالعموم دیو پری کے قصوں ' رزمی نظموں ' طب ' ہیئت اور اخلاقیات وغیرہ پر مشتمل ہیں-آئے دن مصری حضریات سے بہت سی اشیا بر آمد ہو رہیں ' جن کی مدد سے قدیم مصری تاریخ کے کھانچے بھرے جارہے ہیں —

خطوطی تصویر نویسی

بیانات متذکرۂ بالا سے معلوم ہوا کہ قدیم مصر میں فن تصویر نویسی منتہائے کمال کو پہنچ گیا تھا - لیکن تصاویر کے ذریعے

مافی الضمیر کے اظہار کا طریقہ بے شمار دقتوں اور زحمتوں سے مملو تھا۔ ہر شخص تصویر کھینچنے پر قادر نہیں ہوسکتا تھا۔ کیونکہ اس کے لئے مشق اور مہارت کی بے حد ضرورت تھی، صرف فنکار ہی اسے انجام دے سکتے تھے۔ لیکن ان کو بھی چند معمولی باتوں کے اظہار کے لئے بہت سی پیچیدہ اور مشکل تصویریں کھینچنی پڑتی تھیں، جس کے لئے بہت وقت اور محنت کی ضرورت تھی۔ اس لئے لوگوں کی توجہ سہولت اور اختصار کی جانب مائل ہوئی۔ بعض مہذب قوموں کے عقلا نے سوچنا شروع کیا کہ کم وقت میں اور آسانی کے ساتھ واقعات قلم بند کرنے اور خیالات ضبط تحریر میں لانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بالآخر سامری قوم کی قوت اختراعیہ نے بہ مصداق "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" ایک نیا خط ایجاد کیا، جسے "تحریر پیکانی" کے نام سے موسوم کرنا مناسب ہے اس کی وجہ تسمیہ آگے بیان ہوگی۔ بہرحال سامریوں کی پیہم کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادائے مطلب اور تبادلۂ خیالات کے لئے بجائے پیچیدہ تصاویر کے آسان اور سہل النقش اشکال، مخطط، استعمال کئے جانے لگے۔ سامری قوم عراق میں آباد تھی، جو میدانی ملک ہے اور جہاں زمین سنگلاخ نہ ہونے کے باعث پتھر آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا۔ سامریوں نے بہت سے شاندار اور بارونق شہر بسا لئے، جہاں کی عالی شان عمارتیں بجائے پتھر کے اینٹ سے بنی ہوئی تھیں۔ سامریوں نے مٹی کی تختیوں اور استوانوں پر کتبات کندہ کرائے۔ لکھنے کا قاعدہ یہ تھا کہ گیلی مٹی کی تختیوں اور استوانوں پر کسی سخت نکیلے اوزار سے مخطط اشکال کھینچی جاتی تھیں، جن کی وجہ سے مٹی خط کے سرے پر دونوں جانب جمع ہو جاتی تھی اور نشانات تیر کے سرے جیسے معلوم ہوتے تھے۔ اسی مناسبت سے یہ طرز تحریر "پیکاں نویسی" کہلاتی تھی۔ اشکال اور خطوط کندہ کرنے کے بعد تختیاں اور استوانے دھوپ میں خشک کرائے جاتے تھے اور پھر پژاوے میں پکالئے جاتے۔ الغرض تصویر نویسی کا پیچیدہ اور دقت طلب طریقہ رفتہ رفتہ بالکل متروک ہو گیا۔ اب تحریری علامات چڑیوں اور جانوروں کی

شکلوں اور گنجلک تصاویر کے بجائے آسان اور سادہ اشکال میں تحویل ہو گئیں - پھر کیف سامریوں سے اہل 'اسوریا' نے اور پھر ان سے مختلف قوموں نے "پیکان نویسی" سیکھی —

جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں' اُس وقت ایتھنس کا وجود بھی نہ تھا اور روما کی سات پہاڑیاں ابھی گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھی - لیکن اس وقت سر زمین عراق میں علم و ہنر کا چشمہ اُبل رہا تھا - وہاں بابل اور نینوا جیسے شہرۂ آفاق شہر آباد تھے - جہاں عظیم‌الشان کتب خانے قائم تھے ' جن کی الماریاں اینٹوں' تختیوں اور استوانوں پر لکھی ہوئی بے شمار کتابوں سے بھری پڑی تھیں' تاہم اس زمانے میں لکھے پڑھے اوگوں کا قحط تھا ' پڑھنے والے کمیاب تھے اور لکھنے والوں کی تعداد تو اُنگلیوں پر گنی جاسکتی تھی - کیونکہ اس وقت تک حروف تہجی کا نظام ایجاد نہیں ہوا تھا ' جن کی ترکیب سے کسی زبان کے ہزاروں لاکھوں الفاظ تحریر میں لائے جاسکتے ہیں - اُس زمانے میں ہر لفظ کے لیے ایک علحدہ علامت تھی اور اہل علم کے لیے ہزاروں الفاظ کی ہزاروں جداگانہ علامات یاد رکھنی پڑتی تھیں - مختلف قوموں نے 'تصویر نویسی' کو ترک کر کے سہل النقش علامات اختیار کرلی تھیں ' لیکن ہر جگہ مختلف الفاظ کے لیے مختلف مفرد علامات تھیں - ہر زبان کے کاتبوں اور محرروں کو ہزاروں علامتیں سیکھنی اور یاد رکھنی پڑتی تھیں - چنانچہ ملک چین تو آج کل کے متمدن دور میں بھی اُسی قدیم زینے پر ہے اور ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاسکا ہے - آج دنیا کی تمام السنہ میں حروف تہجی مستعمل ہیں' جن کی تعداد ۱۹ اور ۵۵ کے درمیان ہے - کسی موجودہ زبان میں ۵۵ سے زیادہ حروفی علامات نہیں ہیں' الا چینی زبان' جہاں ۲۱۴ مفرد اصوات اور ۷۹۷۸۹ الفاظ کی علامات مستعمل ہیں' بیچارے رفتنے چینی

طلبہ کو ہزاروں علامتیں سیکھنی پڑتی ہیں، تب کہیں وہ پڑھنے لکھنے پر قادر ہوسکتے ہیں —

جس طرح تصویری تحریر کی بے شمار یادگاریں مصر میں زمین سے کھود کر بر آمد کی گئی ہیں، اُسی طرح عراق میں پیکان نویسی کی یادگاریں نکل رہی ہیں - یہ یادگاریں مٹی کے اُستوانوں، تختیوں اور اینٹوں کی شکل میں پائی جاتی ہیں، جن پر مخطط شکلیں بنی ہوئی ہیں - یہ بابل اور نینوا کی قدیم شوکت و عظمت کا زبان حال سے اظہار کرتی ہیں - یورپی محقق ہمیشہ سے اس تلاش اور جستجو میں لگے ہوئے تھے کہ یہاں بھی حجرروز طہ کی طرح دو تین قسم کی تحریر والا کوئی کتبہ مل جائے تو وہ تحریر پیکانی کو پڑھنے اور قدیم معموں کو حل کرنے کی کوشش کریں لیکن کوئی ایسا کتبہ دستیاب نہیں ہوتا تھا، لوگ مایوس ہوگئے تھے اور پیکانی تحریر کی معما کُشائی ناممکن خیال کی جاتی تھی - آخر حسن اتفاق سے یا تلاش و تفحص کے نتیجے کے طور پر " حجر روز طہ " جیسے تین قسم کے کتبات پر مشتمل ایک پتھر کی چٹان ایران میں مل گئی - سرہنری رالنسن نے جو ایران کی سیاحت کر رہا تھا، بہ مصداق " جو ئندہ یابندہ " ایک اونچی چٹان پر ایک کتبہ دیکھا جو تین قسم کی تحریروں میں کندہ تھا - چونکہ یہ چٹان بہت بلندی پر تھی اور ارتفاع ڈھلواں ہونے کے بجائے عمودی تھا اور کوئی بلند سے بلند سیڑھی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی، اس لیے ہنری رالنسن دوسرے راستے سے پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا اور ایک باہر نکلی ہوئی چٹان سے ڈوری باندھ کر نیچے لٹکا اور بڑی مشکل سے اُس جگہ پر پہنچا، جہاں کتبہ نصب تھا - اُس نے نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے تینوں کتبوں کا چربہ اُتار لیا - یہ پتھر بھی " حجر روز طہ " کی طرح اُس جگہ کی مناسبت سے جہاں وہ پایا گیا " حجر بیستون " کہلاتا ہے - علمائے لسانیات بہت دنوں تک اس کے پڑھنے کی کوشش کرتے رہے اور پندرہ سولہ محققوں کی محنت اور غور و خوض کا نتیجہ

یہ ھوا کہ اس تحریر کی تمام مشکلات حل ھوگئیں۔ اور نہ صرف سنگ بیستون کا کتبہ بلکہ اسی قسم کے اور کتبے بڑی آسانی سے پڑھ لئے گئے۔ پیکانی کتبوں کی بدولت کالدانی، سامری اور آشوری قوموں کے کارنامے جو آج تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ھوے تھے۔ روز روشن کی طرح اب دنیا پر ظاھر ھوگئے۔ اھل بابل کی تاریخ کا بیش قرار مواد ان کتبوں سے مہیا ھوا ھے۔ قوموں کا تھوڑا بہت تذکرہ کہیں کہیں توریت میں پایا جاتا تھا لیکن اب ان مذھبی روایات نے تاریخی حیثیت اختیار کرلی ھے۔ ''حجر بیستون'' دیگر نوادرات کی طرح برطانی نوادر خانۂ لندن میں محفوظ رکھا ھوا ھے —

بانیان پیکان نویسی کی مختصر تاریخ

جن قوموں نے پیکان نویسی ایجاد کی، یا جن میں یہ طرز تحریر رائج تھی ان کی مختصر تاریخ دلچسپی سے خالی نہ ھوگی۔ لہذا ذیل کی چند سطریں ان کے مجمل تذکرے کے لئے وقف کی جاتی ھیں۔ ان قوموں کی صحیح تاریخ نسیاً منسیا ھوچکی تھی۔ لیکن پیکانی تحریروں سے جو عراقی حضریات سے بر آمد ھوئی ھیں۔ ان کے عظیم‌الشان کارناموں پر روشنی پڑتی ھے۔ پیکان نویسی کی ایجاد کا سہرا قوم سامری کے سر ھے۔ یہ قوم عراق کے جنوبی حصے میں آباد تھی، جسے توریت میں کالدیا کہا گیا ھے۔ لیکن انجیل میں یہ خط سامری یا عکادی* ملک سے نامزد کیا گیا ھے۔ سامری یا عکادی تورانی النسل تھے اور توران سے یہاں آکر آباد ھوے تھے۔ فن زراعت میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ قلبہ رانی و آبیاری کے ذریعے انھوں نے عراق کو اس قدر سرسبز و شاداب بنا لیا کہ وہ ملک باغ ارم بن گیا۔ فن تعمیر میں بھی انھیں اچھی مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے عظیم الشان قصر و محل، مندر، مقبرے تعمیر کرائے، جن کے کھنڈر آج بھی زیر زمین مدفون پائے جاتے ھیں۔ سامریوں کی جو شبیہیں حضریات سے برآمد ھوئی ھیں ان سے معلوم ھوتا ھے کہ ان کے داڑھی موچھ بہت کم کم ھوتی تھی، ان کی شکل صورت

---

* تازہ تحقیقات کی رو سے عکادیوں کا آریائی نسل سے ھونا زیادہ قرین قیاس ھے —

چینیوں اور جاپانیوں سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی - حضرت مسیح سےچار ہزار سال قبل اُن کی زبان بہت ترقی کرگئی تھی اور وہ اس زمانے میں بہ لحاظ فصاحت و بلاغت اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے - تعمیر و فلاحت کے علاوہ سامری قوم علوم و فنون کی بھی سرمایہ دار تھی - اہل مصر کی طرح سامری بھی تصویر نویسی سے واقف تھے - پیکان نویسی کی ایجاد کے قبل وہ تصاویر کے ذریعے خیالات و واقعات ضبط تحریر میں لاتے تھے - لیکن زمانے نے پلٹا کھایا - تین ہزار آٹھ سو سال قبل مسیح ان پر ایک دوسری نسل کے لوگ حملہ آور ہوے، جن کی داڑھیاں بڑی اور گھنی تھیں یہ لوگ سامی‌النسل تھے - اس فاتح قوم نے سامریوں کے علم و فضل کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کو خارج‌البلد نہیں کیا بلکہ وہیں رہنے دیا - اور ان کے ساتھ شادی بیاہ بھی کرنے لگے - سامریوں سے سامی فاتحوں نے تہذیب و تمدن کا سبق حاصل کیا - کئی پیڑھیوں کے میل ملاپ سے یہ دونوں نسلیں خلط ملط ہوگئیں۔ یہ مخلوط نسل آگے چل کر ایک نئی قوم بن گئی - جسے "اہل بابل" کہتے ہیں - ان کا پایۂ تخت دریاے فرات کے کنارے شہر بابل تھا - سامریوں کی قدیم زبان جس میں اصول مذہب اور قوانین ملکی لکھتے ہوے تھے عرصہ دراز تک قائم رہی۔ چونکہ فاتح سامریوں کی اپنی زبان شستہ اور فصیح نہ تھی اس لئے انھوں نے مفتوح سامریوں کی زبان کو جس کا دامن علمی اور فنی جواہر پاروں سے معمور تھا بڑے شوق سے سیکھا - سامیوں نے صرف و نحو اور لغت کی عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کیں تاکہ اجنبیوں کو ان کی زبان سیکھنے میں سہولت ہو - یہ تمام کتابیں پیکانی تحریر میں لکھی گئی تھیں، جن میں سے اکثر آج برطانوی عجائب خانے میں موجود ہیں۔ جس طرح دور حضر میں یورپ کی تقریباً تمام زبانوں کی تحریر لاطینی حروف میں ہوتی ہے اسی طرح اس زمانے میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ عراق کے گرد و نواح کی تمام اقوام اپنی اپنی زبانوں کی تحریر میں سامریوں کی ایجاد کردہ پیکانی علامات استعمال کرتی تھیں، یہ قومیں حسب ذیل تھیں : آسوری،

'عکادی'، 'شامی'، 'کنعانی'، 'عیلامی'، 'قستائی'، 'ایرانی'، 'مادی'* وغیرہ - کچھ عرصے بعد 'شام' اور 'کنعان' کے ایک حصے پر بنی اسرائیل مصر سے آ کر قابض ہو گئے - اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سامریوں اور سامیوں نے اختلاط سے اہل 'بابل' یا بابلی قوم معرض وجود میں آئی تھی - دو ہزار سال قبل مسیح سلطنت بابل پر ایک نامور بادشاہ حکمراں تھا - اس کے عہد حکومت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اعزہ و اقارب کے ساتھ 'کالدیا' کے شہر 'اور' کو چھوڑ کر اپنے گلوں کے ساتھ صحرا کے دوسرے جانب گشت لگاتے ہوئے نکل گئے۔

جس وقت 'بابل' میں فن تعمیر' زراعت' تجارت' صنعت و حرفت اور علوم و ہنر کو فروغ ہو رہا تھا' اس وقت وہاں آبادی بھی سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی تھی بالآخر' بابل' میں اس کے تمام فرزندوں کے لئے کافی جگہ اور گنجائش باقی نہیں رہی' لہذا فاضل آبادی بحیثیت نو آباد کار شمال کی جانب ہجرت کر گئی - وہاں 'دجلہ' اور 'فرات' کے درمیانی خطے میں مستعمرات قائم ہوئے اور بڑے بڑے شہر بسائے گئے' جن میں سب سے زیادہ مشہور 'نینوا' کا شہر تھا جو دجلے کے کنارے واقع تھا - یہاں بھی 'بابل' کی طرح بڑی بڑی عالیشان عمارتیں' وسیع چبوتروں پر انیٹ سے بنائی گئی ہیں - اگرچہ یہاں پتھر افراط سے دستیاب ہوتا تھا' تاہم ان نو آباد کاروں کا جذبۂ قدامت پسندی اس قدر قوی تھا کہ وہ تعمیر کے لئے انیٹ کو پتھر پر ترجیح دیتے تھے - کئی صدیوں کے بعد اہل نینوا اس قدر طاقتور ہو گئے کہ انہوں نے بابلی حکومت کا جوا اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا اور ایک نئی آزاد حکومت کی داغ بیل

---

* Media کی اصل قدیم فارسی میں "ماد" تھی' بعد کی فارسی میں قدیم فارسی کی 'ذ' بدل کر 'ہ' ہو گئی یعنی ماذ "ماہ" ہو گیا۔ مگر عربوں نے اس تبدیلی سے پہلے ہی اس لفظ کو اپنی زبان میں لے لیا تھا چنانچہ Median Sword کو سیف ماذی کہا ہے —

قائی جو حکومت ' آسوری ' کہلا نے لگی - کیونکہ ان کا سب سے بڑا دیوتا ' آسور ' تھا آسوری حکومت اٹھارھویں صدی قبل مسیح میں قائم ہوئی تھی - اس کے بعد ' بابلی ' اور آسوری حکومتیں ایک دوسرے کی حریف بنگئیں اور باہم دست و گریباں رهنے لگیں - چودھویں صدی قبل مسیح میں دونوں حکومتوں کے درمیان ایک سخت معرکہ آرائی ہوئی اور دونوں جانب کے هزاروں آدمی کام آئے - اس خونریز جنگ کا نتیجه یه هوا که بابل کی قسمت کا همیشه کے لئے فیصله هو گیا اور اسوریا کو فتح نصیب هوئی - چنانچه بابل کی حکومت آسوری حکومت کے زیر نگیں آ گئی —

حال هی میں اس مقام کی حفریات سے جہاں کسی زمانے میں قدیم شہر نینوا واقع تھا ایک تختی مع کتبه بر آمد هوئی هے جس میں توریت کا وہ مشہور قصه درج هے جس سے انگریزی مدرسے کا بچه بچه واقف هے' که کس طرح آسوریا کے بادشاہ ' سناخرب ' نے ' یہودا ' کے فرماں روا حذیقیه پر ٹڈی دل فوج کے ساتھ حمله کیا - اس لئے که مؤخرالذکر نے شاہ مصر کے ورغلا نے سے خراج بھیجنا بند کردیا تھا - لیکن بغیر کسی لڑائی کے 'سناخرب' کی تمام فوج کسی وبا یا بلائے ناگہانی سے تباہ و برباد هو گئی - اسی ' سناخرب ' کا نبیرہ ' اشور بنی بعل ' بڑا نامی بادشاہ گذرا هے - وہ نہ صرف بڑا سورما اور صیدافگن بلکه علم دوست بھی تھا - اس نے بابل کے کتب خانوں اور مندروں سے بہت سی کتابیں فراهم کیں - ان کی ترتیب و تدوین کے لئے وافر عمله مقرر کیا - ایک تالیف و ترجمه کا سرشته بھی اعلی پیمانے پر قائم کیا - بہت سی کتابیں تصنیف هوئیں اور غیر زبانوں سے کثیر التعداد کتابوں کا ترجمه بھی کیا گیا - ' اشور بنی بعل ' کی غیر معمولی مستعدی اور علمی سر پرستی کا نتیجه یه هوا که اس کے قصر میں ایک عظیم‌الشان کتب خانه قائم هو گیا ' جو دنیا کے تمام معاصر کتب خانوں میں سب سے بڑا تھا - آج اس کتب خانے کی بیسیوں کتابیں برطانوی نوادر خانے میں موجود هیں' جو

عراق سے کھود کر لائی گئی ھیں - یہ تمام کتابیں پیکانی خط میں ھیں ان سے ' بابل ' اور ' نینوا کی قدیم تاریخ کے واقعات معلوم ھوتے ھیں اور ان کی عظمت اور جبروت کی یاد تازہ ھو جاتی ھے - یہ کتابیں کاغذ پر لکھی ھوئی نہیں ھیں بلکہ جیسا کہ اوپر کئی بار بیان ھو چکا ھے' مٹی کی تختیوں ' اینٹوں اور استوانوں پر پیکانی خطوط میں کندہ ھیں - کہا جاتا ھے کہ آسوری زبان میں چھہ سو پیکانی علامات مستعمل تھیں ' لیکن جتنی تحریر پیکانی کی یادگاریں اس وقت برطانی نوادر خانے میں محفوظ ھیں ان میں تقریباً تین سو علامتیں پائی جاتی ھیں - چوتھی صدی قبل مسیح میں ماذیوں نے ' نینوا ' پر حملہ کیا ' ملک کو تاخت و تاراج سے برباد کردیا' خاص شہر ' نینوا ' کو دو سال کے لگاتار محاصرے کے بعد تسخیر کیا اور اس کو نذر تیغ و آتش کر دیا - کتب خانے کی عمارتیں بھی جلادی گئیں - اگر کتابیں کاغذ کی ھوتیں تو معاً جلکر خاک کے ڈھیر بن جاتیں اور ' بابل ' اور ' نینوا ' کی عظمت ھمیشہ کے لئے مٹ گئی ھوتی' لیکن خوش قسمتی سے کتابیں مٹی کی تختیوں اور استوانوں پر کندہ تھیں ' جنھوں نے آگ کا مقابلہ کیا اور آج صدیوں تک زیر زمیں مدفون رھنے کے بعد بر آمد ھو کر اپنے لکھنے اور لکھانے والوں کا نام دنیا میں روشن کر رھی ھیں —

حروف تہجی کی ایجاد

قدیم زبانیں جب ابتدائی حالت میں تھیں تو ان میں الفاظ کا ذخیرہ کم تھا - معاشرت سادہ ' ضروریات زندگی تھوڑی اور معلومات کم تھیں - اس لئے تین چار سو لفظوں سے کام چل جاتا تھا - آسوری جیسی ترقی یافتہ زبان میں صرف چھہ سو لفظ تھے اور لکھنے کے لئے اتنی ھی مخطط علامتیں مقرر کر لی گئی تھیں - الغرض لغات کی کمی کے باعث بہت عرصے تک علامات پیکانی یا اشکال مخطط سے تحریر کا کام چلتا تھا - لیکن جب علوم و فنون نے اور ترقی کی ' تہذیب اور تمدن کی رفتار تیز ھوئی ' ضروریات زندگی میں اضافہ ھوا اور اجتماعی زندگی کا نظام بہت پیچیدہ ھو گیا تو

خود حیات انسانی و نیز عالم خارجی کے متعلق ذخیرۂ معلومات اس قدر وسیع ہوگیا اور ہر نئی شے اور نئے خیال کے لئے نئے نئے لفظ وجود میں آئے اور اس طرح الفاظ کی تعداد اتنی بڑہ گئی کہ تمام الفاظ کے لئے علحدہ علحدہ علامتیں مقرر کرنا اور کل علامتوں کو دماغ میں محفوظ رکھنا محال ہوگیا - لہذا کسی سہل طریقۂ تحریر کی دریافت کی جانب دانشمندوں کی توجہ مبذول ہوئی - سب سے پہلے اس جانب مصر کے مذہبی پیشواؤں کا ذہن رجوع ہوا - اگرچہ اس وقت مصر نے بھی ترقی کرکے سہل‌النقش "دیہاتی" طرز تحریر اختیار کرلی تھی، جو تحریر پڑھائی سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی - اور سیاسی امور اور معاشرتی اور کاروباری معاملات "دیہاتی" طریقے پر ضبط تحریر میں لائے جاتے تھے - لیکن تصویر نویسی نے اپنی قدامت کے باعث مذہبی تقدس حاصل کرلیا تھا - اس لئے تمام مذہبی اصول احکام و اوامر و نواہي کے لئے تصویر نویسی ہی کا طریقہ کام میں لایا جاتا تھا - چنانچہ حروف تہجی کی ایجاد کے قبل تک مصر کے مذہبی پیشوا قدیم تصویر نویسی ہی کے پابند تھے- اس وقت تک ان کے لکھنے کا طریقہ‌یہ تھا کہ کسی تصویر سے وہ کوئی لفظ یا فقرہ ظاہر کرتے تھے، جیسے دونوں ہاتھ بلند کئے ہوے انسان کی تصویر لفظ پرستش کی مظہر تھی، لیکن اب انھوں نے مفرد اصوات کی ایک فہرست مرتب کی، جن کی ترکیب سے الفاظ اور فقرے بنے ہوے تھے اور بے شمار تصویری علامات میں سے صرف اتنی ہی تصویریں منتخب کرلیں جتنی مفرد اصوات کی تعداد تھی اور ہر تصویری علامت ایک مفرد صوت کی مظہر قرار پائی- جیسے عقاب کے پر کی تصویر سے آ، پاؤں کی تصویر سے 'ب'، اُلو کی تصویر سے 'م' اور چوزے کی تصویر سے 'ی' کی آواز ظاہر کی جانے لگی - اسی طرح ہر آواز کے لئے ایک تصویر مقرر تھی- اب اِنھیں چند تصویری علامات کے اتصال و ترکیب سے تمام الفاظ لکھے جانے لگے- لیکن باوجود ان تمام سہولتوں کے مصري طرز تحریر مشکل تھی، کیونکہ تصویریں سادہ اور سہل‌النقش نہ تھیں، اس لئے اُس زمانے کی متمدن قومیں سہل‌النقش علامات کی دریافت کی

طرف متوجہ ہوئیں —

سہل النقش علامات کی دریافت میں فونیقیوں نے بڑی ترقی دکھائی۔ فونیقی قوم ایشیائے کوچک کے مغربی حصے میں بحر روم کے ساحل پر آباد تھی۔ یہ لوگ جہاز رانی میں بڑے مشاق تھے اور انہیں کے ہاتھ میں ان سب ملکوں کی تجارت تھی، جن کے ساحلوں سے بحر متوسط کی موجیں ٹکراتی تھیں۔ علاوہ بریں بحر اوقیانوس بھی ان کی جہاز رانی کی جولانگاہ اور یورپ کے مغربی ممالک ان کی تجارتی آماجگاہ تھے۔ چنانچہ تاریخ انگلستان اس امر کی شاہد ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں فونیقی تجار قلعی کی تجارت کی غرض سے برطانیہ کے جنوب میں جزیرہ سلی تک جا پہنچے تھے۔ علوم و فنون میں بھی انہوں نے اچھی خاصی ترقی کرلی تھی۔ عام طور پر فونیقی قوم حروف تہجی کی موجد کہلاتی ہے۔ ان کے ہاں بھی پہلے تصویر نویسی کا رواج تھا۔ لیکن کچھ زمانے بعد وہ جانوروں، درختوں، مکانوں اور دیگر مادی اشیا کے اظہار کے لئے نہایت سہل النقش اور سادہ علامتیں استعمال کرنے لگے تھے، جو پیکانی تحریر سے بھی زیادہ آسان تھیں۔ اب انہوں نے اور ترقی یہ دکھائی کہ ان سادہ علامتوں سے چند علامتیں منتخب کرلیں۔ اور اُن سے اشیا یا الفاظ کے بجائے مفرد اصوات مراد لینے لگے۔ اور ان صوتی علامتوں کے مجموعے سے الفاظ ترکیب دینے لگے۔ الغرض ہر صوت کے لئے ایک سہل اور سادہ علامت مقرر کی گئی۔ لیکن علامت کے نام اور صوت میں کوئی مطابقت نہ تھی، بلکہ علامت کا وہی نام رکھ دیا جو تصویر نویسی کے زمانے میں اس چیز کا تھا۔ مثلاً 'الف' کے معنی بیل کے سر کے ہیں۔ فونیقی اس علامت سے 'ا' کی آواز تعبیر کرنے لگے، لیکن اس کا نام الف ہی رہنے دیا۔ اسی طرح 'بیت' یعنی خیمے یا چھولداری کی تصویر نے مختصر ہو کر ایک پڑی لکیر کی شکل اختیار کرلی تھی، اب 'بیت' کی اِسی علامت سے 'ب' کی آواز ظاہر کی جانے لگی۔ لیکن علامت کا نام بیت ہی رکھا گیا۔ اور یونانی زبان میں

بھی ' بیتا ' ھی کہلایا - جمل یعنی اونٹ کا اظہار اُس کے سر اور گردن کی تصویر سے کیا جاتا تھا اور قدیم مصری نیز اکثر سامی زبانوں میں اس لفظ کا تلفظ 'گیمل' تھا جس کے مقابل عربی میں " جیمل " ہوا ' جو " جمل " کی اصل ھے ۔ اب اسی علامت سے 'ج' کی آواز ظاھر کی جانے لگی - اکثر سامی زبانوں میں دانت کے لئے ' شین ' (عربی میں سن) کا لفظ ھے - تین دندانے بنا کر دانتوں کو قدیم مصری کتابت میں ظاھر کرتے تھے' بعد کو حرف کا نام بھی وھی رھا' جو اب تک چلا آتا ھے۔ 'س' اور 'ش' کا امتیاز کتابت میں بعد کو کیا گیا - لیکن امتداد زمانہ سے حروف کے پرانے ناموں میں مختلف زمانوں میں جا کر کچھہ تبدیلی ہوی ھوگئی ھے' ممالک مشرقیہ بعیدہ کی زبانوں کو چھوڑ کر دنیا کی بقیہ زبانوں کے حروف کے موجودہ نام قدیم مصری ناموں کی مسخ شدہ صورتیں ھیں- یہ یاد رکھنے کی بات ھے کہ ان سب زبانوں کی کتابت سامی حرفوں سے ماخوذ ھے ۔

اگرچہ مختلف زبانوں کے حروف مختلف الاشکال ھیں ' لیکن ان سب کی شکلیں ابتداء اُنھیں تصویری حرفوں سے نکلی ھیں اور اب ایسی بدل گئی ھیں کہ بالکل الگ الگ معلوم ھوتی ھیں- عام خیال ھے کہ فونیقیوں نے حروف تہجی ایجاد کئے' مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاھئے کہ وہ انھیں کتم عدم سے معرض موجود میں لائے' یا انھوں نے کسی بالکل نامعلوم شے کو دریافت کیا' بلکہ انھوں نے جو کچھہ کیا وہ صرف یہ تھا کہ قدیم مصور و مخطط طرز تحریر کو ترقی دیکر اُسے اُصول و ضوابط کے تحت لائے اور منتشر علامات کو ترتیب دے کر ایک نظام میں تحویل کیا' جو نظام حروف تہجی کہلایا۔

حروف تہجی کی اشاعت و ترقی

یہ امر مسلم ھے کہ پہلے پہل حروف تہجی کے ذریعے واقعات اور خیالات قلم بند کرنے والے فونیقی ھی تھے۔ ان سے یہودیوں نے یہ طرز تحریر سیکھی۔ چنانچہ عبرانی زبان کی تمام کتابیں بشمول احکام عشرۂ حضرت موسیٰ علیہ السلام حروف تہجی کے ذریعے لکھی گئیں - اس کے بعد نظام حروف تہجی عبرانی سے عربی میں منتقل ھوا - کئی صدیوں کے

بعد اسلام کے عروج کے زمانے میں جب عربوں کو ایران پر مذھبی اور سیاسی استیلا حاصل ھوا تو ایرانیوں نے فارسی زبان کے لئے عربی حروف اختیار کر لئے - پھر جب زمانے نے دوسری کروٹ لی اور فارسی بحیثیت فاتح ھندوستان میں داخل ھوئی تو ھندی زبان بھی فارسی خط میں لکھی جانے لگی - جب ان غیر سامی زبانوں کی کتابت عربی حرفوں سے ھونے لگی تو پہلے پہلے بعض قریب المخرج آوازیں ایک ھی حرف سے ادا کی جاتی تھیں۔ لیکن آگے چل کے اُسی ایک حرف پر نقطے یا مرکز لگا کر، یا نقطوں کی تعداد گھٹا بڑھا کر، یا اوپر نیچے رکھہ کر مختلف اصوات کا اظہار کیا جانے لگا - مثلاً ب، پ، ت، ٹ، ث، پانچ اصوات کے لئے پانچ جدا گانہ علامتیں ھونی چاھئے تھیں۔ لیکن سہولت کی خاطر صرف ایک پڑی لکیر میں نقطوں کے ھیر پھیر سے پانچ اصوات کی نمایندگی ھونے لگی - یہی حال ج چ ح خ یا ر ڑ ز ژ وغیرہ کا ھے - اردو نظام حروف تہجی میں اس کی متعدد مثالیں موجود ھیں- یوروپ میں بھی نظام حروف تہجی فونیقیوں ھی سے لیا گیا - پہلے یونانیوں نے فونیقیوں سے حروف تہجی سیکھے اور اپنی زبان کی ضروریات کے مطابق بعضے حرف زیادہ کر لئے یا گھٹا دیے- یونانیوں سے رومیوں نے نظام حروف تہجی سیکھا اور حروف کی شکل وصورت میں مناسب ترمیم کی - قرون وسطیٰ میں اساطین مسیحیت کی زبان رومی یا لاطینی تھی - چونکہ اُس زمانے میں تعلیم و تدریس زیادہ تر پیشوایان دین ھی کے تفویض تھی - اس لیے یوروپ کے تمام ممالک مثلاً فرانس، جرمنی، انگلستان، ھسپانیا وغیرہ میں مسیحی راھبوں اور بطریقوں نے لاطینی حروف تہجی کی اشاعت کی - چنانچہ آج کل تمام یوروپی زبانوں میں لاطینی حروف تہجی مستعمل ھیں - البتہ قوم 'سلاف' اور 'روسی' کے حروف تہجی رومی حروف تہجی سے کچھہ اختلاف رکھتے ھیں، جس کی وجہ حسب ذیل ھے : قوم 'سلاف' پہلے 'موریا' اور 'بوھیمیا' کے صوبوں میں آباد تھی - اس قوم کا مفصل تذکرہ 'آسٹریا ھنگری' کی تاریخ میں ملتا ھے - نویں صدی عیسوی میں اس قوم کے درمیان سیرل نامی ایک یونانی راھب

نے دین عیسوی کی اشاعت شروع کی - اس کی ان تھک کوششیں بار آور ہوئیں- اور قوم 'سلاف' حلقہ بگوش مسیحیت ہو گئی - 'سیرل' بڑے پایے کا عالم تھا اور غیر معمولی ادبی ذوق رکھتا تھا - سلافی زبان کے لیے اُس نے یونانی طرز پر ایک علحدہ نظام حروف تہجی قائم کیا اور سلافیوں کو اس کی تعلیم دی - روسیوں نے بھی جن کی نسل قوم سلاف ھی کی تفریع ھے' اسی نظام حروف تہجی کو سیکھا - یہی وجہ ھے کہ سلافی اور روسی حروف تہجی لاطینی حروف تہجی سے بالکل مختلف اور یونانی حروف تہجی سے مشابہ ھیں —

آج کل بعض زبانوں میں ایک سے زیادہ قسم کے حروف مستعمل ھیں - اگرچہ عربی' فارسی' اردو زبانوں میں صرف ایک ھی قسم کے حروف طباعت و کتابت دونوں میں استعمال کئے جاتے ھیں لیکن اکثر زبانوں کی کتابیں جس قسم کے حروف میں لکھی جاتی ھیں وہ حروف عام طور پر لکھنے کے کام نہیں آتے - چنانچہ تقریباً تمام یوروپی زبانوں میں چار قسم کے حروف استعمال کئے جاتے ھیں - یہاں جن حروف میں کتابیں طبع ہوتی ھیں' وہ لکھنے کے حروف سے بالکل جداگانہ ھیں - پھر ھر ایک کی دو قسمیں ھیں' بڑے اور چھوٹے - بڑے حروف سے جملوں کا آغاز ہوتا ھے اور چھوٹے حروف میں پوری عبارت لکھی جاتی ھے - اب ھم ان چہار گانہ حروف کے معرض وجود میں آنے کی وجہ بیان کرتے ھیں-

خانقاہ جیرو کے مشہور راھب علامہ بیڈ نے اپنی پیرانہ سالی میں یوحنا کی انجیل کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا - اس کی طرز کتابت موجودہ خط سے اس قدر مختلف تھی کہ آج کل اس کا پڑھنا مشکل ھے - اس انجیل کا قلمی نسخہ صرف بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا - اس کتاب کی نہ صرف زبان آج کل کی شستہ اور منجھی ہوئی انگریزی سے بالکل متغائر تھی بلکہ لکھنے کا طریقہ بھی بالکل نرالا تھا - تمام الفاظ ایک دوسرے سے بالکل ملے ہوے تھے اور دو لفظوں کے درمیان مطلق فصل نہ تھا - علاوہ بریں اس کتاب میں اوقاف بھی استعمال

نہیں کئے گئے تھے۔ ہر انگریزی داں جانتا ہے کہ بغیر اوقات کے انگریزی عبارت کا پڑھنا سخت دشوار ہے۔ اس کتاب نے اس قدر شہرت حاصل کی کہ اس کی بے شمار نقلیں لی جانے لگیں۔ راہبوں کو اس انجیل کے پڑھنے میں سخت دقت پیش آتی تبھی انھوں نے سوچا کہ اگر کتاب کی ہو بہو نقل کردی جائے تو پڑھنے کی دقت ہمیشہ باقی رہے گی اور معمولی آدمی تو کبھی نہ پڑھ سکے گا۔ اس لئے کتاب کو سہل القرأت بنانے کے لئے انہوں نے چھوٹے حروف ایجاد کئے اور بڑے حروف کو صرف نئے جملوں کے شروع میں استعمال کرنے لگے، تاکہ ایک جملہ دوسرے سے متمائز ہو۔ راہبوں اور قسیسوں کی انتھک کوششوں کی وجہ سے بہت سی خانقاہیں علم و فن کا مرکز بن گئیں، جہاں عظیم الشان کتب خانے قائم ہوئے، جن میں سب قلمی کتابیں تھیں۔ یہ قلمی کتابیں آج کل کی چھپی ہوئی انگریزی کتابوں کی سی تھیں، جن میں حروف علاحدہ علاحدہ لکھے ہوئے تھے۔ قرون وسطیٰ میں راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کے علاوہ تاجروں، مقننوں اور دیگر سربرآوردہ لوگوں کے کاتبوں نے بھی پڑھنا لکھنا سیکھا۔ چونکہ یہ لوگ کاروباری آدمی تھے اور راہبوں کی طرح تارک الدنیا نہ تھے، لہذا اُن کے پاس راہبوں کا سا وافر وقت نہ تھا کہ خوش نویسی کا پہلو مد نظر رکھتے اور افتراقی طرز تحریر کے پابند رہتے۔ اس لئے انھوں نے لکھنے کے لئے دوسرے قسم کے حروف ایجاد کئے تاکہ ایک لفظ کے تمام حروف ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر لکھے جاسکیں۔ سہل المنقش اور زود تحریر ہونے کے باعث یہی اتصالی طرز کتابت مقبول عام ہو گئی اور لوگ راہبوں کی خوبصورت مگر زحمت طلب افتراقی طرز تحریر کو بھولنے لگے۔ لیکن جب مطبع کا آغاز انگلستان میں ہوا تو کار پردازان مطابع نے راہبوں کا خوبصورت افتراقی طریقۂ کتابت اختیار کیا۔ الغرض طباعت افتراقی طرز تحریر کی پابند ہوئی اور کتابت اتصالی طریقۂ تحریر کی۔ اس طرح انگریزی زبان میں چار قسم کے حروف استعمال ہونے لگے —

ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ممالک مشرقیہ بعیدہ میں نظام حروف تہجی بالکل صوتی اصول پر قائم کیا گیا۔ وہاں حروف کے نام اصوات کے مطابق رکھے گئے۔ مثلاً عربی زبان میں جس حرف سے 'ک' کی آواز پیدا ہوتی ہے' اس کا نام کاف ہے' لیکن سنسکرت میں حرف کا نام بھی آواز کی مناسبت سے 'کَ' ہی ہے۔ اسی طرح 'ل' کی آواز پیدا کرنے والے حرف کا نام عربی میں لام ہے' لیکن سنسکرت میں اس حرف کا نام بھی 'ل' ہی ہے' وقس علیٰ ھذا۔ سنسکرت میں مختلف آلات نطق سے تعلق رکھنے والے حروف کے مختلف مجموعے قائم کئے گئے ہیں۔ مثلاً شفتی اصوات 'پ' 'پھ' 'ب' 'بھ' 'م' کا ایک مجموعہ۔ اسنانی اصوات 'ت' 'تھ' 'د' 'دھ' 'ن' کا ایک الگ مجموعہ' کاسی آواز 'ٹ' 'ٹھ' 'ڈ' 'ڈھ' وغیرہ کا ایک علحدہ مجموعہ قرار دیا گیا ہے۔ الغرض سنسکرت نظام تہجی کی بنیاد بالکل اصوات پر رکھی گئی ہے۔ اگرچہ یونانی' لاطینی' سنسکرت' فارسی' انگریزی وغیرہ السنہ' نسل کے اعتبار سے آریائی ہیں اور اگرچہ متحدالنسل زبانوں میں بہ لحاظ ترکیب الفاظ' خصائص نحوی' طرز ادا' اسلوب بیان' بہت کچھ مشابہت پائی جاتی ہے' لیکن چونکہ نظام حروف تہجی و رسم خط وغیرہ بعد کی چیزیں ہیں اور اس وقت ظہور پذیر ہوئیں جب کہ ایک نسل کی مختلف اقوام مرکزی وطن کو خیر باد کہہ کر مختلف ممالک میں جا بسی تھیں' اس لئے حروف تہجی کے لحاظ سے ان کی زبانوں میں مماثلت نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ عربی اور یونانی زبانیں مختلف النسل ہیں کیونکہ یونانی آریائی زبان ہے اور عربی سامی' تاہم ان کے حروف تہجی میں بہت کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن یونانی اور سنسکرت زبانیں باوجود متحدالاصل ہونے کے ان کے حروف تہجی بالکل مختلف ہیں —

طرز تحریر

طرز تحریر کے لحاظ سے آریائی زبانوں اور سامی زبانوں میں دو امر بطور خاص مابہ الامتیاز ہیں۔ پہلا یہ کہ اکثر آریائی زبانوں میں بائیں سے دائیں جانب لکھنے کا طریقہ رائج ہے اور اکثر سامی زبانوں میں تحریر کا

قاعدہ ٹھیک اس کے برعکس یعنی دائیں سے بائیں جانب ہے - دوسرا مابہ‌الامتیاز امر یہ ہے کہ اکثر آریائی زبانوں میں افتراقی طرز تحریر کا رواج ہے، یعنے وہاں پورے پورے حروف ایک دوسرے کے پہلو میں علحدہ علحدہ لکھدینے سے لفظ بن جاتے ہیں - لیکن سامی زبانیں اکثر اتصالی طرز تحریر کی پابند ہیں، یہاں پورے حروف نہیں لکھے جاتے بلکہ محض ان کے اجزا باہم ملادیے جاتے ہیں اور الفاظ لکھنے کے وقت حروف پر قطع و برید کا عمل ہوتا ہے - یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فارسی تو آریائی زبان ہے لیکن وہاں لکھنے کا طریقہ عربی طرز پر دائیں سے بائیں جانب کیوں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دوقوموں کا تصادم ہوتا ہے اور ایک قوم دوسری سے بر تر ہوتی ہے تو برتر قوم کے خیالات و افکار، جذبات اور احساسات، وضع قطع، رسم و رواج، لباس و پوشاک، تہذیب اور معاشرت دوسری کم مرتبہ قوموں میں رائج ہوجاتے ہیں - اسی طرح ایک فتح مند قوم نہ صرف سیاسی حیثیت سے بلکہ مذہبی، معاشرتی اور روایتی اعتبار سے بھی محکوم قوم پر غلبہ پاتی ہے، یہاں تک کہ ان کی زبانوں پر بھی عمل و تعمّل اور اثر و تأثر کا سلسلہ قائم ہوجاتا ہے - اگر دونوں زبانوں میں اتحاد لسانی کے لوازمات موجود ہیں تو زبان مفتوحہ کی ہیئت فاتح زبان کی ہیئت میں بالکل مدغم ہو جاتی ہے - چنانچہ جب ایران پر عربوں کو مذہبی، حربی، اور سیاسی استیلا حاصل ہوا تو عربی زبان کل حاکمانہ اقتدارات و فاتحانہ ضروریات اپنے ساتھ لائی، فارسی کو مفتوح زبان ہونے کی حیثیت سے اپنا دامن کشادہ کرنا اور عربی الفاظ قبول کرنے پڑے - چونکہ اتحاد لسانی کے لوازم مثلاً مخارج کی ہم آہنگی، اسلوب بیان کی یکسانی، ترکیب نحوی کی یک جہتی، خیالات اور مذاق کی یکرنگی وغیرہ موجود تھی - اس لئے فارسی پر عربیت کا رنگ چڑھتا گیا، یہاں تک کہ اس کی ہیئت لسانی بالکل عربی میں مدغم ہوگئی - حروف تہجی نظام ہجائی، رسم خط، طرز تحریر وغیرہ تو قریب قریب وہی ہوگئیں جو عربی کی ہیں - البتہ چند حروف مثلاً

'پ' 'چ' 'ژ' 'گ' وغیرہ کا فارسی نظام حروف تہجی میں اضافہ رہا کیونکہ عربی زبان ان کے مخارج سے معذور ہے - الغرض جدید فارسی اسلامی زبان بن گئی ' جو بالکل عربی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے - اسلام سے پہلے بھی ایرانی زبان بوجہ ہمسائگی کے بابلی ' آسوری' فونیقی' عبرانی وغیرہ السنہ سے برابر متأثر ہو رہی تھی - اس طرح فارسی زبان کو بھی شروع ہی سے سامی السنہ سے سابقہ رہا اور یہی وجہ ہے کہ ' اوستا ' کی زبان اور پہلوی خط و کتابت بھی دائیں سے بائیں جانب کو ہوتی تھی -

غالباً حروف تہجی کے موجد فونیقیوں کے لکھنے کا طریقہ دائیں سے بائیں جانب تھا - عبرانی زبان میں بھی یہی طریقہ رائج رہا اور پھر عبرانی سے عربی میں یہی طریقہ بلا کسی رد و بدل کے منتقل ہوا - دنیا کی جن جن السنہ میں عربی نظام تہجی داخل ہوا وہاں دائیں سے بائیں جانب لکھنے کا طریقہ اختیار کیا گیا - چنانچہ فارسی اور اردو زبانیں اسی طرز تحریر کی پابند ہیں - اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ان میں سے کس طریقے میں سہولت' روانی اور عجلت کا پہلو زیادہ مد نظر ہے - ہر شخص ذاتی تجربے سے دریافت کرسکتا ہے کہ کسی شے کو اپنی جانب کھینچنے کے بہ نسبت اس کو اپنے سے دور ڈھکیلنے یا جھٹک دینے میں کم زحمت ہوتی ہے - واضح رہے کہ کسی چیز کو اپنی طرف کھینچنے میں ہاتھ کو ویسی ہی حرکت دینی پڑتی ہے جیسی دائیں سے بائیں جانب لکھنے میں اور کسی شے کو دور ڈھکیلنے کی حرکت بائیں سے دائیں جانب لکھنے کی حرکت کے مشابہ ہوتی ہے - پس لکھنے کا اول الذکر طریقہ ثانی الذکر سے زیادہ سہل اور آسان ہے - لہذا جب یونانیوں نے فونیقیوں سے نظام تہجی لیا تو جہاں انھوں نے اس میں حروف علت کا اضافہ کیا وہاں سہولت اور روانی کی غرض سے یہ جدت بھی کی کہ دائیں سے بائیں جانب لکھنے کے طریقے کو بدل دیا اور بائیں سے دائیں جانب لکھنے لگے - یونانیوں سے رومیوں نے اور رومیوں سے یوروپ کے تمام ممالک نے یہی طریقہ اخذ کیا اور اسے قائم رکھا - بلکہ یونانیوں کے اثر سے حبشیوں نے بھی اپنی زبان کے لئے بائیں سے

دائیں جانب کو لکھنے کا طریقہ اختیار کیا - گو کہ حبشی ایک سامی زبان ہے - لیکن سامی السنہ میں دائیں سے بائیں جانب لکھنے میں جو تھوڑی بہت دقت اور زحمت پائی جاتی ہے اُس کی تلافی اکثر سامی زبانوں نیز قدیم فارسی اور پہلوی میں اس طرح کی گئی کہ اختصار ، حفظ وقت ، روانی اور تیزی کی غرض سے افتراقی طرز تحریر کو خیر باد کہہ کر اتصالی طریقۂ تحریر اختیار کیا گیا - اس اتصالی تحریر میں صرف یہی نہیں ہوتا کہ حروف ایک ساتھہ ملاکر لکھے جائیں بلکہ اختصار کے لئے حروف کے صرف سرے یا اخیر کے حصے لے لئے جاتے ہیں اور پورے حروف لکھنے کے بجائے محض ان کے چھوٹے حصے جزو اتصالی ہو تے ہیں - بلکہ اکثر حرف شوشوں یا صرف قلم کی گردش سے ظاہر کئے جاتے ہیں - مثلاً لفظ 'منقطع' کی اتصالی صورت یہی ہوگی جو ناظرین کے سامنے ہے ، لیکن اس کی افتراقی صورت حسب ذیل ہو گی : " م ن ق ط ع " " پیچ " - کا پہلا حرف ایک شوشہ ہے ، دوسرا قلم کی ایک ہلکی سی گردش سے پیدا ہوا ہے ، ظاہر ہے کہ پہلی صورت کو نہ صرف بہ لحاظ خوشنمائی دوسری صورت پر ترجیح حاصل ہے - بلکہ اس میں اختصار ، وقت کی بچت ، روانی اور تیزی کا پہلو بھی ملحوظ ہے - الغرض اتصالی طرز تحریر کو افتراقی طرز تحریر پر کئی اعتبار سے برتری حاصل ہے - آریائی السنہ ان خوبیوں سے محروم ہیں - البتہ اتصالی تحریر میں مبتدیوں کے لئے ایک دقت یہ ہے کہ اُن کو الفاظ دیکھہ کر اُن کے اجزا یعنی حروف کی شناخت آسانی سے نہیں ہوتی - کیونکہ کسی حرف کا صرف سرا یا ایک حصہ دیکھہ کر پورے حرف کو پہچان لینا ننھے بچوں کے لئے بہت دشوار ہے ، لیکن اس مشکل کا حل طرز تعلیم میں مناسب اصلاح کر نے سے ہو سکتا ہے - یہ بحث بجائے خود ہے ، جس کا یہ محل نہیں -

افترا قی طرز کتا بت میں تحر یر کی رفتار بہت سست ہو تی ہے - چند جملے لکھنے میں بہت سا وقت صرف ہوتا ہے اور جگہ بھی بہت گھرتی ہے - پرانے زمانے میں یوروپ کے راہب اور قسیس علائق دنیوی سے الگ تھلگ تھے

اور اُن کے پاس وقت بہت وافر تھا اس لئے وہ اطمینان سے بیٹھے بیٹھے افتراقی طرز تحریر کے مطابق کتابیں لکھا کرتے تھے - لیکن آج کل کاروبار کے ھجوم اور زندگی کی کشاکش سے انسان کو دم لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی - ایسے عدیم الفرصتی کے زمانے میں سست رفتار افتراقی طریقے سے کام نہیں چل سکتا - اسی لئے یورپ والوں کو مجبوراً مختصر نویسی کا ایک الگ فن قائم کرنا پڑا - دیکھا جائے تو اتصالی طرز تحریر فی نفسہ اختصار نویسی کے تمام پہلووں پر حاوی ھے - کسی مقرر کی تقریر انگریزی میں قلم بند کرنے کے لئے ایک ھوشیار مختصر نویس کی ضرورت پیش آئیگی کیونکہ تیز سے تیز انگریزی کاتب بھی مروجہ طرز تحریر میں اس کام کو انجام نہیں دے سکتا - اس کے برعکس اردو کا تیز نویس کاتب فن مختصر نویسی سے ناواقف ھونے کے باوجود ھرقسم کی تقریر قلمبند کرنے پر قادر ھوسکتا ھے - ایک اور قابل غور امر یہ ھے کہ جب افتراقی تحریر بھی تیزی کے ساتھ لکھی جاتی ھے تو اس میں اتصالی کیفیت پیدا ھو جاتی ھے - چنانچہ انگریزی کے شکستہ خط میں حروف ایک دوسرے سے اس قدر گُتھ جاتے ھیں اور اُن میں ایسی اتصالی شان پیدا ھو جاتی ھے کہ وہ الگ الگ تمیز نہیں کئے جاسکتے، بلکہ عبارت صرف اٹکل سے پڑھ لی جاتی ھے - اسی طرح مرھٹی زبان کی کتابیں تو افتراقی طرز تحریر کی پابند ھوتی ھیں، لیکن رواں کتابت کے لئے 'موڑی تحریر' مستعمل ھے، جس میں اتصالی شان پائی جاتی ھے - ان واقعات سے واضح ھوا کہ افتراقی طریقۂ تحریر کی پابندی ایک امر محال ھے - خلاصہ یہ کہ سامی السنہ میں اگر دائیں سے بائیں جانب لکھنے میں کچھہ دقت بھی ھے تو اس کی تلافی ان کی اتصالی طرز تحریر سے ھو جاتی ھے - لیکن افتراقی تحریر کی سست رفتاری اور بھدے پن کی تلافی محض بائیں سے دائیں جانب لکھنے کی نام نہاد سہولت سے نہیں ھو سکتی --

لکھنے کا سامان

اسی ضمن میں اس امر کا بیان بھی بے محل نہ ھوگا کہ مختلف زمانوں میں لوگ کس شے پر لکھتے تھے - عہد بربریت

نے انسان جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں بیان ہوچکا ہے، ہڈیوں یا سینگوں پر تصویریں بناتے تھے اور یہی تصویریں تحریر کا ہیولیٰ یا نقش اول تھیں - ہڈیوں پر لکھنے کا طریقہ محض دور بربریت کے انسان تک محدود نہ تھا بلکہ دور متمدن میں بھی بعض اقوام اپنی مذہبی کتابیں مٹی کے ٹکڑوں پر لکھا کرتی تھیں - زمانۂ قدیم میں جب کہ آج کل کی طرح ذرائع حمل و نقل اور ڈاک اور تار کا سلسلہ موجود نہ تھا- عام اعلانات، مذہبی اصول و احکام، شاہی فرامین و منشورات وغیرہ بالعموم پہاڑوں یا پتھر کی لاٹوں پر عوام کی آگاہی کے لئے کندہ کر دیے جاتے تھے - چنانچہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں پتھر کی لاٹوں پر 'اشوک اعظم' کے کندہ کرائے ہوے کتبے آج بھی دیکھنے میں آتے ہیں- جن ملکوں میں پتھر کمیاب تھا، وہاں مٹی کی تختیوں، استوانوں، اینٹوں اور کھپریلوں پر عبارتیں کندہ کرائی جاتی تھیں، جیسا کہ ہم سامری قوم کے بیان میں پڑھ چکے ہیں - اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احکام عشرہ و دیگر قوانین بالعموم پتھر کی لوح یا چٹانوں ہی پر کندہ ملتے ہیں، تاہم اُسی زمانے میں اہل مصر "پیپیرس" پر لکھنا جانتے تھے - تاریخ شاہد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے 'پیپیرس' پر لکھنے کا طریقہ رواج پاچکاتھا - تاہم عام آگاہی کے لئے پتھر کی لاٹوں اور چٹانوں ہی پر کتبے کندہ کئے جاتے تھے-قدیم یونانی اور رومی قومیں بھی 'پیپیرس' سے واقف تھیں-چونکہ 'پیپیرس' دیرپا نہیں ہوتا تھا، اس لئے اُن کے قوانین اور احکام پتھر کی تختیوں یا تانبے کے پتروں پر کندہ کئے جاتے تھے - ہر ملک میں چوبی یا فلزی تختیاں بھی لکھنے کے کام آتی تھیں، لیکن اِن تختیوں پر لکھنا زحمت طلب تھا - کیونکہ کئی آہنی اور فولادی اوزاروں سے بہت دیر میں حروف کھودے جاتے تھے - تھے - اس لئے رومیوں نے یہ جدت کی کہ وہ چوبی یا فلزی تختیوں پر لاکھ لیپ دیتے تھے اور ایک نکیلے آہنی قلم سے اُن پر بسہولت لکھا کرتے تھے - قدیم تاریخ روما کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ہر رومی، جو پڑھنے لکھنے سے واقف

تھا ' اپنے پاس اِس قسم کی لاکھہ سے لیسی ہوئی تختیاں ضرور رکھتا تھا - البتہ جب سے سلیٹ پر بآسانی لکھنے کا طریقہ رائج ہوا اُس وقت سے تختیوں پر سے لاکھہ کا یہ استعمال متروک ہو گیا —

اہل مصر علوم و فنون اور تہذیب و تمدن میں روز افزوں ترقی کر رہے تھے- " پیپیرس " چونکہ زیادہ دیرپا نہیں ہوتا تھا ' اس لئے انہوں نے جانوروں کے بچوں کے ملائم چمڑے سے ایک قسم کا کاغذ بنایا (جسے عربی میں " رق " اور انگریزی میں " پارچمنٹ " یا " ویلم " کہتے ہیں اور ہم " چرمک " کہہ سکتے ہیں) اور جھلیاں بھی استعمال کرنے لگے- مصریوں نے "رق"(چرمک) اور جھلیوں پر لکھنا اُسی زمانے میں سیکھہ لیا تھا ' جب بنی اسرائیل وہیں مقیم تھے اور ابھی شام اور کنعان کو ہجرت نہیں کی تھی - الغرض چرمک پر لکھنے کا رواج حضرت مسیح سے پانچ صدیوں پیشتر ہی ہوچکا تھا - یونانیوں اور رومیوں نے بھی اہل مصر سے رق اور جھلیوں پر لکھنا سیکھا - چنانچہ اُن کی بہت سی شہرۂ آفاق اور زندۂ جاوید کتابیں جو نسلاً بعد نسل ہم تک پہنچی ہیں' رق ہی پر لکھی ہوئی ہیں - کتابوں کے علاوہ شاہی احکام ' فرامین ' تمثیلات اور وصیت نامے وغیرہ بھی چرمک ہی پر لکھے جاتے تھے - الغرض " پیپیرس " بوجہ زود تلفی کم استعمال ہونے لگا اور چرمک پر لکھنے کا رواج بڑھتا گیا - بہر کیف مطابع کی ایجاد تک چرمک اور جھلیاں خوب استعمال ہوتی رہیں - چنانچہ قرون وسطیٰ کی تمام خوبصورت کتابیں جھلیوں اور چرمکوں پر لکھی ہوئی ہیں - کہا جاتا ہے کہ مطابع کی ایجاد کے بعد ہنگیری کا بادشاہ ' متھیا ہنیاوی ' اپنے کتب خانے میں چھپی ہوئی کتابیں رکھنا پسند نہیں کرتا تھا ' اس لئے اُس نے بہت سے کاتبوں اور خوش نویسوں کو ملازم رکھہ کر ان سے کثیرالتعداد کتابیں چرمک اور جھلی پر لکھوائیں - آج کل بھی چرمک اور جھلیوں پر لکھنے کا طریقہ مفقود نہیں ہوا ہے - پار چمنٹ کی ایک نفیس قسم ' ویلم ' ہے ' موجودہ زمانے میں اکثر شاہی اسناد و منشورات

اور بین قومی معاہدات 'ویلم' ہی پر تحریر ہوتے ہیں۔ دنیائے متمدن کی اکثر و بیشتر جامعات بھی جو اسناد عطا کرتی ہیں وہ چرمک ہی پر ہوتی ہیں۔

قدیم اہل عرب کے ہاں مختلف اشیا لکھنے کے کام آتی تھیں۔ بانی اسلام کی بعثت کے بہت دنوں بعد تک جن چیزوں پر اہل عرب اپنی کتابیں لکھتے تھے، ان میں سے حسب ذیل بہت مشہور تھیں: (۱) "عسیب" یعنی کھجور کی شاخ جس سے پتیاں کرچکی ہوں (۲) "سلقة" یعنی پتھر کی پتلی تختی۔ (۳) قتب یا قتد یعنی پالان کی لکڑی (۴) کتف یعنی اونٹ، گائے یا بکری وغیرہ کے شانے کی چوڑی ہڈی (۵) رَقّ یعنی چمڑے کے ورق وغیرہ۔ لیکن زیادہ تر رواج ہڈیوں پر لکھنے کا تھا۔ کیونکہ اُس میں زیادہ صرفہ نہ تھا چنانچہ اکثر سیاحوں کا بیان ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمان علما کے دار المطالعہ میں ہڈیوں کا انبار لگا رہتا تھا، جن پر ہر قسم کی کتابیں لکھی ہوتی تھیں لیکن خوبصورتی اور خوشنمائی کے لئے کلام مجید بالعموم 'رق' پر لکھا جاتا تھا۔ راقم نے اوری انٹل پبلک لائبریری (کتب خانۂ مشرقیہ عمومیہ) بانکی پور پٹنہ میں نہایت خوبصورت جھلیوں کے پلندے پر کلام مجید خوش خط لکھا ہوا دیکھا ہے۔ مہتمم کتب خانہ کا بیان تھا کہ یہ کلام مجید خاص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ قدیم ہندوستان کی فضا 'گوتم بدھ' کی تعلیم سے اس قدر متأثر ہوئی کہ بدھ مت کے ہندوستان سے اخراج اور برہمنی مذہب کے عود کے بعد بھی جانوروں کو ذبح کرنا "جیوہنسا" اور 'مہاپاپ' خیال کیا جاتا رہا۔ الغرض ہنود کی سبزی خوری نے انہیں رق' چمڑے' پار چمنت' جھلی' ہڈی وغیرہ پر لکھنے سے باز رکھا۔ اس لئے یہاں مقدس کتابیں تاڑ کے پتوں پر لکھی جاتی تھیں —

دو ہزار برس گذرے کہ 'سائی لون' نامی ایک چینی صناع نے کاغذ ایجاد کیا۔ لیکن چونکہ اُس زمانے میں دور دور ملکوں کے درمیان رسل و رسائل اور

آمد و رفت کے ذرائع بہت کم تھے، کاغذ کا استعمال مدت تک مشرق اقصیٰ ھی میں محدود رھا - پورے ایک ھزار سال کے بعد ایشیا کے مغربی حصے میں لوگ کاغذ سے روشناس ھوے - چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں اھل مصر نے کاغذ بنانا سیکھا - گیارھویں صدی میں ' مراکش ' کے مسلمانوں نے فن کاغذ سازی میں بڑی ترقی کی - مراکش سے یہ فن اُندلس پہنچا، جہاں خلفاے امویہ حکمراں تھے - اُس زمانے میں یورپ کی فضا جہالت سے مکدر تھی، اسی لئے تاریخ یورپ میں یہ زمانہ " عہد تاریک " کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے - لیکن اُندلس کے شہر غرناطہ میں علوم و فنون کا آفتاب نہایت فیاضی سے ضیا بار تھا - حصول علم کے لئے یورپ کے تاریک خطوں کے عیسائی وھاں جوق جوق آتے، چنانچہ چند اطالوی طلبہ نے جو تلاش علم میں غرناطہ پہنچے تھے، دیگر علوم و فنون کے ساتھہ ساتھہ فن کاغذ سازی بھی مسلمانوں سے سیکھا اور جب وہ اپنے وطن کو واپس گئے تو وھاں اُنھوں نے گھر یلو کاغذ بنانا شروع کیا - اطالیا سے فرانس اور جرمنی نے کاغذ سازی سیکھی - لیکن انگلستان میں سب کے بعد کاغذ کا رواج ھوا - ھندوستان کے باشندوں کو بدھ مت کے چینی جاتریوں نے پہلے ھی کاغذ سے روشناس کردیا تھا لیکن عام طور پر یہاں کاغذ کا رواج اسلامی فتوحات کے بعد ھوا - زمانے کی نیرنگی دیکھئے کہ جن یورپی ملکوں میں سب کے بعد کاغذ کا رواج ھوا، آج کاغذ سازی کے بڑے بڑے کار خانے وھیں قائم ھیں اور وھیں سے دنیا بھر میں کاغذ کی سربراھی ھورھی ھے—

اب ایک سوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ قدما کے ھاں کس قسم کا قلم رائج تھا - اوپر بیان ھوچکا ھے کہ دور بربریت کے انسان بھی ھڈی یا سینگ کے ٹکڑوں پر بھدی تصویریں بناتے تھے - لہذا حجری زمانے میں پتھر ھی کے نکیلے اوزار قلم کا کام دیتے ھوں گے، بعد کو جب پتھر، اینٹ، ھڈی، مٹی کی تختیوں اور اُستوانوں،

چوبی اور فلزی لوحوں پر کتبے کندہ کیے جانے لگے تو پہلے تانبے یا کانسی کے اور پھر لوہے کے اوزار کام میں لائے جاتے تھے۔ رومیوں اور یونانیوں کے ہاں لاکھ بھری ہوئی تختیوں پر لکھنے کے لیے بھی نکیلے فلزی اوزار استعمال کیے جاتے تھے۔ لیکن جب مصر میں پپیرس اور پھر رق اور جھلیوں پر لکھنے کا رواج ہوا تو مصری برو (کلک) یا سرکنڈے کے قلم سے لکھنے لگے، جس کی زبان میں روشنائی اُترنے کے لیے شگاف دے دیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں بھوج پتر اور تاڑ کے پتوں پر لکھنے کے لیے بھی برو یا سرکنڈے یا نرکُل یا بانسی قمچیوں کے قلم استعمال کیے جاتے تھے۔ عربوں اور ایرانیوں کے ہاں بھی اسی قسم کے قلم مروج تھے۔ خوشنویسی کے لیے یہی قلم موزوں بھی تھے، حروف کی حسب ضرورت موٹائی اور پتلے پن، شوشوں کے اُتار چڑھاو اور نوک پلک کے لیے قلم کی زبان میں لچک کا ہونا ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ برو یا سرکنڈے کے قلم جیسے لچکیلے ہوتے ہیں ویسے آہنی قلم نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں تھوڑے دنوں سے آہنی قلم کا رواج ہوا ہے۔ یہاں لوہے کے قلم انگریزوں کے قدم بقدم آئے، اسی باعث وہ "کلک فرنگی" کہلاتے ہیں۔ بہر حال جب پپیرس اور چمڑے پر لکھنے کا رواج ہوا تو روشنائی کی بھی ضرورت پیش آئی۔ پہلے پہل اہل مصر نے روشنائی ایجاد کی۔ وہ لاکھ یا اُس دانے دار صمغی مادے سے روشنائی تیار کرتے تھے، جو اکثر بیر۔ پیپل۔ برگد۔ وغیرہ کے درختوں کی ٹہنیوں کی جڑوں میں بڑیوں کی شکل میں جمع ہوتا تھا۔ ہندوستان میں یہ صمغی مادہ بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ اُسے یہاں عرف عام میں "بیری کا میل" کہتے ہیں۔ اہل ہند اُسے کوٹ کر پکاتے اور صاف کرتے ہیں اور اُس سے ریشم رنگتے، چوڑیاں بناتے، دستے جوڑتے اور وارنش تیار کرتے ہیں۔ اُس سے غازہ بھی بنتا ہے۔ نقاشی اور مصوری میں بھی اُس کا رنگ کام دیتا ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ لاکھ ایک قسم کے کیڑوں کا لعاب دہن ہے۔ اس کی حقیقت یوں ہے کہ یہ کیڑے جو عربی میں قرمز کہلاتے ہیں،

درختوں کی نرم اور نازک ٹہنیوں میں سوراخ کردیتے ہیں اور درختوں سے ان سوراخوں سے ہو کر جو عرق یا لعاب نکلتا ہے وہ جم کر لاکھ بن جاتا ہے - ہندوستان میں بھی اس کی روشنائی بنتی تھی - لیکن زیادہ تر ہڑے اور کسیس کے آمیزے سے روشنائی بنتی چلی آئی ہے - علاوہ بریں ہر ملک میں کاجل سے سیاہی بنانے کا عام قاعدہ تھا - ہندوستان میں پہلے ناگ پھنی کے پھل سے بھی سرخ روشنائی تیار کی جاتی تھی —

یورپ میں بھی تیرھویں صدی عیسوی تک صرف برو اور سرکنڈے کے قلم مستعمل تھے - تیرھویں صدی کے آخر میں بعض کاتبوں نے دریافت کیا کہ چند قسم کے پرندوں کے پر سے عمدہ قلم بن سکتے ہیں' اس وقت سے انیسویں صدی تک، پر کے قلم یورپی ممالک میں بکثرت استعمال ہوتے رہے - پر کے قلم کے بڑے بڑے کارخانے بھی قائم ہوے تھے - پہلے ایک ماہر عمدہ پروں کا انتخاب کرتا تھا' پھر ان پروں کو گرم اور اُبلتے ہوے پانی میں کچھ دیر تک ڈبو کر خشک کر لیتے تھے - اس عمل سے صفائی کے علاوہ پروں میں پختگی اور سختی پیدا ہوجاتی تھی - پھر کلک کے قلم کی طرح پروں کو قلم تراش سے چھیل کر یا مشین میں دباکر قلم بنا لیتے تھے - خوشنویسی کے لئے یہ قلم بہترین خیال کئے جاتے تھے اور اُنیسویں صدی کے اوائل تک انہیں قلموں کا عام رواج تھا - بعض مورخین کا بیان ہے کہ سترھویں صدی کے اخیر میں انگستان میں پیتل کے قلم بھی بنائے گئے تھے - لیکن پر کے قلموں کے آگے اُن کی کچھ قدر نہ ہوئی - سنہ ۱۸۱۹ ع میں انگستان میں ایک شخص 'جیمس پیری' نامی نے آہنی قلم کا کارخانہ کھولا - پہلے آہنی قلم بھی ہاتھ ہی سے بنائے جاتے تھے - اس لئے بڑی محنت اور دقت سے تیار ہوتے تھے اور بہت گراں فروخت ہوتے تھے' لہذا عوام پر ہی کے قلم استعمال کرتے رہے - اس کے کئی سال بعد 'جیمس میچل' نے مشین کے ذریعے قلم بنانا شروع کیا - یہ آہنی قلم پر ہی کے

حضرت کیفی کی دو نظمیں

(۱)

حسن فطرت

حسن جلوہ نما [illegible] رخسار [illegible]
وجد میں کون و مکاں بیخود و رقصاں نکلا
[illegible] جو انکھیں [illegible] حسن [illegible]
اب تو انسان [illegible] ہمہ تن [illegible] نکلا
ہے دکھاتا [illegible]
حسن کی [illegible] پرستاں نکلا
موقع حیرت [illegible] یہ تو ہم [illegible]
ہم سمجھے تھے کہ کوئی دیدۂ حیراں نکلا
ہے عدو دشمنیت خلق کا رنج اور ملال
قید اندوہ میں پھنس کر کوئی انساں نکلا
جو سمجھتا ہے کہ انساں ہے ضعیف البنیان
ذہن سے اس کے نہ اندیشۂ شیطاں نکلا
حسن کو حس نے دو روزہ کہا ۔ کوتہ بیں تھا
اس کے سینے سے نہ خار غم عصیاں نکلا
گوش و گردن نے جو پھیلائے ترے دست سوال
لعل و الماس سے پُر گوہر کا داماں نکلا

عارضی زیبِ گلے کا جو ترے ہار ہوئی
بدر سے سلسلۂ گوہرِ غلطاں نکلا

حسنِ فطرت سے ہے انسان کی حسن آرائی
غازۂ [illegible] گل [illegible] نکلا

[illegible] نکلا
[illegible] نکلا

[illegible]
حسن ہر رنگ [illegible] نکلا

[illegible]
[illegible] افشاں نکلا

[illegible]
[illegible] ایماں نکلا

[illegible] گلشن
حسن ہر رنگ میں [illegible] نکلا

ہے کئی حسن سے لبریز یہ دنیا لیکن
[illegible] تنگ ہی داماں نکلا

---

(۲)

زمانہ یہ نہیں ماضی کی داستاں کے لئے

نسیم باغِ ارم ہے صبا جہاں کے لئے
نہیں وہ روحِ رواں صرف گلستاں کے لئے

ہے مہر و ماہ کا فیض ایک سا ہر اک شے پر
یہ راہ بات کے دیوے ہیں کُل جہاں کے لئے
زباں بنی ہے بشاشت کا راگ گانے کو
نہ داستان غم و حسرت و فغاں کے لئے
کھلینگی دیدۂ دل [illegible] ز گریۂ [illegible]
ہے سوختہ [illegible] چشم [illegible] فشاں کے لئے
تو سمجھ کیا ہے جو پھول اور [illegible] یہ پھول
وہ بھی [illegible] اور فقط [illegible] کے لئے
ہو تیرو [illegible]
[illegible]
[illegible] ہوا [illegible]
جہاں ہے تیرے لئے [illegible] کے لئے
جو موت آتی ہے آ کر رہیگی اپنی آپ
تو پاتا ہے یہ کیوں روگ اپنی جاں کے لئے
شباب جیسے کہ بچپن [illegible]
اسی طرح ہے بڑھاپا بھی ہر جواں کے لئے
بنی ہے تیرے ہی خاطر تو ساری موجودات
زمیں کا لقمہ نہ تو جور آسماں کے لئے
جو کائنات کا خلاق ہے خدا تیرا
تو دل میں آگ نہیں کیوں ہراس و جاں کے لئے
ہے وقت حل ہو معمائے حال و استقبال
زمانہ یہ نہیں ماضی کی داستاں کے لئے

عیاں جو ہے اُسے پنہاں پہ چھوڑ تا کیوں ہے
کیا یہاں کا ہی کام آئیگا وہاں کے لئے

نہیں ہے تجھ میں جو ایثار اور جاں بازی
تو [illegible] آتا ہے چلا کیوں ہے امتحاں کے لئے

[illegible]
[illegible] کے لئے

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] آسماں کے لئے

[illegible] دلوں [illegible] امتحاں [illegible]
[illegible] آواز کے لئے

[illegible] ہیں لوگ
[illegible] یہ [illegible] کے لئے

[illegible] رکھ [illegible] میں
جو تیر چاہئیں اس [illegible] کے لئے

[illegible] کو اُبھارے وہ جذب شان قلم
اُجالے قلب کو یہ شرط ہے بیاں کے لئے

تو کیا قرابت و تقلید لے کر بیٹھا ہے
دلوں پہ قبضہ ہی معراج ہے زباں کے لئے

غزل نے پائی ہے، کیفی! نئی نرالی شان
یہ ظرف تنگ نہیں ہے مرے بیاں کے لئے

مقدمہ چمنستان شعرا*

(از اڈیٹر)

رائے لچھمی نرائن تخلص 'شفیق' و 'صاحب' کے والد رائے منسارام نواب نظام الملک آصفجاہ مرحوم کے عہد میں پیشکار صدارت شش صوبۂ دکن تھے† - رائے منسارام اپنی ایک کتاب‡ کے شروع میں لکھتے ہیں کہ " بندۂ عقیدت شناس منسارام آصفجاہی ابن بھوانی داس غازی الدین خانی' نبیرۂ بال کشن عابد خانی نے تخمیناً مدت پچاس سال اس سرکار دولت مدار میں اپنی زندگی بڑی اچھی طرح بسر کی' صدارت کل کی خدمت انجام دی اور مورد عاطفت و شفقت رہا" —

'شفیق' کھتری قوم سے تھے اور ان کے بزرگ لاہور کے رہنے والے تھے - ان کے ١٥١٥ بھوانی داس لشکر عالمگیری کے ہمراہ دکن میں آئے اور اورنگ آباد میں سکونت پذیر ہوگئے - رائے منسا رام کو صغر سنی ہی میں یتیمی کا داغ نصیب ہوا - سن شعور کو پہنچکر ایسی لیاقت حاصل کی کہ نواب مغفرت مآب آصف جاہ اول کے عہد میں پیشکار صدارت صوبجات دکن کی خدمت پر فائز ہو گئے - منسا رام چار پشت سے خاندان آصف جاہ کے نمک خوار تھے —

رائے منسارام محض دفتر کے پیشکار یا سررشتہ دار ہی نہ تھے بلکہ تاریخ و

---

* یہ کتاب حال ہی میں انجمن ترقی اردو نے نہایت اہتمام سے شائع کی ہے - اور قابل دید ہے حجم تقریباً ۹۰۰ صفحے —

† شام غریباں' باب آخر —   ‡ مآثر نظامی —

انشا کا بھی ذوق رکھتے تھے اور صاحب تالیف و تصنیف ہوے ہیں- ایک کتاب اُن کی 'مآثر نظامی' ہے - یہ کتاب اُنھوں نے اس زمانےمیں لکھی تھی' جب ناموافق حالات کی وجہ سے خانہ نشیں ہوگئے تھے - اس کتاب میں نواب نظام‌الملک آصف جاہ اول کے حالات ہیں- ابتدا میں ان کے بزرگوں کا بھی تذکرہ لکھا ہے- یہ حالات کچھہ تو مصنف کے چشم دید ہیں اور بعضے ایسے ہیں جو ثقات سے معلوم ہوے' اور بعض حالات خود نواب آصف جاہ مرحوم کی زبان مبارک سے سننے میں آے - یہ کتاب ۱۲۰۰ھ میں مرتب ہوئی - اور جب اُنیس سال کی گمنامی اور گوشہ نشینی کے بعد "حضرت مرشد زادۂ آفاق سہیں پور خلافت و ریاست ... .. نواب عالی جاہ بہادر اسد جنگ" نے یاد فرمایا تو یہ رسالہ بطور تحفہ حضور میں پیش کیا - ان کی دوسری تالیف "قانون دربار آصفی" ہے - یہ کتاب بھی زمانۂ گوشہ نشینی کی لکھی ہوی ہے - سنہ تالیف ۱۱۷۵ ھ ہے- اس میں ضوابط دربار کے علاوہ بعض بعض بڑے کام کی باتیں بھی آگئی ہیں - مؤلف‌نے آخر میں لکھا ہے کہ یہ کتاب میں نے دو روز میں لکھی —

اس سے یہ معلوم ہوگا کہ 'شفیق' ایسے گھرانے میں پیدا ہوے تھے' جہاں علمی چرچا تھا اور خود اُن کے والد صاحب تالیف و تصنیف تھے - 'شفیق' کی ولادت سنہ ۱۱۸۵ ھ میں ہوئی- یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شمالی ہندوستان سے لے کر دکن تک ریختہ گوئی کی گرم بازاری ہے اور من‌جملہ دوسرے شہروں کے اورنگ‌آباد بھی مرکز شعر و سخن بنا ہوا ہے - اگرچہ اس وقت ذرائع آمد و رفت کی یہ آسانیاں نہ تھیں جو اس وقت ہیں' لیکن اس پر بھی شمال کے اساتذہ کا تازہ کلام یہاں پہنچتا رہتا ہے ' بڑے اشتیاق سے پڑھا جاتا ہے اور مشہور خاص و عام ہوجاتا ہے' جس سے صاحب ذوق لوگوں کے دلوں میں نئی نئی اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ ان باکمال اساتذہ کی تتبع کرنے کی کوشش کرتے ہیں —

'شفیق' کی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق فارسی' عربی' صرف و نحو' انشا وغیرہ میں ہوئی اور جیسا کہ خود اُنھوں نے اس تذکرے میں لکھا ہے' شیخ عبدالقادر صاحب

سے کتب متعارفہ کی سند حاصل کی - بدوسن شعور ھی سے ان میں شعرو سخن کا ذوق پیدا ہوگیا تھا اور گیارا سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے - میر غلام علی 'آزاد' بلگرامی جن کا شمار ھندوستان کے جید علما میں ھے اور جو فن شعر گوئی اور تاریخ میں یدطولی رکھتے تھے ' دکن ھی میں تھے - 'شفیق' کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا - لکھتے ھیں کہ " میر عبدالقادر 'مہربان' نے جو حضرت ' آزاد' کے تلامذہ میں سے تھے ' مجھے " صاحب " تخلص عنایت فرمایا - غزلیات کا دیوان جس میں تقریباً دو ھزار بیت تھے' مرتب کیا - لیکن جب ذرا استعداد بڑھی اور اصطلاح شعرا اور قواعد شعرا میں مہارت حاصل ہوئی تو اُسے تقویم پارینہ سمجھ کر نظر انداز کردیا - اب دہ میری عمر اٹھارا سال کی ھے' مجھے یہ معلوم ھوا کہ ایک صاحب میر محمد مسیح کا تخلص فارسی میں 'صاحب' ھے تو میں نے " مہر صاحب و قبلہ " (آزاد بلگرامی) سے تخلص کی التجا کی - آپ نے ازراہ شفقت "شفیق" تخلص عطا فرمایا - چونکہ میرے ریختے عوام و خاص میں مشہور ہو چکے تھے' اس لئے ریختے میں "صاحب" ھی تخلص رھنے دیا اور جن بحروں میں " شفیق " نہیں کھپ سکتا وھاں نا چار " صاحب " ھی رکھنا پڑا - اس نئے تخلص کی خوشی اور شکریے میں وہ ایک قطعہ موزوں کرتے ھیں اور " تخلص نوی " اس کی تاریخ نکالتے ھیں - مہربان" شفیق' کے خاص دوستوں میں سے تھے - ان کے حالات میں ان کی بہت تعریف کی ھے —

میر غلام علی ' آزاد' ۱۱۵۲ ھ (۱۷۴۰ ع) میں اورنگ آباد وارد ہوے اور بابا شاہ مسافر کے تکیے میں قیام کیا اور سات سال یہیں بسر کردئے - ' آزاد ' کی عمر کے اڑتالیس سال دکن ھی میں گزرے اور یہیں وفات پائی اور خلدآباد میں پیوند زمیں ہوے - آپ کے فیض صحبت سے دکن کے اکثر باکمال مستفیض ہوے - انھیں میں ' شفیق' تھے - ' شفیق ' کو ' آزاد' سے کمال عقیدت مندی تھی اور جہاں کہیں ان کے تالیفات میں ' آزاد ' کا نام آیا ھے تو اُن کا ذکر بڑے ادب و احترام اور

خلوص و ارادت سے کرتے ھیں اور ھر جگہ انھیں " میر صاحب قبلہ" " پیر و مرشد " یا قبلہ و کعبۂ بر حق " اور اپنے آپ کو "غلام" لکھتے ھیں - (غالباً اس میں ' آزاد ' کے لفظ کی رعایت بھی ملحوظ ھے) - 'گل رعنا' میں ' آزاد ' کا تذکرہ تفصیل سے لکھا ھے - اپنے کلام میں جا بجا حضرت کے کمال اور اپنے تعلقات و عنایات کا ذکر کیا ھے - ایک پر زور قصیدہ اُن کی مدح میں لکھا ھے :—

للہ الحمد صبا مژدۂ عشرت لائی ۔۔۔ کہ بہار اب کے تجمل سے چمن میں آئی

شاہ گل تخت چمن پر ھے بصد زینت وناز ۔۔۔ سرو و شمشاد ھیں استادہ وھاں مجرائی

بہاریہ تشبیب کے بعد گریز کی ھے :—

طبع حضرت سے مگر وام کرے رنگینی ۔۔۔ اب جو کرتی ھے بہار ایسی چمن آرائی

یعنی وہ حضرت 'آزاد' کہ خورشید و قمر ۔۔۔ آستاں اُس کی پہ رکھتے ھیں جبیں فرسائی

قبلۂ ھر دو جہاں ' مرشد ارباب سلوک ۔۔۔ ختم ھے ذات مبارک پہ کرم فرمائی

علم منقول میں اس کو دم عیسیٰ ھیگا ۔۔۔ علم معقول میں اُس کو ھے ید بیضائی

قمریان عرب اُس کی ھیں ثناخوانی میں ۔۔۔ عندلیبان عجم کی ھے سخن پیرائی

بسکہ رکھتا ھے سخن بیچ وشیریں کاری ۔۔۔ ھند کے طوطیوں کو اُس سے ھے شکر خائی

نگہ لطف مرے پر ھے ھمیشہ مبذول ۔۔۔ مجکو زیبا ھے غلامی ' اُسے ھے آقائی

اس کے بعد دعا ھے اور دعا کے بعد یہ مقطع ھے :—

فارسی شعر کہو مدح میں اُس کی "صاحب" ۔۔۔ کہ ملے تجکو خطاب ملک الشعرائی

اسی طرح ایک پوری غزل ' آزاد ' کی شان میں کہی ھے - غزل کیا ھے ' گویا اپنے پیر و مرشد کی شان میں چھوٹا سا قصیدہ ھے :—

سرور ھر دو جہاں آزاد ھے ۔۔۔ والی کون و مکاں آزاد ھے

کنت کنزاً کے معانی پر خبر ۔۔۔ واقف سر نہاں آزاد ھے

مرکز ادوار چرخ چنبری ۔۔۔ قطب الاقطاب زماں آزاد ھے

اسم اعظم ہے زباں زد اس کے تئیں   جس کے تئیں ورد زباں آزاد ہے
خورد و بزرگ کے تئیں یہاں ہے رسوخ   مرشد پیر و جواں آزاد ہے
ایک دم میں دین و دنیا بخش دے   جس کے اوپر مہرباں آزاد ہے
دل سے اب 'صاحب' ہوا ہے کا غلام   بادشاہ انس و جاں آزاد ہے

کہاں تک لکھوں ' ' شفیق' کی عقیدت کے اظہار کے لئے یہ بہت کافی ہے - حضرت آزاد کا ذوق سخن محتاج بیان نہیں ' ایسے صاحب ذوق اور با کمال لوگ کم ہوتے ہیں - ان کا کلام اور ان کی تصنیفات اس کی شاہد ہیں - اس کے ساتھ تاریخ و سیرت کا ذوق بھی اعلیٰ درجے کا تھا - ان کے تذکرے اس فن کے بہترین نمونے ہیں - 'مآثر الامرا' جو تاریخی لحاظ سے بےمثل کتاب ہے' انھیں کے فیض اثر کا نتیجہ ہے' بلکہ بہت کچھ حضرت 'آزاد' ہی کی قلم کی ممنون ہے - ادب میں ان کی نظر بہت وسیع تھی اور تحقیق و تلاش میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے - اچھا استاد دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ہے - ' شفیق ' بڑا خوش قسمت تھا کہ اُسے 'آزاد ' سا استاد ملا - اس نے بھی استاد کے قدم بقدم چلنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی - شاعر تو وہ لڑکپن سے تھا ' فارسی اور اردو دونوں میں اس کا کلام موجود ہے اگرچہ کم یاب ہے - اس کے علاوہ اس کی تصنیفات و تالیفات دو قسم کی ہیں - ایک تو شعرا کے تذکرے اور دوسری تاریخی کتابیں - یہاں اُن تالیفات * کا مختصر سا ذکر کیا جاتا ہے —

تاریخ

——(حقیقت ہائے ہندوستان)——

' شفیق ' اس کتاب کی حقیقت دیباچے میں اس طرح لکھتے ہیں

---

* اس مقدمے میں راے منسارام اور ' شفیق ' کی تالیفات کا ذکر آیا ہے ' اُن میں سے تنمیق شگرف ' حالات حیدرآباد' ریو کی فہرست سے ماخوذ ہیں ' باقی کتابیں میرے پاس موجود ہیں —

که " راقم کے والد رائے منسا رام نے جو چار پشت سے نمک خوار خاندان آصفی ہیں - سنہ ۱۲۰۴ھ میں اورنگ آباد سے فردوں کے چند طباق میرے پاس حیدرآباد بھیجے - یہ میرے جد ماجد کے لکھے ہوئے تھے ' جو سرکار حضرت کلاں علیہ المغفرۃ و الرضوان میں خدمت مستوفی گری اور پیشکاری صدارت اسکنۂ ہندوستان پر فائز تھے ' یہ فردیں نواب مغفرت مآب نظام الملک کے دستخط سے مزین تھیں - لیکن ان میں سے بعض بوسیدہ ہو گئی تھیں اور اکثر کرم خوردہ تھیں - ان فردوں میں قدیم زمانے کے مختلف سنین سے سنہ ۱۱۳۹ ت تک کے مداخل و مخارج و جمعیت سپاہ وغیرہ کا حساب بطور سیاق و اصطلاح اہل جرائد میں درج تھے - ان سب کو سادہ عبارت میں تحریر کیا اور رقمی اعداد کو الفاظ میں لکھا اور اس کے علاوہ دوسری معلومات بھی فراہم کر کے مناسب مقامات پر اضافہ کیں —

یہ کتاب ' شفیق ' نے اُس وقت کے رزیڈنٹ اور اپنے سرپرست کپتان ولیم پیٹرک کے لئے تالیف کی - کتاب کے نام سے اس کا سنہ تالیف (۱۲۰۴ھ) نکلتا ہے ' اس میں چار مقالے ہیں : —

مقالۂ اول میں دفتر قدیم کی فردوں کی کیفیت ہے —

مقالۂ دوم میں صوبہ ہائے ہندوستان کا حال ہے —

مقالۂ سوم میں صوبجات دکن کا ذکر ہے —

مقالۂ چہارم میں مسلمان سلاطین ہند کا مختصر حال ' سلطان معزالدین سام سے لے کر شاہ عالم بادشاہ تک ہے —

یہ کتاب اچھی ضخیم ہے اور اس میں ہر سرکار پرگنہ اور حویلی کے مداخل اور سمت اور فاصلہ درج ہے - ضمنی طور پر مختصر تاریخی واقعات بھی آ گئے ہیں - غرض یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے —

—— (تنمیق شگرف) ——

یہ بھی دکن کی تاریخ کے متعلق ہے - مختلف صوبوں کے جغرافی اور تاریخی حال اور اعداد و شمار ہیں اس کے بعد سلاطین بہمنیہ کا ذکر ہے جو تاریخ فرشتہ سے ماخوذ ہے - سلطنت بہمنیہ کے زوال پر جو حکومتیں قائم ہوئیں (یعنی عادل شاہی ' نظام شاہی ' عماد شاہی ' قطب شاہی ' برید شاہی ' اور خاندیس کے فاروقی سلاطین) اُن کا مختصر حال ہے - آخر میں سلاطین تیموریہ کا ذکر سنہ ۱۲۰۰ ھ تک ہے - یہ نام بھی تاریخی ہے ' جس سے سنہ تالیف ۱۲۰۰ ھ نکلتا ہے - یہ کتاب حیدرآباد کے رزیڈنٹ مسٹر رچرڈ جانسن کے نام معنون ہے —

—— (مآثر آصفی) ——

یہ خاندان آصف جاہ کی تاریخ ہے ' یعنے خواجہ عابد (نظام الملک آصف جاہ اول کے ۱۱۱۵) سے لے کر آصف جاہ ثانی تک کے حالات ہیں ' مرہٹوں نے جو ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس کا بھی ذکر ہے - نیز اس زمانے کے امرا اور راجاؤں کے حالات بھی لکھے ہیں - یہ کتاب سنہ ۱۲۰۸ ھ میں تالیف ہوئی —

—— (بساط الغنائم) ——

یہ مرہٹوں کی تاریخ ہے - اور یہ کتاب اس نے سر جان ملکم کی فرمائش سے لکھی ' جو اس وقت حیدرآباد میں تھے ' اس میں مرہٹوں کی تاریخ ابتدا سے مؤلف کے وقت تک کی ہے - اس کا ایک حصہ ' شفیق ' نے کسی مرہٹی تاریخ سے ترجمہ کیا ہے - نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۱۴ ھ نکلتا ہے —

—— (حالات حیدرآباد) ——

اس میں بلدۂ حیدرآباد کی مساجد ' محلات و باغات اور شہر کی مختصر تاریخ ہے ' بیدر اور ورنگل کے حالات بھی درج ہیں - یہ کتاب بھی سنہ ۱۲۱۴ ھ کی تالیف ہے —

تذکرے

ـــــ (شام غریباں) ـــــ

یہ تذکرہ اُن ایرانی شعرا کا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ہندوستان میں وارد ہوے ۔ نام بھی مضمون کی مناسبت سے رکھا ہے ۔ اگرچہ حالات بہت مختصر ہیں ' مگر کتاب دلچسپ ہے اور اشعار کا انتخاب خوب ہے ۔ لطائف و ظرائف سے خالی نہیں ۔ بعض بعض جگہ اشعار کے متعلق خاص نکات بھی بیان کر دیے ہیں —

ـــــ(گل رعنا)ـــــ

یہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے ' اس میں وہ ایرانی نژاد بھی ہیں جن کے باپ دادا ہندوستان میں آءے اور یہیں رہ گئے اور ہندی نژاد بھی ۔ اس میں دو فصلیں ہیں : ایک میں " شعراے اسلامیاں " کا اور دوسری میں "نکتہ پردازان اصنامیاں" کا تذکرہ ہے ۔ یہ تذکرہ "شام غریباں" سے بہت بڑا ہے ' اور اکثر حالات بھی مفصل بیان کئے ہیں۔ اپنے استاد 'آزاد' بلگرامی کا تذکرہ تفصیل سے لکھا ہے۔ 'اکبر' کا حال کوئی ۴۶ صفحوں میں ہے ' مگر سب ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ سے ماخوذ ہے ۔ افسوس کہ 'شفیق' نے اس میں تحقیق سے مطلق کام نہیں لیا۔ وہ اس مورخ کے ادعاےراست‌گوئی کو اس کے جذبات تعصب و حسد و رشک سے جدا نہ کرسکے ۔ علامہ ' فیضی ' کے حالات بھی بلا کم و کاست بدایونی سے نقل کردیے ہیں۔ 'شفیق ' بدایونی کو بالکل نہیں سمجھے —

' شام غریباں ' کے مقابلے میں اس تذکرے میں تاریخی واقعات اور لطائف و ظرائف بھی زیادہ ہیں ۔ بعض بعض مقامات پر اشعار کی شرح بھی کردی ہے اور ان کے نکات بھی بتادیے ہیں ۔ مثلاً میر محمد افضل الہ آبادی ' ثابت ' کے ایک قصیدے میں کثرت سے طبی تلمیحات و اصطلاحات ہیں' اس کے اشعار نقل

کرکے ان تمام تلمیحات و اصطلاحات کی شرح لکھی ھے - اسی شاعر کا ایک دوسرا معرکے کا قصیدہ ھے ' اس کا انتخاب درج کیا ھے اور اس کے مشکل مقامات کا حل بھی لکھ دیا ھے - یہ تذکرہ ھر لحاظ سے قابل قدر ھے —

—— (چمنستان شعرا) ——

یہ ریختہ گو شعرا کا تذکرہ ھے - 'شفیق' لکھتے ھیں کہ " جب ھندوستان سے تازہ تازہ میر محمد تقی 'میر' اور فتح علی خاں کے تذکرے پہنچے تو سارے عالم میں غلغلہ پڑگیا اور اشعار ھند کے اشتیاق میں ایک دنیا تہ و بالا ھوگئی' کیونکہ اھل دکن کو ان اشعار کا بہم پہنچنا دشوار ھے - اس لئے میری فکر ناقص میں یہ بات آئی کہ ان دونوں تذکروں کے اشعار اون اور دوسرے جواھر پارے ان کے ساتھ ملا کر ایک سفینہ تیار کروں - اس تقریب سے بعض احباب سخن داں کے حالات و کلام کے جمع کرنے کا موقع بھی مل جاے گا - دوست احباب نے بھی اس کی تائید کی بلکہ اصرار کیا اور میں اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ ھوگیا '' —

'شفیق' نے اس تذکرے کی ترتیب میں عجیب جدت دکھائی ھے - اب تک جتنے فارسی اردو کے تذکرے لکھے گئے ھیں (سواے میر صاحب کے تذکرے کے ' جس میں کوئی ترتیب نہیں) ان میں ناموں کی (یعنی تخلصوں کی) ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ھے ' لیکن 'شفیق' نے اس تذکرے کی ترتیب حروف ابجد یعنے حساب جمل کے لحاظ سے رکھی ھے - اس میں کوئی خاص خوبی نہیں معلوم ھوتی ' نہ خود مؤلف نے اس کی کوئی وجہ بتائی ھے - سوا اس کے کہ جوانی کی ترنگ کہا جاے اور کیا کہہ سکتے ھیں —

جوانی کا زمانہ ھے ' عبارت میں رنگینی پائی جاتی ھے ' بعض اوقات تشبیہات و استعارات میں باتیں کرتے ھیں - جہاں کہیں موقع ملتا ھے' شاعر کے تخلص یا اس کے پیشے وغیرہ کی مناسبت سے اُسی قسم کے الفاظ اور تشبیہات

میں اس کا حال لکھنا شروع کردیتے ہیں (مثلاً ملاحظہ ہوں : آشنا ' آوارہ ' بہار داؤد ' خاکسار ' زکی ' محمد علی حشمت ' مخلص ' ناطق وغیرہ کے حالات) لیکن عبارت گنجلک نہیں ' بیان صاف اور شستہ ہے اور زبان پر قدرت ہے - کہیں کہیں میر صاحب (میر تقي) کی طرح اصلاح بھی دے دیتے ہیں - یا شعر میں کوئی کنایہ یا خاص نکتہ ہوتا ہے تو اُس کی طرف بھی اشارہ کردیتے ہیں ' جس سے ' شفیق ' کی سخن فہمی اور سخن سنجی کا اندازہ ہوتا ہے --

اگرچہ ' شفیق ' نے اپنے تذکرے کی بنیاد میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں پر رکھی ہے لیکن ان کے علاوہ جہاں جہاں سے جو جو حالات مل گئے ہیں حوالے کے ساتھ اُن کا بھی اضافہ کردیا ہے - چنانچہ کتاب کے مطالعے میں بعض جگہ شاہ عبدالحکیم ' حاکم ' کے تذکرۂ ' مردم دیدہ ' اور تذکرۂ ' مجمع النفائس ' تالیف سراج الدین خان آرزو ' سرو آزاد ' اور حاجی علي ' اکبر ' رتّال اور رضا خان ' انوار ' کی بیاضوں کا حوالہ ملے گا —

بعض اوقات اشعار کے متعلق مغالطہ ہوجاتاہے اور یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اشعار خصوصاً مشہور اشعار مختلف شعرا کے کلام میں پائے جاتے ہیں ' ' شفیق ' نے اس باب میں بڑی احتیاط اور تحقیق سے کام لیا ہے - جن اشعار کا پتا نہیں چلا وہ تذکرے کے آخر میں جمع کر دیے ہیں کہ ان کا پتا چلانا دشوار ہے' خصوصاً اهل دکن کے لئے ' کیونکہ ایک ہی تخلص کے کئی کئی شاعر ہیں - ہندوستان سے اشعار اکثر صرف تخلص کے ساتھ آتے ہیں - اور نادان پڑھنے والے سب کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ شعر حقیقت میں کس کا ہے —

' شفیق ' ہر شاعر کے تذکرے میں انصاف کو ملحوظ رکھتا ہے اور کبھی کسی پر ناگوار نکتہ چینی نہیں کرتا - چنانچہ ' یقین ' کے بیان میں خود لکھتا ہے کہ " جب کسی شاعر کے کلام میں کوئی ثقیل مصرع نظر پڑا تو خود ایک

دوسرا مصرع لکھ دیا ہے اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا ہے کہ یہ مصرع بھی خوب معلوم ہوتا ہے" - اپنے مصرع کو ترجیح نہیں دی ' بلکہ پڑھنے والے کی پسند پر چھوڑ دیا ہے —

لیکن ' یقین ' کا تذکرہ مستثنیٰ سمجھنا چاہئے - اس میں اس نے اس قدر مبالغے بلکہ غلو سے کام لیا ہے کہ خلاف عادت ' شفیق ' کو اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہا ' وہ اسے اردو کا سب سے بہتر شاعر خیال کرتا ہے اور ہند و دکن میں کسی کو اس کی ٹکر کا نہیں سمجھتا - کہتا ہے کہ " اگر چہ میرزا سودا کا غزل ' رباعی ' مخمس ' مثنوی ' قصیدے ' قطعہ بند وغیرہ میں بڑا رتبہ ہے ' اور وہ بہت عالی تلاش کرتے ہیں ' لیکن ' یقین ' کے ریختے میں کچھ اور ہی فصاحت و ملاحت ہے :-

اگر ہزار برس تک یہ میرزا ' سودا '
کرے جو فکر تتبع ' یقیں ' کا از دل و جاں
کہے گا معنی باریک و خوب و شیریں تر
ولے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں ؟

وہ یکتاے عصر اور یگانۂ زمانہ ہے اور ایسا معنی آفریں اور نکتہ رس دنیا میں پیدا نہیں ہوا " - میر صاحب نے اپنے تذکرے میں جو ' یقین ' پر طعن و تعریض کی ہے اور اسے " متبدل بند " کہا ہے اور سرقے کا الزام لگایا ہے تو اس پر ' شفیق ' آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور میر صاحب کو خوب سخت سست کہتا ہے ' ' سودا ' نے جو میر صاحب کی ہجو کہی تھی ' اسے نقل کرکے اُس کی داد دیتا ہے - اس کے بعد ' توارد ' و ' سرقہ ' پر بحث کی ہے ' دوسرے علما کے اقوال نقل کئے ہیں اور خود اپنا قطعہ بھی جو اس مضمون پر لکھا ہے نقل کیا ہے - غرض میر صاحب کے خلاف خوب زہر اُگلا ہے اور خود میر صاحب کے ذکر میں بھی اُن کی حرمت گہری پر چوٹ کی ہے —

غرض ' یقین ' کی شاعری کا بہت بڑا مداح اور معتقد ہے اور اُس کی تقلید کو فخر سمجھتا ہے - اپنے کلام میں کہیں کہیں اس کا اشارہ کیا ہے - مثلاً ایک غزل کا مقطع ہے :

دیوان ' یقیں ' خوش خط ' صاحب' نے لکھا یاہے
اوراق طلائی پر کھینچی ہیں کی تحریریں

یقین کا تذکرہ اور کلام تقریباً ۹۳ صفحوں میں درج ہے - اسی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ وہ اس شاعر کو کیاسمجھتا تھا —

حاجی میر علی اکبر رمال ' حاجی ' سے ' شفیق ' نے رمل وغیرہ کی تحصیل کی تھی - ' حاجی ' کے تذکرے میں خود بھی اپنے اظہار کمال کے لئے ایک زائچہ دیا ہے ' جس سے عام ناظرین کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی ' اِسے ایک نوجوان طالب علم کا شوق نموہ و نمائش سمجھنا چاھئے —

'شفیق ' کا تذکرہ میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں سے بڑاہے اور بہت سے ایسے شعرا کا تذکرہ درج ہے ' جو ان دونوں میں نہیں پایا جاتا - بہت سے ایسے ہیں جو 'شفیق' کے ہم عصر ہیں اور جن سے اس کی ذاتی ملاقات ہے اور خود ان شاعروں سے اُن کا منتخب کلام لے کر درج تذکرہ کیا ہے - ایسے حالات خاص طور پر قابل اعتبار ہیں —

سب سے قابل تعریف بات یہ ہے کہ 'شفیق' نے یہ تذکرہ ۱۸ برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور بغیر کسی کی مدد کے بہت تھوڑے عرصے میں ختم کر دیا - اس عمر میں ایسی اچھی کتاب کا تالیف کرنا اعجاز سے کم نہیں' اس سے ' شفیق' کی غیر معمولی ذہانت اور لیاقت معلوم ہو تی ہے - کتاب کا نام " چمنستان شعرا " تاریخی ہے اور اس سے ۱۱۷۵ھ سن تالیف نکلتا ہے —

جہاں تک تحقیق کیا گیا ' اس تذکرے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے' جو کتب خانۂ آصفیۂ سرکار عالی حیدر اباد میں ہے اور یہ بھی کرم خوردہ ' فرسودہ اور

مشکوک ہے - یہ اسی نسخے کی نقل ہے - اس کی تصحیح میں بیحد دقت اُٹھانی پڑی ' بعض عبارتیں اصل کتب سے ' جو اس کا ماخذ ہیں ' صحیح کرنی پڑیں ' کہیں قیاس سے کام لینا پڑا اور بعض بعض مقام پر کچھ الفاظ جو کتاب کے ازلی کیڑے چٹ کر گئے ہیں' ویسے ہی چھوڑنے پڑے اور اُن کی جگہ نقطے دے دیے ہیں ' بہت سے اشعار جو تذکرے میں مشکوک یا کرم خوردہ تھے ' شعرا کے اصل دیوانوں سے تلاش کر کے لکھے گئے - بعض الفاظ جو مشتبہ تھے اور ان کی صحت نہ ہو سکی' ان کے سامنے استفہام کی علامت لکھ دی گئی ہے - اس کے بعد بھی ممکن ہے کہ غلطیاں رہ گئی ہوں ' اگر دوبارہ اشاعت کی نوبت آئی تو جہاں تک ممکن ہوگا اصلاح کی کوشش کی جاے گی --

ایک کام اس کی ترتیب میں اور کیا گیا ہے' جسے غالباً ناظرین پسند فرمائیں گے ' یعنے ' تحفۃ الشعرا ' تالیف افضل بیگ خاں قاقشال اورنگ‌آبادی (سنہ تالیف ۱۱۶۵ ھ) سے اُن ریختہ گو شعرا کا حال اور کلام جو ' شفیق ' کے ہاں بھی پاے جاتے ہیں حاشیے میں درج کردیا ہے - جن جن شاعروں کا اس میں اُردو کلام نہیں وہاں صرف حالات ہی لکھ دیے گئے ہیں اور جہاں حالات میں کوئی نئی بات نہیں ہے وہاں صرف کلام پر اکتفا کیا گیا ہے - مشترک کلام ہر جگہ خارج کردیا گیا ہے - بعض شاعر ایسے بھی ہیں ' جن کا ذکر ' چمنستان ' میں نہیں ہے ' اُن کا حال اور کلام ہر حرف کے آخر میں درج کردیا گیا ہے - اس سے پڑھنے والوں کو ضرور بصیرت ہو گی اور وہ ' تحفۃالشعرا ' کے مطالعے سے مستغنی ہو جائیں گے - یہ تذکرہ ' چمنستان ' سے پہلے کا لکھا ہوا ہے- اصل میں یہ تذکرہ فارسی گو شعرا کا ہے' اس میں ضمناً ایسے شعرا بھی آ گئے ہیں جو اُردو میں بھی شعر کہتے تھے بعض شعرا کے حالات اس میں کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں —

—— (شفیق کا کلام) ——

'شفیق' کے اُردو کلیات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پر گو شاعر تھا ' زبان پر قدرت تھی اور شاعری کے نکات سے خوب واقف تھا۔ اور اس کا کلام شعر کی تقریباً ہر صنف میں موجود ہے۔ اگرچہ وہ اردو کا اعلیٰ درجہ کا شاعر نہیں ہے مگر اوسط درجے کے شعرا میں اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ غزلوں کے علاوہ قصیدوں اور مثنویوں میں خوب زور دکھایا ہے۔ شہر آشوب ' واسوخت ' مخمس ' مثلث ' رباعیاں اور تضمینیں بھی لکھی ہیں۔ ان نظموں سے کہیں کہیں 'شفیق' کے ذاتی حالات کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً 'شفیق' نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے فرزند میر احمد علی خاں عالی جاہ کے متوسلین میں سے تھے۔ یہ بڑے قدر داں اور 'سخنور' رئیس تھے اور 'شفیق' کو انہیں کی سرپرستی سے تعلق تھا۔ ان کی مدح میں اس نے کئی قصیدے لکھے ہیں۔ چنانچہ ایک قصیدے میں صاف صاف نام اور پتا بتا دیا ہے :—

یک زبردست ہے مرا والی
یک قوی دل مرا ہے پشت و پناہ
حق و باطل ہے سامنے جس کے
یوں عیاں جس طرح سفید و سیاہ
یعنے نواب میر احمد خاں
اسد الملک حضرت عالی جاہ
باپ جس کا نظام دولت و دیں
جد ہے جس کا جناب آصف جاہ

ایک دوسرے قصیدے میں لکھتے ہیں :

جناب پاک یعنے میر احمد خاں عالی جاہ
کہ جس کی عمر و دولت کا نگہباں ایزد سبحاں

آگے چل کر سفر میں رهنے کی صعوبت اور اپنے ضعف کی شکایت کی ہے - اس سے معلوم هوتا هے که اُن کی ملازمت ایسی تھی ' جس میں دورہ کرنا پڑتا تھا - چنانچه کہتے هیں :—

مگر فضل خداوندی مری اب دستگیری کر
نشست شہر فرماوے عنایت کر کے نیم ناں

آخر میں اپنے لڑکے کے لیے درخواست کی هے :—

مدد خرچ اب مرا دستخط هوے اس بندہ زادہ کو
تعیں هو تیوڑهی کا بلدہ کی جب تک کہ هے ناداں

ایک اور قصیدے میں بھی اپنے آقا کا نام اور خطاب کا ذکر کیا هے :—

چراغ دودۂ حیدر جناب میر احمد خاں
که جس کے جد کے تیں چرخ بریں سے ذوالفقار آئی
وو اسدالملک اسدالله اس کا بانهه بل ذت هے
که جس کی دهاک سے شیروں کو تب بے اختیار آئی
نظام الدوله آصف جاہ کا فرزند ارشد هے
که دولت جس کے در په جهه سا امیدوار آئی

ایک صاحب سے ' شفیق ' کو بے حد الفت هے اور اکثر غزلوں میں انتہائے محبت سے " میرا میاں میرا میاں " کر کے اُسے یاد کیا هے - بعض غزلیں کی غزلیں اس کی یاد میں (" میرا میاں " کی ردیف میں) لکھه ڈالی هیں - ایک قصیدہ بھی اسی ردیف میں لکھا هے اور بڑے شوق اور محبت سے اس کا ذکر کیا هے - جس کے دوچار شعر یه هیں :-

هے مرا ایمان و جاں میرا میاں ۔ مجکو هے ورد زباں میرا میاں
انتظاری کی نہیں طاقت مجھے ۔ جلد آ میرے میاں میرا میاں
گُل ملے بلبل کو اور قمری کو سرو ۔ میرے تیں میرا میاں میرا میاں

ایک غزل میں معمے کی طرز میں نام بھی بتا گئے ھیں اور وہ نام
" شکرو میاں " ھے —

'ذکا' (سید امتیاز خاں) سے بھی اپنی عقیدت کا بار بار اظہار کیا ھے:-

عقیدت ھے 'ذکا' سے میرے تیں از بسکہ اے 'صاحب'
مجھے ورد زباں ھے رات دن یا پیر یا ھادی

ایک دوسری غزل کے مقطع میں کہتے ھیں :

یک آن جدائی نہ ھو 'صاحب' سے 'ذکا' کو
اللہ کرے میری جو نیت ھے بر آوے

'شفیق' کو ادبی تحقیق و نکات سے خاص ذوق تھا۔ توارد پر جو بحث اس نے کی ھے اور ایک غزل کے ضمن میں جو قطعہ توارد پر لکھا ھے وہ سب اس تذکرے میں موجود ھے۔ اردو کلیات میں ایک قصیدہ نظر پڑا جس کا مطلع یہ ھے:-

ساقی اس ابر مشک فام کو دیکھ   اِس طرف دیکھ مے کے جام کو دیکھ

کچھ شعر لکھنے کے بعد گریز کی ھے اور الفاظ کے متحرک و ساکن ھونے کی بحث کا ذکر کیا ھے۔ معلوم ھوتا ھے کہ اُن کے ایک ھم عصر "مفتوں" نے ان کے ایک لفظ پر اعتراض کیا تھا۔ اس کا جواب دیا ھے۔ 'شفیق' نے ختم (بسکون تا) کو ختم (بہ فتحہ تا) لکھ دیا تھا۔ معترض کی تردید اور اپنی تائید میں یہ اشعار لکھے ھیں:-

گر ختم کہوے ختم کو "صاحب"   ھے روا حرکت مقام کو دیکھ
ریختہ کی زباں میں یہ غلطی   ابتدا سے ھے انتظام کو دیکھ
'آبرو' زلف کو زلف بولا   اور الفاظ نا تمام کو دیکھ
نقل ھے وقت مغرب 'اعظم شاہ'   یوں کہا اپنے یک غلام کو دیکھ
ھووے "اسواری" اس گھڑی تیار   سیر چاھے ھے جی پہ شام کو دیکھ
مولوی 'جیوں' اوستاد شاہ   تب کہے یوں تو اس پیام کو دیکھ

لفظ 'اسواری' نہیں سواری ہے — کچھ تو اس صحت کلام کو دیکھ
شاہ نے تب تو یہ جواب دیا: — میری طرز سخن تمام کو دیکھ
یہ عبارت کہا میں ہندی میں — اس میں جائز ہے تو نظام کو دیکھ

'شفیق' کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ عربی کے جو لفظ عام طور پر اُردو میں بہ تبدیل حرکت وغیرہ بولے جاتے ہیں اور جو زبان زد خاص و عام ہوگئے ہیں وہ اسی طرح فصیح ہیں' خواہ وہ اصل لغت کے اعتبار سے غیر صحیح کیوں نہ ہوں۔ ہر زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے ہیں تو لہجے کے تغیر سے کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہوجاتی ہے —

علاوہ غزلوں اور قصیدوں کے 'شفیق' کا زور کلام دیکھنا ہو تو اُن کی مثنوی "تصویر جاناں" دیکھنی چاہیے جو رسالۂ 'تجلی' حیدرآباد دکن میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں بڑا زور سراپا کے بیان میں دکھایا ہے۔ اگرچہ یہ مضمون بہت پامال ہے اور ہمیشہ بھونڈا اور بے مزہ ہو کر رہ جاتا ہے اور یہی حال اس مثنوی کے سراپا کا بھی ہے' تاہم اس سے 'شفیق' کی قادر کلامی کا اندازہ ہوتا ہے —

اگر کوئی 'شفیق' کے نام اور حال سے واقف نہ ہو اور اس کا کلام پڑھے تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا لکھنے والا ہندو ہے۔ وہ تمام بزرگان دین اسلام کا ذکر اُسی ادب' احترام اور عقیدت سے کرتا ہے' جیسے کوئی سچا اور پکا مسلمان۔ اور یہ کوئی تصنع سے نہیں بلکہ در حقیقت دل سے اور عقیدت سے ہے۔ معراج کے بیان میں جو مثنوی لکھی ہے اور جو "اردو" میں شائع ہوچکی ہے' اُسے دیکھئے' کوئی مسلمان اس سے بڑھ کر کیا لکھے گا۔ اردو کلیات میں ان کے متعدد قصیدے حضرت علی کی شان میں ہیں۔ امام آخرالزماں کی منقبت میں کئی قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ حضرت غوث‌الاعظم جیلانی کی مدح میں ہے۔ ایک حضرت گیسو دراز بندہ نواز کی

تعریف میں ۔ علاوہ ان قصائد کے اُن کے تمام کلام میں جہاں کہیں مسلمانوں کے بزرگوں اور اولیا کا ذکر آتا ھے تو وہ اُن کا نام اور ذکر اسی عقیدت اور ارادت سے کرتا ھے جیسے مسلمان ۔ اس کے کلام میں اسلامی تلمیحات کثرت سے آتی ھیں ' بر خلاف اس کے ھندو دیوتاؤں وغیرہ کا ذکر شاذ ھی کہیں آیا ھو تو آیا ھو ۔ یہ تعلیم ' صحبت ' ماحول اور اس زمانے کے اقتضا کا اثر تھا ۔ آج کل کے لوگوں کو شاید یہ چیزیں پڑھ کر حیرت ھو ' لیکن یہ اُس زمانے کی یادگاریں ھیں ' جب ھندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح رھتے سہتے تھے اور کسی کو کسی سے پرخاش نہ تھی ۔ یہ خوش حالی ' امن و آزادی اور ترقی کی شان تھی ۔ جب افلاس کا منحوس قدم آیا تو جہالت ' تنگ دلی ' تعصب اور نا عاقبت اندیشی نے ایسا اندھا کردیا کہ وہ اپنے پانو پر خود کلھاڑی مارنے لگے ۔ ایک دن آے گا کہ وہ اپنے کئے پر پچھتائیں گے اور گلے مل مل کر اپنے آنسوؤں سے اس داغ کو دھوئیں گے —

' شفیق ' نے " حسب حال زمانہ " کے عنوان سے ایک شہر آشوب بھی لکھا ھے ' جس کے ابتدائی چند شعر یہ ھیں :—

ایک دن دل نے کہا مجھ سے کہ 'صاحب' سن اِدھر
کیوں ریاست دن بدن ایسی ذلیل اور ھے بتر
اس دکن کے بیچ چھ صوبوں کے چھ تھے بادشاہ
عادل اور فیاض' صاحب عزم اور صاحب ھنر
اُن کی دولت میں مرفہ اور سبھی خوش حال تھے
کیا رعیت' کیا سپاھی' کیا امیر نامور
آسماں ووھی ھے اور ووھی زمیں ' خلقت ھے وو
پھر ھوئی کس واسطے یہ زندگانی مختصر

شامت نیت ہے یا تدبیر میں ہے کچھ قصور
تب تو دشواری پڑی ہے ہر کسی کو اس قدر

زمانے کی یہ شکایت ہر عہد میں رہی ہے اور رہیگی۔ آسمان نے ہزاروں رنگ بدلے، دنیا نے سینکڑوں پلٹے کھائے، مگر انسان کی شکایت کم نہ ہوئی۔ بے عیب نہ کوئی کتاب ہے، نہ کوئی آدمی، نہ کوئی نظام ہے اور نہ کوئی زمانہ۔ یہ نقص کسی نہ کسی صورت میں رہتی دنیا تک رہے گا۔ بلاشبہ انسان کے کمال کی آزمائش اسی میں ہے —

بانگِ کُن

قدیم اردو

حسن شوقی

از

(اڈیٹر)

---

(۱)

حسن شوقی عادل شاہی شعرا میں سے ہے اور سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ تا سنہ ۱۰۶۷ ھ) کے عہد میں تھا۔ اس کا پتا اس بات سے لگتا ہے کہ اس نے ایک نظم "میزبانی نامۂ سلطان محمد عادل شاہ" لکھی ہے، جس کا ذکر آگے آے گا۔ افسوس ہے کہ اس کا حال مجھے کسی تذکرے میں نہیں ملا۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اپنے زمانے کے مشہور شعرا میں سے تھا۔ چنانچہ ابن نشاطی نے اپنے قصۂ پھولبن کے آخر میں جہاں چند مشہور اور نامور دکنی شعرا کا ذکر کیا ہے، وہاں حسن 'شوقی' کا بھی نام لیا ہے —

حسن شوقی اگر ہوتا فی الحال ہزاراں بھیجتا رحمت سنج اپرال

پھولبن کا سنہ تصنیف ۱۰۶۶ ھ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حسن شوقی کا انتقال ہو چکا تھا —

علاوہ غزلیات کے مجھے حسن 'شوقی' کی دو نظمیں ملی ہیں۔ ایک

"فتحنامۂ نظام شاہ" یا "ظفر نامۂ نظام شاہ" اور دوسری "میزبانی نامۂ سلطان محمد عادل شاہ"۔ فتح نامے یا ظفر نامے کے میرے پاس دو نسخے ہیں، جن میں سے ایک نسخہ ناقص ہے۔ ناقص نسخے کے آخر میں اشعار زائد ہیں۔ ان میں فتح کا سنہ بھی دیا ہے اور نظام شاہ کو بہت بہت دعائیں دی ہیں۔ جیسے کوئی زندہ شخص کو دعائیں دیتا ہے، مثلاً۔

سدا جیو راجے جلم راج کر   بسے الگ دنیا نت نیا کاج کر
مبارک ظفر آسمانی اچھو   تجے فتح نصرت سبحانی اچھو

یہ فتح سنہ ۹۷۲ ھ میں ہوی اور ظاہر ہے کہ اس وقت شوقی زندہ نہیں تھا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ اشعار الحاقی ہیں۔ اسی نسخے کے آخر شعر میں شاعر کا تخلص بھی ہے۔ دوسرے نسخے میں یہ شعر نہیں ہے —

یہ جنگ جس کی فتح اس مثنوی میں سنائی گئی ہے، تالی کوٹ کی مشہور لڑائی ہے۔ اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں وجیا نگر کی حکومت نہایت شان و شوکت کی تھی۔ رام راج نے تمام باغی راجاؤں کو مغلوب کر لیا تھا اور اس کی سلطنت کرشنا سے ایکر راس کماری تک پھیلی ہوی تھی اور رفتہ رفتہ گوداوری کے دھانے تک پہنچ گئی تھی۔ اور بہت سے راجا اس کے باج گزار تھے۔ اس وقت جنوب میں رام راج سے بڑھ کر کوئی طاقتور اور زبردست راجا نہ تھا اور اس کی دولت اور شان کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بہمنی سلطنت کے زوال پر جو مسلمان حکومتیں اس کی جگہ قائم ہوئیں، ان کی باہمی نزاع سے وجیا نگر کی قوت اور بڑھ گئی اور کرشنا اور تنگ بھدرا کا دوآبہ بھی ایک طرح سے رام راج ہی کے زیر اثر آگیا۔ اس قوت اور عروج کے گھمنڈ پر رام راج نے طرح طرح کی دست درازیاں شروع کیں۔ تالی کوٹ کی جنگ سے چند سال قبل رام راج نے عادل شاہ سے مل کر نظام شاہ کو سخت شکست دی اور اس کے سارے ملک کو تباہ و برباد کردیا۔ نظام شاہ مجبور ہو کر اپنے دارالحکومت احمد نگر میں

محصور ہو گیا۔ یہاں رام راج اور اس کے سرداروں نے بہت بد عنوانیاں کیں۔ مسجدیں توڑ ڈالیں، مشائخ قتل کردیے گئے، عورتوں کی آبرو ریزی کی اور اسی قسم کی شرمناک حرکتوں کے مرتکب ہوے۔ مسلمان بادشاہ اس سے بہت برافروختہ ہوے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر جو بات ان بادشاہوں کو ناگوار خاطر تھی وہ رام راج کا غرور و تکبر تھا۔ وہ پہلے کی طرح کبھی اُن سے خلوت میں نہ ملتا اور جب کبھی دربار میں بلاتا تو سیدھے منہ بات نہ کرتا اور دیر تک کھڑا رکھتا۔ سواری کے وقت انھیں ساتھ ساتھ پیدل چلاتا، جب اجازت دیتا تو سوار ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی عادل شاہ، ابراھیم قطب شاہ، نظام شاہ اور برید شاہ نے متحد ہو کر اس پر لشکر کشی کی۔ رام راج کو اپنی قوت اور دولت پر اس قدر گھمنڈ تھا کہ اس نے اس کی مطلق پروا نہ کی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اِن چھوکروں کو ایک ہی حملے میں پسپا کردوں گا۔ اگرچہ بہت بڈھا تھا مگر خود میدان کار زار میں پہنچا۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ مختصر یہ کہ رام راج اسی میدان میں مارا گیا اور وجیا نگر کی پر شان و شکوہ سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا —

'شوقی' نے اس جنگ کا حال شاعرانہ طرز پر لکھا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا نام "فتح نامۂ نظام شاہ" کیوں رکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو حسین نظام شاہ کو رام راج بہت ذلیل کر چکا تھا اور وہ انتقام کی فکر میں تھا۔ دوسرے نظام شاہ نے اس جنگ میں بڑی دلیری اور شجاعت دکھائی۔ قلب لشکر اسی کے زیر کمان تھا۔ جب ہندوؤں کی فوج نے یمین ویسار سے ایک شدید حملہ کیا تو مسلمان فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اس سے علی عادل شاہ اور قطب شاہ پر مایوسی چھا گئی اور انھوں نے بھاگنے کی فکر کرنی شروع کی۔ مگر نظام شاہ قلب لشکر میں برابر جما رہا اور اس زور سے غنیم کے حملے کا جواب دیا کہ رام راج کے لشکر میں کھلبلی پڑ گئی۔ شامت اعمال سے یہ

دیکھ کر راجا تخت سے اُتر کر پھر سنگھاسن میں سوار ہو گیا کہ اتنے میں نظام شاہ کا ایک مست ہاتھی غلام علی نامی وہاں آ پہنچا اور آدمیوں کو پامال و ہلاک کرنے لگا۔ کہار (بھوئی) اِس پریشانی میں سنگھاسن پٹک کر بھاگ نکلے۔ اتنے میں کہ راجا سنبھلے سنبھلے مسلمان فوج کا ایک دستہ آ پہنچا اور وہ اُسے پکڑ کر نظام شاہی توپ خانے کے افسر رومی خاں کے پاس لے گئے۔ رومی خاں نے نظام شاہ کے حضور میں پیش کیا۔ نظام شاہ نے فوراً حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر کے نیزے کی نوک پر چڑھایا جائے اور مشتہر کیا جائے تاکہ غنیم کو حقیقت حال معلوم ہو جائے۔ اس لحاظ سے بھی فتح کا سہرا نظام شاہ ہی کے سر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ 'شوقی' نے اس فتح کو نظام شاہ سے منسوب کیا اور اپنی نظم کا نام "فتح نامۂ نظام شاہ" رکھا —

شروع میں چند شعر حمد میں ہیں:

الٰہی کرم کا کرنہار توں ہے اوّل و آخر رکھنہار توں
سو قادر ہے قائم تو پروردگار توں نادر ہے دائم اچھیں برقرار
کیا ہور کرتا کرے کا سو ہوئی ترے باج ہرگز کرے نا کوئی

دو چار اور شعر لکھنے کے بعد دو شعر نعت میں ہیں اور اس کے بعد آغاز جنگ شروع ہو جاتا ہے۔ پہلا عنوان یہ ہے:

"شروع جنگ کردن رام راج و نظام شاہ و عادل شاہ و قطب شاہ و برید شاہ"

ابتدا میں شاعر بیان کرتا ہے کہ دنیا میں کیسے کیسے شجاعت اور دولت اور نام والے لوگ ہوے ہیں، جن کی شہرت اور کار نامے اب تک یاد گار ہیں۔ اور اس ضمن میں سکندر، نو شیرواں، جمشید، حمزہ، محمود غزنوی، رام چندر، کشن، ارجن، شدّاد، ہامان وغیرہ کے نام گنا تا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ انسان کی خوبی اُس کے افعال سے ہے اور ہر ملک اور قوم میں اچھے لوگ ہوتے ہیں —

سدا ہے سو بھر پور دریا کوں جل شرت ہے سیپی کوں سو موتی بدل

شرت مرد کا ہے چلنت خوب خاص — جو پھولوں کی خوبی سوں پھولوں کی باس
ہر ایک ملک میں نیک رفتار ہے — ہر ایک قوم میں نیک گفتار ہے

اس کے بعد ہر ملک کی خاص خاص خوبیاں بیان کرتا ہے اور ملک دکن کو سب سے افضل ٹھیراتا ہے :

خراساں کے شاہاں ہیں شمشیر بند — روھیلے پٹھاناں و کرزی کمند
عرب ہور عجم ملک لڑنے کو زور — وو رایل جیتے راج ہیں دزد چور
وو حکمت کرا ملک ہے روم و شام — طرف کربلا کے شہیداں تمام
وو ایران و توران ہور ملک سند — اہیں پرُ عقل بادشاہاں ہند
ہنر کا جیتا لوک ہے مغربی — وو جامع اہیں گنج کے مغربی
وو قبطی فراست میں ہیں زور ور — شمالی جیتے بے فہم کاو خر
سو افضل میانا ہے ملک دکن — ہوے یاں کے شاہاں جیتے خوش لگن

اب دکن کے بادشاہوں کا ذکر کرتا ہے :

عادل شہ اکھا وہی علی کے غلام — نظام شاہ بھری لگیا وہیں نظام
عدل داد ہور دے دھش کو اگل * — کیا بادشاہی سو بازو کے بل
قطب شہ کے گھر میں سدا راجرت † — بریدی تھے جزوی جیو کے گوت ‡

اس کے بعد آپس میں عہد و پیمان کرنے اور متحد ہو کر رام راج سے لڑنے کا ذکر کرتا ہے :

اپس میں اپیں دوست سب مل ہوے — محبت سوں اخلاص یک دل ہوے
نزاع دل میں کا دور کیتے نفاق — اپس میں اپیں مل کئے اتفاق
یو سب مل کے ایسا کئے یک پنا — جو اِس کفر کو مار کرنا فنا
کئے بھاک سوگند و عہد استوار — یو غازی غزا پر ہوے برقرار

---

* بڑھا ہوا ، سبقت لے جانے والا - † بادشاہی ‡ قوی -

نکو تر بلاتی جو شب درمیاں * دیکھیں کیا چرخ پھیر ہے آسماں

اس کے بعد دوسرا عنوان یہ ہے :

"رائے اندیشیدن امراء با وزیران خود برائے جنگ کردن بہ نظام شاہ"

اس کی ابتدا شاعر نے سورج کے ڈوبنے، رات کے آنے اور چاند کے نکلنے سے کی ہے اور اپنی شاعری کا کمال دکھایا ہے۔ یہ نظامی وغیرہ فارسی شعرا کی تقلید کی ہے لیکن ہندی الفاظ اور ہندی خیال کی آمیزش نے اسے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ یہاں چند شعر نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں :

وو مغرب دس† کی سنواری اپس   مرصع زرینا نگارو‡ اپس
سر کوکم و کیسر چوا ہور چندن   لیتے مشک کے ارگت چندر بدن
کھولے بال سر کے سو کالے دراز   سنواری بیٹھی ایکہ اپنا سو ساز
وہ موتی نگر کے سو تارے ہوئے   وو بیس$ پھول سارے ستارے ہوئے

اس منظر کے بیان میں کوئی چوبیس شعر لکھے ہیں، آخری شعر یہ ہیں :

ڈوبی تاب زریں سو غرقاب میں   گئی حور زنگی کرے§ خواب میں
حبش نے پھوان چیر سر پر لیا   ترک دیکھ پر نار سر تل کیا
حبش تی جو پرگٹ ہوا چند روپ   حبش نے جنے ترک چینی سروپ
بیٹھا کاگ کالا اوڑیا راج ہنس   اوٹھی سیام سندر سو تاراج اونس
پڑیا پھول پر جب بھنور پنکھ پسار   چھپیا ترک زنگی کھڑا آشکار
بیٹھا ¶ دھن اوپر آکر کال جو   ہوا سورتل چاند اوجال جو

---

* "مترس از بلائے کہ شب درمیان است" کا ترجمہ ہے ۔

† رات   ‡ نگہبانی $ سر   § کے

¶ مطلب یہ کہ خزانے پر کالا سانپ آ بیٹھا، یعنی اندھیرا ہوگیا، سورج غروب ہوگیا اور چاند طلوع ہوا ۔

اس سمے میں رام راج تخت پر آکر بیٹھتا ہے اور دربار کرتا ہے

بیٹھیا ، رام تب آ سیاسن* اوپر سکت† مال گل‡ گھال$ ابرھن§ اوپر

سو ڈنڈوت کئے آڑ کر راسہ سب جتے راے رایل پڑے پاے سب

اب رہ خلوت میں خاص خاص مصاحبوں اور ارکان سلطنت کو بلا کر مشورہ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ نظام شاہ نے میرے دل میں گھاؤ ڈال دئے ہیں ، تمام دنیا میری حکومت کو مانتی اور مجھے خراج دیتی ہے۔ بڑے بڑے راجہ مجھے جھکتے ہیں ، لیکن یہ ترک مجھے خاطر میں نہیں لاتا ، نہ یہ دیو کو مانتا ہے نہ پری کو خراج دیتا تو درکنار اور ڈراتا اور دھمکاتا ہے۔ آج چار دانگ عالم میں میرے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اس کی کیا یہ حقیقت ہے۔ اب تم مجھے سوچ کر مشورہ دو کہ اس معاملے میں کیا کروں

کیا رام خلوت منے انجمن بلایا جتے راے اور راے زن

چندر بھان یلدم وینکٹا دھری¶ جلن بھار سوں دھرتری تھرتھری

رتن جرت چوکی دھریا سامنے کہا بیس۞ مجھ آ منے سامنے

کہیا رخت ہوات کے تم تھانب♄ ہیں تمیں مرد میداں کے رن کھانب♉ ہیں

تمیں پانچ تن ملکہ♌ یک بدکہو تمیں پانچ جن ملکہ یک سد کہو

بہوت دن تی چھاتی منے سل ㉿ اہے نظامیا سوں مجھے آج سو دل♆ اہے

اس کے بعد کا عنوان یہ ہے :

" راے دادن وزیراں رام راج را درباب جنگ نظام شاہ "

سب وزیر اور مشیر یک زبان ہوکر کہتے ہیں کہ آج دنیا میں تیرا وہ

---

* سنگاسن ، تخت † تاج ‡ گلے کا ھار $ ڈالکر

§ جواہرات ، لباس فاخرہ ¶ رام راج کے بھائی کا نام تھا

۞ بیٹھ ۔ ♄ تھم ، ستون ♉ کھم ، ستون یعنی جنگ کے ستون ۔

♌ ملکر ㉿ کرب ، پہ چھنی ، تکلیف ♆ جنگ

زور ہے کہ کسی راجہ یا بادشاہ کی مجال نہیں کہ تیرے سامنے آنکھ اُٹھا سکے۔ تو وہ شہ زور ہے کہ شیر اور سیمرغ تیرے آگے کبوتر کے بچے ہیں۔ نظام شاہ بچارے کی کیا حقیقت ہے —

کہاں رام راجا کہاں شاہ حسین
کہاں بحر قلزم کہاں قلتبن

توں گرمی منے شا تی کم نہیں توں سردی منے ماہ تی کم نہیں
اندھارے اجالے کوں توں دھوپ چھانوں خرابی کو توں گڑہ و بستی کو گانوں
وو گرمی کرے توں تو سردی سوں ٹال وو سردی کرے توں تو گرمی سوں جال†

یہ سب کچھ کہنے کے بعد یہ رائے دی کہ حسین نظام شاہ کو لکھا جائے کہ وہ نقد و جواہر، اسلحہ، عود و عنبر اور ملک میدان (توپ) وغیرہ وغیرہ بطور خراج کے بھیجے۔ اس مشورے کے مطابق اب خط لکھنے اور بھیجنے کی تیاری ہوتی ہے —

"نامہ نوشتن رام راج بہ نظام شاہ و طلب کردن بعضے اشیاے عجائب"

نامے کے شروع میں خدا کی حمد و ثنا ہے، اس کے بعد لکھا ہے کہ کفرو اسلام میں کوئی فرق نہیں، سب میں اس کا جلوہ ہے اور انسان سب ایک ہیں

توں شداد ہور عاد نمرود کوں جدا کر نہ بوجھ توں معبود سوں
اگر فیل و مور اژدر و بق اہے ہر یک شے منے مظہر حق اہے
توں کرتا ہے انکار کفار سوں نہ کفار سوں بلکہ کرتار سوں
اہے کفر و اسلام کر زنار کا جو جینے میں توا کا سو زنار کا
ولے جو ہوا سو موحد ہوا موحد ہوانیں سو ملحد ہوا
کہے شیخ سعدی نے عالم کو پند بنی آدم اعضاے یک دیگرند

پھر ہدایت کی ہے کہ تو گاے کا گوشت کھانا چھوڑ دے۔ مکے کی جگہ

• چھانوں † جلا —

ترمل کو سمجھ اور عرب کی بجائے جنگموں کی پرستش کر - یلورا اور دولت آباد کی حفاظت کر

توں کر یاورے کی بنیاد کوں — جو خجلت اچھے قصر شداد کوں
نہ کم مال دے دولت آباد کوں — نہ سر پار کر دیکھ شہشاہ کوں

غرض اس قسم کی نصیحتیں کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ میرے حوام کو خدا کی ذکات سمجھ اور یہ یہ چیزیں فوراً بھیج دے۔ اس میں گھوڑے، زیور، جواہرات، ہتھیار، طوائف، رنڈیاں، لونڈیاں، سلطان فیروز کی زبرجد کی صراحی اور یاقوت کا پیالا، دنیا بھر کی چیزیں آجاتی ہیں - اس کے بعد لکھتا ہے کہ یہ خراج تونے مجھے بھیج دیا تو اس کے صلے میں میں تجھے احمد نگر بخشدوں گا۔ خط کے آخر میں فخریہ اشعار ہیں جن میں یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر تعمیل نہ کی تو نظام شاہی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا

نہ ترکاں کوں چھوڑوں نہ ترکی کماں — اگر کیو رستم ہو حاضر ضماں
نہ چھوڑوں مُلانا نہ چھوڑوں فقیر — نہ بڑکا نہ اڑکا نہ برنا نہ پیر
اوک دور بنیاد اسلام کی — جو مانے درا ہی * جگت رام کی

یہ خط لے کر ہری داس ایلچی نظام شاہ کے ہاں پہنچا۔ بادشاہ خط پڑھ کر مسکرایا اور مشورت کے لئے وزیروں کو طلب کیا

"طلب کردن نظام شاہ وزیران خود را و بایشاں مشورت کردن"

شروع میں چلد اشعار سورج کے ڈوبنے اور چاند کے نکلنے پر ہیں۔ شب میں بادشاہ کا دربار ہوتا ہے اور اس دربار کا ٹھاٹ بیان کیا ہے۔ جب سب امیر وزیر جمع ہو گئے تو نام لے لے کے سب کو مخاطب کیا اور رام راج کا خط سنایا اور نہایت جوش اور غصے سے اس کے تمرد اور جور و تعدی

---

* آقائی

اسلام کی بے حرمتی اور مسجدوں کے انہدام کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے اس وقت تک چین نہیں آے گا جب تک اس مردود کا سر قلم نہ کردوں

نہ مجھہ آس دھن دین کی ریس ھے
مرا کھرک * اور رام کا سیس † ھے

"جواب دادن وزیران نظام شاہ را درباب فکر رام راج"

وزیروں نے جواب دیا:—

نکر فکر کچھہ رام کے کام کی   نہ اس رام کی بل ھریرام کی
تجھے فوج ... سکندر ا ھے   اتا قا سو جھر یل کا پرا ھے
تجھے چرخ بازو کھرک برق ھے   اُسے سنگ خارا اگر فرق ھے

غرض اسی طرح نظام شاہ کی تعریف اور رام راج کی مذمت ھے۔

"نامہ نوشتن نظام شاہ بہ رام راج در جواب او"

دبیر شاہی کو جواب لکھنے کا ارشاد ہوا اور اس نے حمد و ثنا سے نامہ شروع کیا۔ پھر بہت سے مقدس بزرگوں؛ مقدس کتابوں اور چیزوں کی قسمیں کھا کر رام راج کو ھدایت کی ھے:

نہ پتیاو ‡ کچھہ زور کے تیں   نگہ راکھہ وزن ترازو کے تیں
نکر کچھہ بھروسا کہ آپار § مال   گھنا مال جس تس گھنا کو شمال
بتی جال نا جال فانوس کوں   نگہ راکھہ توں اپنے ناموس کوں

یعنے اپنے زور بازو پر گھمنڈ نہ کرو اور ترازو کے وزن کا دھیان رکھو۔ اپنی بے شمار مال ودولت پر بھروسا نہ کرو' کیونکہ جس کے پاس دولت زیادہ ھے' اُسے مصیبتیں بھی زیادہ بھگتنی پڑتی ھیں - بتی جلاتے جلاتے فانوس نہ

---

* تلوار   † سر—   ‡ گھمنڈ کرنا   § بے شمار—

جلا دینا اور اپنی عزت آبرو کا خیال رکھو - آخر میں دھمکی دی ہے :

سو مشعل جلاؤں سر اندیپ پر اوجا لا کروں سب سنگل دیپ پر

دسا سیر کا سیر * چاہوں کچا که سیمرغ مجھه کن † کبوتر بچا

قاصد یہ خط لیکر رام راج کی طرف روانہ ہوا

" قاصد فرستادن رام راج بار دیگر بعد از شنیدن نامۂ نظام شاہ "

رام راج نے جل کر جواب دیا اور اپنے خط میں خوب خوب چرکے دیے ہیں ' آخر میں کہتا ہے کہ اگرچہ تو شاہ بن شاہ بن شاہ ہے اور گو عماد (عماد الملک) تیرا پیشوا ہے اور اگرچہ تونے خاندیس پر اپنی دھاک بٹھائی اور گونڈ وانے سے خراج لیا ' بہادر (بہادر شاہ) کو تونے زیر کیا اور ہمایوں سے بڑی بہادری سے لڑا اور فرنگیوں کو بھگایا اور ملک کو اس شجاعت سے فتح کیا کہ سلطان روم نے بھی آفرین کی مگر رام (راج) کچھہ اور ہی چیز ہے —

سبھی جگ ملے رام ان میل ہے بلے موم آتش کنے تیل ہے

اگر شاہ کاؤس یا کیقباد تو میں رام فرعون و شداد و عاد

... ...

اگر نور و وادی ایمن ہے شاہ وگر سور فوروز بہمن ہے شاہ

کم اندیش ہے چاردہ سال کا پر و بال دھرتا و لیے با لکا

سو میں رام دجال کوں اصل ہوں سو شداد بن عاد کی نسل ہوں

نہ میں رام بل رام لکھمن ہوں میں جو یک من ہے بھیری ‡ تو لکہ من ہوں میں

یہی بول قاصد روانہ کیا وو آشہ نزیک § ماجراسب کہیا

" سوار شدن نظام شاہ برائے جنگ رام راج "

اس میں فوج کی تیاری اور روانگی کا سماں دکھایا ہے - غرض نظام شاہ اپنی

---

* سر † نزدیک ‡ پہلے نظام شاہ بحری § نزدیک -

فوج لے کر کوچ پر کوچ کرتا ہوا میدان جنگ کی طرف روانہ ہوتا ھے

هوا گرم تر مغز تب راے کا

سنا جب یو آواز کرناے کا

(مستعد شدہ آمدن رام راج براے جنگ نظام شاہ)

رام راج نے نظام شاہ کے کوچ کی خبر سنی تو اس نے بھی اپنی فوج کی تیاری کا حکم دیا اور فرمایا :

کہ میں رام اچھتے * ترک زور کیا

سمندر اچھے جوش کوں شور کیا

مختلف فوجوں کی تیاری اور روانگی کا حال کسی قدر تفصیل اور شان سے بیان کیا ھے - آخری شعر یہ ھے :

خبر گرم تر ہو(ن) بھر گوش میں (ن) ہوی ہر

کہ دریاے (ن) لنکھا ہوا جوش میں (ن) طوفان آتش

(فتح یافتن نظام شاہ بر لشکر رام راج و سرا ورا بریدہ پیش تفال خاں فرستادن)

لڑائی بڑے زور شور سے ہوتی ھے لیکن شاعر شروع ھی سے حسین شاہ کا غلبہ بتاتا ھے - چنانچہ ابتداهی میں یہ شعر ھیں :

کاپ + جو کانکاں کے ورو دیکھ عین چلیا فوج رخ باند بھیری حسین

چلیا دل کھندل جوں گرج کھن جیتا دندی بھول اوساں گئے لٹ پٹا ‡

غرض یہ کہ

---

* ہوتے ہوے — + ملصوبہ —

‡ فوجوں کو بادلوں کی گرج کی طرح روندتا ہوا چلا اور دشمن کے اوسان خطا اور پریشان ہوگئے —.

خلل تھا کفر کا دیا جس خدا کیا رام کا سیس تن سے جدا

وجیا نگر شہر لوٹا گیا، بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا اور بادشاہ نے نماز پڑھی اور خدا کی درگاہ میں شکر ادا کیا —

اس نظم کا جو ناقص نسخہ میرے پاس ہے اس میں فتح اور غنیمت کا حال ذرا بڑھا چڑھا کر لکھا ہے اور نظام شاہ بحری کی خوب دل کھول کے تعریف کی ہے اور آخر میں بہت سی دعائیں ایسی دی ہیں جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاعر اس وقت زندہ تھا۔ فتح کا سنہ اور اپنا تخلص بھی دیا ہے۔ نیز شہر وجیا نگر کی رونق اور دولت اور اس کی شان و شوکت کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ چیزیں مکمل نسخے میں نہیں ہیں —

اگرچہ واقعہ شاعرانہ پیرایے میں لکھا گیا ہے، تاہم اس سے بعض تاریخی باتوں کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً نظام شاہ اور رام راج میں جو خط و کتابت ہوئی ہے، اگرچہ یہ فرضی ہے، لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے خیالات ایک دوسرے کے متعلق کیا تھے اور وہ ان کی کن کن چیزوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اسی طرح بعض ناموں کی تصدیق اور تصحیح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس لڑائی میں جو بعض سردار شریک تھے ان کے نام آگئے ہیں۔ غرض یہ مثنوی علاوہ شاعرانہ حیثیت کے تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس لئے میرا ارادہ ہے کہ فرہنگ کے ساتھ پوری مثنوی شائع کردوں۔ اس میں بہت سے غیر مانوس اور اجنبی لفظ آئے ہیں، جن کا سراغ لگانا اس لئے اور دشوار ہو گیا ہے کہ اصل سے بگڑ کر کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں —

(۲)

" میز بانی نامۂ سلطان محمد عادل شاہ "

پہلی مثنوی جس کا اوپر ذکر ہوا ہے "فتح نامۂ نظام شاہ" ہے —

اس میں جو نظام شاہ کی تعریف اور شان و شوکت دکھائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'شوقی' کا تعلق نظام شاہیوں سے ضرور رہا ہے - اگرچہ مثنوی کی ابتدا میں عادل شاہ ' قطب شاہ اور برید شاہ کا نام لیا ہے ' لیکن دوران جنگ اور اثنائے فتح میں کسی کا کہیں ذکر نہیں - یعنے جو کچھ کیا نظام شاہ نے اور فتح کا سہرا بھی اسی کے سر رہا۔ گو تاریخی لحاظ سے بھی یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس سے 'شوقی' کی طرفداری صاف ظاہر ہے - اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ پہلے نظام شاہی دربار سے تعلق رکھتا تھا - یا تو نظام شاہی حکومت کی تباہی پر یا کسی اور وجہ سے اس کا تعلق وہاں سے قطع ہو گیا اور وہ عادل‌شاہی دربار میں آ گیا - نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ سلطان محمد عادل شاہ ہی کے زمانے میں ہوا بلکہ ایک حد تک اس کا الزام عادل شاہی حکومت پر ہے کہ اس نے مغلوں سے ساز باز کر کے اس حکومت کا خاتمہ کردیا اور سلطنت کے حصے بخرے کر لئے - اس لئے یہ قرین قیاس ہے کہ اس تباہی کے بعد 'شوقی' دربار عادل شاہی میں آ گیا ہو —

اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ کا حال ہے - اگرچہ کسی تاریخ میں مذکور نہیں لیکن اس مثنوی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کی ایک شادی مصطفی خاں کی لڑکی سے بھی ہوی تھی۔ مصطفی خاں محمد عادل شاہ کا وزیر اعظم اور سلطنت کے بڑے امرا میں سے تھا اور اُس نے بڑے بڑے کار نمایاں کئے تھے' بلکہ ایک مدت تک سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک رہا۔ اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ کی میزبانی ' سلطان کی شہر گشت ' مصطفی خاں کی مہمانی اور بیٹی کے جہیز کا ذکر ہے۔ یہ چند باتیں بھی زیادہ تر مثنوی کے مختلف عنوانات سے ظاہر ہوتی ہیں- مثنوی میں جشنوں کی دھوم دھام ' میز بانی اور مہمانی کی شان و شوکت ' عیش و عشرت کے سامان کا تو بہت کچھ ذکر ہے مگر اصل واقعات کے متعلق کچھ نہیں لکھا —

مثنوی کا آغاز حمد سے اور اس کے بعد بادشاہ کی تعریف سے ہوتا ہے۔ حمد میں بھی صرف ایک مصرع ہے اور اس کے بعد ہی بادشاہ کی مدح شروع ہو جاتی ہے۔ ابتدا کے شعر یہ ہیں :

اول یاد کر پاک پرور دگار	پچھیں شاد کر شاہ عالی تبار
نبی کا خلیفہ خدا کا خلیل	بالہام و ہاتف نہ با جبرئیل
دم اندر جو عیسی سریم تمام	تکلم میں موسیٰ علیہ السلام
شجاعت میں رستم تی کچھ کم نہیں	سخاوت میں ایسا جو حاتم نہیں
سر سرفرازاں بندے نواز	سوگردن فرازاں میں گردن فراز
سو سلطان محمد عدالت پناہ	کہیں خلق جس مکرمت دستگاہ
خداوند تعالی کی وہ چھانوں ہے	عرب ہور عجم میں جسے فانوں ہے
کرے عیش و عشرت جواناں سنگات	ولے مشورت پیر داناں سنگات
بڑا گیان وفتا رتن پا رکھے	رتن پا رکھے ہور بچن پا رکھے
سو میٹھی شہر یار کی بات ہے	سو لس بات کی دھات نا بات ہے
اگر شہ سناوے مجھے بول کر	تونا بات کوں میں سنوں * بول کر
چو من کیست بارے درین بوستاں	کہیں جس کی طوطی بہندوستاں

اس کے بعد وہ شادی کا ذکر چھیڑتا ہے :

سنیا میں کہ شہ گھر بڑا کاج ہے	کہ جس کاج کا خلق محتاج ہے
جہاں دار نے میزبانی کریا	اسے فانوں میں شادمانی کریا

اس کے آگے میزبانی کے ساز و سامان، مکانات کی آرائش اور انتظامات کی کیفیت تفصیل سے لکھی ہے۔ شروع اس طرح سے کیا ہے :—

صفادار صوفے و منڈوے بلند	جھجے شہ نشین پادشاہاں پسند

---

*پھیلک دوں

بشنگرف سرخ و بزرنیخ زرہ　　برزحل و زرنگار * و بالاجورہ
صفادار صوفے رنگا رنگ ہوے　　نمودار جاے کہ از رنگ ہوے
تکت لال سوں کانچ ماڑیاں مڑی　　سوزر بات سوں باغ ماڑیاں مڑی

اسی طرح ہر چیز اور ساماں کا ذکر کرتا چلا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی "صوفے" کا لفظ استعمال ہوتا تھا - انگریزی میں یہ عربی لفظ "صفہ" سے پہنچا ہے - فارسی میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے—

دوسرا عنوان یہ ہے:

(مجلس آراستن و بخشش کردن سلطان محمد مردماں را در میز بانی خود)

بادشاہ تخت پر جلوہ فرما ہوتے ہیں اور امرا ' وزرا مجرا وآداب عرض کرتے ہیں :

بیٹھا تخت پر آو جمشید سا　　زر افشاں کیا دست خورشید سا
سلحدار سردار جیتے وزیر　　نہ گھر میں رہیا کوئی بر ناؤ پیر
جیتے سرفرازاں جو درگاہ کے　　جیتے محرماں خاص خرگاہ کے
سو سب ہوویں دھرے شاہ عالم کے تیں　　رہے دیکھ کر ماہ عالم کے تیں
کتے سیس کے پاے لشکر کشاں　　سوکر جوڑ تھارے رہے سرکشاں

اس کے بعد بادشاہ انھیں بیش بہا خلعت اور انعام و اکرام عطا فرماتے ہیں۔ شاعر ہی انعام و اکرام کی تفصیل بیان کرتا ہے ' جس میں نفیس نفیس کپڑے ' ہاتھی ' گھوڑے ' جواہرات ' عطریات سب کا ذکر آجاتا ہے۔ پانوں کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے: شوقی رام راج کی شان و شوکت نہیں بھولا ' چنانچہ کہتا ہے:

پتا خرچ پاناں ہوا راج کاج　　نہ سونے میں دیکھا کبھی رام راج

مختلف قسم اور مختلف مقامات کے پانوں کے نام لیتا ہے اور طرح طرح کی تشبیہیں دے کر بیان کرتا ہے - اس کے بعد کھانے کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اور خاتمے پر کہتا ہے :

---

* (ن) یہ لفظ غالباً "زنگار" ہوگا - زرنگار سے مصرع غلط ہوجاتا ہے۔

کیتا کوئی کوائے کیتا کوئی لےجائے   مچھر کو ھتیے ھور مکھی کو شکائے*
کئے شکر یکبار عالم تمام   محمد نبی پر درود و سلام

تیسرا عنوان یہ ھے :

(در بیان شہرگشت سوار شدن سلطان محمد عادل شاہ)

شہرگشت کا بیان بہت خوبی سے لکھا ھے شروع یوں ھوتا ھے :

سدا دار پر تجھہ منگل‡ گڑ گڑیں   منگل گڑ گڑیں جیوں بدل§ گڑ گڑ یں
ھتی مست پر پیلباں مست ھے   زبردست پر کیا زبردست ھے
سدا دار پر تجہ طبل باجتیں   طبل باجتے ھور مندل¶ کا جتے
بہت دیس تی شہ کے گھر کام ھے   شہر گشت کی رات سو آج ھے
شہر گشت کا ساز و ساماں ھوا   نفیریاں تراتے دماماں ھوا

اس کے بعد جلوس کا حال اور اس کی شان و شوکت ھے۔ بادشاہ کی سواری، طرح طرح کے باجےگاجے، ناچ رنگ، آتش بازی، روشنی غرض ھر چیز کو بہت اچھی طرح بیان کیا ھے۔ چند شعر ناچ کے متعلق دیکھئے، ناچنے والیوں کے انداز کس خوبی سے ادا کئے ھیں :

ھڑ کنیاں و کنچنیاں بہوت ساز سوں   بجاویں و گاویں بہوت ناز سوں
خوشی خرمی میں اوزبلتیاں چلیاں   اکھرتیاں و پھرتیاں اوچھلتیاں چلیاں
سہیلیاں سہیلیاں میں جھلتیاں و تیاں   لٹکتیاں ٹھمکتیاں و ڈالتیاں و تیاں

آتش بازی کے بیان میں ایک شعر ھے :

ھوا یاں نتھیاں و اتھیاں ناگنیاں   ھوا کے اوپر جا سنپھولے جنیاں

ھوائیوں کو ناگنوں سے بہت اچھی تشبیہ دی ھے۔ یعنے وہ ھوائیاں نہ تھیں بلکہ ناگنیں تھیں اور اوپر ھوا میں جاکر جو چھٹیں اور ان سے پھول

---

* سارے   † قرابے   ‡ باجے   § بادل   ¶ باجہ

گرے تو وہ پھول نہ تھے بلکہ سپولے تھے جو انھوں جنے —

تیسرا عنوان یہ ھے :

(دربیان مہمانی کردن نواب مصطفیٰ خاں سلطان محمد عادل شاہ را ودادن جہیزِ دختر)

صبح ہوتی ھے :

بیٹھا سور جب نور کا تاج کر　　بیٹھی رات کوہ قاف میں لاج کر

مصطفیٰ خاں کی مہمانی.

سلیماں کو آصف نے مہماں کیا　　عجائب غرائب بہوت کچھہ دیا

سلطان کو اپنی بیٹی دیتا ھے یعنی چاند کو سورج کے حوالے کرتا ھے :

دیا چاند کوں سور کے سات کر　　دیا نور کوں نور کے سات کر

اس کے بعد جہیز کا ذکر ھے ۔ پھر مجلس کے ناچ رنگ کا ذکر دل کھول کے کیا ھے اور شاعری کی داد دی ھے ۔ گانے اور ناچنے والیوں کا سراپا، ان کے ناز و انداز اور ناچ کا سماں خوب لکھا ھے ۔ اتنے میں سلطان محمد عادل شاہ کے سامنے دسترخوان بچھتا ھے جس پر طرح طرح کے نفیس کھانے سونے چاندی کے باسنوں میں چنے جاتے ھیں ان کی تفصیل بھی پڑھنے کے قابل ھے، جس سے اس وقت کے کھانوں کی کیفیت معلوم ہوتی ھے ۔ آخر میں دعا پر مثنوی ختم ہوجاتی ھے ۔

دعائیہ اشعار یہ ھیں :

قلم (گر) کروں راس سب بانس کے　　سیاھی دریا، کاغذ آکاس کے

کھئے ھو رکھے بھرے یو تمام　　صفت شہ کی پوری نہوے والسلام

تو بہتر کہ 'شوقی' ز راہ صواب　　دعا وو کرے جو اچھے مستجاب

سدا جیو راجے جنم راج کر　　جو دشمن سولتی تل کرے لاج کر

کرے راج جو لگ گگن دھرتری　　کرے راج جو لگ پرب استری

ھہر یار خاطر کے تیں شاد دار　　قیامت لگوں یو رھوے یاد گار

(غزلیں)

مجھے شوقی کی کچھہ غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں جن سے اس کی شاعری اور جوہر کھلتے ہیں - ایک غزل اس نے مسلسل لکھی ہے' جس میں شروع سے آخر تک " نین " اور " سوکا " کی تعریف ہے اور ان کو اس نے نئی نئی اور طرح طرح کی تشبیہوں سے مرصع کیا ہے۔ "سوکا" سرمے کا وہ خط ہے جو عورتیں آنکھہ سے لیکر زلف تک کھینچتی ہیں - یہ بھی ایک قسم کا سنگار سمجھا جاتا تھا - اس غزل کے چند شعر یہاں لکھے جاتے ہیں:

دلبر سلونے نین پر کھینچی ہے سوکا خوبتر
خطاط جیوں ماریا رقم چھندوں ثلث کے صاد پر
یا چک دوات ہے سیم کی کیکی سو بھر سیاھی رکھے
سوکا قلم جیوں واسقی کاتب کیا اُس میں بسر
یا نین موتی تھال ہیں سوکا سو تاگا نیل کا
موتی پرو کر کھینچتے تو راھیا ہے ٹوٹ کر
تجھہ زلف ہے جیوں ناگنی سوکا بچا نیکا * جنی
مت کھائے کیں وہ پاپنی اسنیں چھپا نرگس بھتر
یا نین بازیگر اھیں تجھہ حسن کے بازار میں
سوکا سلائی سحر کی بہایا * اُس اپنے آنکھہ بھتر
یا ترنگ اچپل نین ھو سار سو ھندو برن
سوکا لے برچھا نین دھر آیا کسی جیو مار کر
آھو کو بیٹھیا تیریا مکھہ میں کنجن چار یا لیا
یا تل زنگی کوں مارنے لوچن† ترک کنچھیا‡ خنجر

---

*نکالا †آنکھہ ‡کھینچا —

یا پھول ہے گل لالہ کی سوکا تدنتی اس پھول کو
پتلیاں مرتب یوں دیسے جیوں پھول پر بیٹھے بھنور

ایک پوری غزل میں تجنیس لفظی سے کام لیا ہے۔ ہماری شاعری میں اس قسم کی صنائع کا شوق ہر زمانے میں رہا ہے - چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

کُھب کھب رہی ہے من میں تری زلف کی کھب کھب §
مج جیو کے گلے میں پڑیا ہے طوق غب غب
تپ تپ ہوا ہوں تب سیں تیرے وصال کا رن
جپ جپ کیا ہوں جپنا ہر اہوں ¶ اب اب
تج وصل کوں درنگ ہے ج نہیں صبوری
جاتی ہے زندگانی آتی ہے موت دب دب]
سروے قداں سوں ہاوے * شوقی ہوا ہے مجنوں
کب کب کیا ہوں توبہ کب کب کیا ہوں کب کب

ایک اور غزل کا مطلع اور مقطع لکھ کر مضمون ختم کرتا ہوں

تجھ نین کا ماتا ہے جو اُس جام سیتی کام کیا
تجھ زلف کا کافر اوسے اسلام سیتی کام کیا
شوقی نہ دکلا طمع کچھ ....فردوس کی
سنا * جو کرتا ہے اُسے انعام ستی کام کیا

---

§ خم ¶ کم کتا ہوں] آہستہ آہستہ * درد فراق -

تبصرے

ادب

سادھو اور بیسوا

(مصنفۂ جناب کشن پرشاد کول صاحب، انڈین پریس الہ آباد، صفحات ۲۰۳، قیمت بارہ آنے)

جناب کشن پرشاد کول صاحب ملک کے سچے خادموں میں سے ہیں۔ ان کا مقصد ملک کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ اسی موضوع پر فسانے کے پیرائے میں کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ کول صاحب کو لکھنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے اور صاف ستھری زبان میں اپنے خیالات بڑی خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ یہ فسانہ بہت دلچسپ اور عبرت خیز ہے۔ اس افسانے میں اصل اشخاص دو ہیں۔ ایک سادھو دوسری ایک بیسوا۔ زمانے کے حالات نے ان کی زندگی میں ایسی کایا پلٹ کی ہے جسے پڑھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور عبرت بھی۔ سادھو بیسوا کو ناپاک زندگی سے نجات دینے چلے تھے۔ خود اس کے شکار ہوگئے اور بیسوا ان کی تلقین سے متاثر ہوکر اُس درجے کو پہنچ گئی جو سادھو کو باوجود ریاضت کے کبھی نصیب نہوا تھا۔

قصے کے ضمن میں ہندوستانی معاشرت کا چربہ بھی خوب اتارا ہے جو کول صاحب کا اصل مقصد ہے —

جیسا کہ لائق مصنف نے خود ہی لکھ دیا ہے اس کتاب کا خیال انہیں ایک فرنگی ناول سے پیدا ہوا، یہ فرانس کے مشہور اور عجیب و غریب ادیب اور ناول نویس اناتول فرانس کا ناول تھائیس ہے۔ اگرچہ اس افسانے کا خیال اس ناول سے پیدا ہوا لیکن قصہ بالکل ہندوستانی ہے اور قابل مؤلف کے غور و فکر کا نتیجہ ہے —

ناٹک کتھا

(مولفۂ صاحبزادہ محمد عمر نورالہی صاحبان ۔
مسعود برادرز تاجران کتب جمون قیمت آٹھ آنے)
(یہ کتاب انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد - دکن سے بھی مل سکتی ہے)

اس میں قدیم ہندوستانی ڈراموں کی سات کہانیاں اور ایک تاریخی کہانی ہے ۔ یہ بڑی دلچسپ کہانیاں ہیں اور قدیم ہندوستان کے نامور اور مستند ڈراما نگاروں کے شہرۂ آفاق ڈراموں کو اپنی میٹھی اور پاک ستھری زبان میں اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ پڑھ کر جی خوش ہوجاتا ہے۔ ہندی کے خوبصورت الفاظ جس حسن وخوبی سے ان صاحبوں نے اپنی ان کہانیوں میں کھپائے ہیں یا تو مولانا حالی کی مناجات بیوہ میں دیکھنے میں آئے یا یہاں - اس چھوٹی سی کتاب پڑھنے کے بعد دل میں یہ خیال آتا ہے کہ " ہندوستانی " جو آیندہ ہندوستان کی عام اور مشترک زبان ہونے والی ہے وہ کہیں یہی تو نہیں - اردو کے نامور ادیب اور شاعر حضرت کیفی نے کتاب کے شروع میں بہت ہی پر لطف تقریب لکھی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب شوق سے پڑھی جائے گی اور پڑھنے والے مولفین کی محنت کی داد دیں گے۔ ایک بڑا فائدہ ان کہانیوں کے پڑھنے سے یہ ہوگا کہ جو لوگ اپنی نارسائی یا کم فرصتی کی وجہ سے اصل ڈراموں کا مطالعہ نہیں کرسکتے وہ " نقل مطابق اصل " کو پڑھکر ضرور محظوظ ہونگے اور کیا عجب ہے کہ پھر سے اصل کی طرف رجوع کریں —

پرواز خیال

(مجموعۂ کلام خواجہ حمیدالدین صاحب حمید لکھنوی،
نامی پریس لکھنو' قیمت ایک روپیہ چار آنے)

یہ خواجہ حمید صاحب لکھنوی کی غزلوں کا مجموعہ یعنی دیوان ہے - مجلد جوبی تقطیع نہایت عمدہ کاغذ پر خوبصورت چھپا ہے - غزل گوئی میں قدیم اساتذہ کا تتبع کیا ہے - جو لوگ اس طرز کو پسند کرتے ہیں' اُن کے لائق ہے - زبان صاف اور روز مرہ درست ہے - کوئی خاص بات ایسی نہیں جو بیان کے قابل ہو چند اشعار بطور نمونے کے لکھے جاتے ہیں —

یوں دفن مجھے کرنا ملنہ ہو سوے میخانہ
اک ہاتھ میں ساغر ہو اک ہاتھ میں پیمانہ
کہنے کو مسلماں ہوں مذہب تو ہے رندانہ
توبہ ہے مرے لب پر نظریں سوے میخانہ
منزل ہے وہی میری جس جا ترا جلوہ ہے
اس سے نہیں کچھ مطلب کعبہ ہو کہ میخانہ

شیرازہ عناصر کا بکھرا نظر آتا ہے
مشکل ہمیں اب اپنا جینا نظر آتا ہے
سب ایک طرف، مجرم تنہا نظر آتا ہے
اس عرصۂ محشر میں یہ کیا نظر آتا ہے
یہ حال نہ تھا پہلے اس درد محبت میں
جو آج مجھے عالم دل کا نظر آتا ہے
انسان کا چہرہ بھی آئینہ ہے عادت کا
جیسا کوئی ہوتا ہے ویسا نظر آتا ہے
دن رات ہے واعظ کو رٹ جنت و دوزخ کی
ہم کو تو کچھ اس میں بھی دھوکا نظر آتا ہے

دنیاے افسانہ

(موءلفۂ مولوی محمد عبدالقادر سروری صاحب ایم - اے -
مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن، صفحات ۲۰۰ چھوٹی تقطیع
قیمت ایک روپیہ چار آنے)

کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے - اس میں بیس باب ہیں - پہلے چودہ باب عام فسانے کی تاریخ، اس کے اقسام، عناصر، خصوصیات، موضوع، فرائض اور مختصر قصوں کے متعلق ہیں - لیکن آخری پانچ باب میں اردو کے فسانوں، ناولوں اور مختصر قصوں سے بحث کی ہے - یعنی اردو زبان اور افسانے؛ ابتدائی دور کے افسانے؛ فورٹ ولیم کالج کی کوششیں؛ اردو ناول، اردو مختصر افسانے اور اُردو افسانوں کا مستقبل —

قابل مؤلف نے اردو نثر کا پہلا فسانہ ابن نشاطی کے قصے " طوطی نامہ " کو قرار دیا ہے - ابن نشاطی کا طوطی نامہ منظوم ہے - معلوم نہیں نثر کس بنا پر لکھا ہے، اس کے لئے کوئی سند بھی پیش نہیں کی - اسی طرح شیخ عین الدین گنج العلم کو اردو نثر کا مصنف بتایا ہے، اور یہ بھی بغیر سند اور تحقیق کے - خواجہ بندہ نواز

گیسو دراز کے رسالے " ہدایت نامہ " اور ہفت اسرار " بعد کے ترجمے ہیں ' خواجہ صاحب نے اردو میں نہیں لکھے —
اُردو ناولوں پر لکھنے کی ابھی گنجائش باقی ہے' چونکہ وہ اس بحث پر الگ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس لئے غالباً یہاں اختصار سے کام لیا گیا - تعجب ہے کہ اردو ناول نویسوں میں منشی پریم چند صاحب کا نام نہیں ہے - اُردو ناولوں اور ناول نویسوں کے متعلق قابل مؤلف نے جو رائیں ظاہر کی ہیں ان سے بھی اکثر اصحاب کو اختلاف ہو گا - لیکن اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس مضمون پر لکھی گئی اور مؤلف کی محنت اور تلاش بہت قابل تعریف ہے - جو لوگ ناولوں کے شائق ہیں یا جنھیں ناول نویسی کا ذوق ہے وہ ضرور اسے پڑھ کر خوش اور مستفید ہوں گے -

---

اوتاروں کے قصے

(مؤلفۂ سید محمد منظور علی رضوی صاحب نیشنل پریس ، رام نراین لال) الہ آباد قیمت چار آنے)

اس چھوٹی سی خوبصورت کتاب میں رام چندر جی کرشن جی اور مہابھارت کی لڑائی کا حال صاف سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے - لیکن اس کی اور ناٹک کتھا کی زبان میں بڑا فرق ہے - یہ کتاب لڑکوں لڑکیوں کے پڑھنے کے لئے خوب ہے - تین رنگین تصویریں بھی ہیں - رام نراین لال صاحب اپنے نیشنل پریس سے اردو کی بہت سی اچھی اچھی کتابیں صاف ستھری چھاپ کر شائع کر رہے ہیں - ان میں کہانیوں کا بھی ایک سلسلہ ہے اور اس سلسلے کی ایک کتاب یہ بھی ہے —

اُردوے معلی

(از ستمبر سنہ ۱۹۲۸ ع تا جون سنہ ۱۹۲۹ ع مرتبۂ جناب سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی - کانپور)

یہ مشہور ادبی رسالہ اب رسالہ نہیں رہا بلکہ اس میں با تساط مستقل ادبی

کتابیں شایع کی جاتی ہیں - ایک کتاب "معائب سخن" مسلسل چھپ رہی ہے - علاوہ اس کے بہت سے نایاب اور معروف دیوانوں کا انتخاب بھی شایع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان پرچوں میں میر محمد حیات حسرت، یقین، احسن اللہ خاں بیان اور خواجہ کمال الدین شاعر (شاگردان مرزا مظہر) ذوق، داغ، رسا (شاگرد داغ) جگر مراد آبادی، فغاں، راسخ، رونق، صمصام، فانی، عزیز لکھنوی اور محشر لکھنوی کے دیوانوں کا انتخاب درج ہے۔ یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہے - کبھی سرورق کے اوٹ میں ایک آدھ تازہ غزل بھی چھپ جاتی ہے - ستمبر تا دسمبر سنہ ۲۸ء کے پرچے میں نہرو رپورٹ پر جامع تبصرہ ہے - اگرچہ بذات خود یہ ایک کام کی چیز ہے مگر اردوے معلیٰ میں اس کا پیوند بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے - بہر حال جواں ہمت حسرت برابر کام میں مصروف ہیں اور اپنے ذوق کو بڑی خوبی سے نبھائے جا رہے ہیں - ہم تو یہ سمجھے تھے کہ یہ رسالہ سہ ماہی ہو گیا ہے کیونکہ تین تین نمبر ایک ایک رسالے میں پہنچے تھے - اتنے میں جولائی کا نمبر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بدستور ماہانہ ہے - قیمت سالانہ دو روپے چار آنے اور فی پرچہ تین آنے ہے اور معلومات کے لحاظ سے جو اس میں درج ہوتی رہتی ہیں - یہ قیمت کچھ بھی نہیں ہے

ہزار داستان، علی بابا اور چالیس چور

مؤلفۂ جناب حامد اللہ صاحب افسر - رام نارائن لال، نیشنل پریس الہ آباد قیمت فی کتاب چار آنے

یہ نیشنل پریس کے قصے کہانیوں کے سلسلے کی کتابیں ہیں۔ پہلی کتاب میں نتیجہ خیز چھوٹے چھوٹے قصے اور سبق ہیں - دوسری میں الف لیلہ کے مشہور قصے کو آج کل کی سادہ اور سلیس زبان میں لکھا ہے - اس میں دو تین رنگین تصویریں بھی ہیں - بچے ان کتابوں کو بہت شوق سے پڑھیں گے —

کروسو سیاح (مؤلفۂ جناب طالب الہ آبادی، نیشنل پریس الہ آباد، قیمت ۴ آنے)

وینس کا سیاح (مؤلفۂ جناب سید محمد منظور علی صاحب نیشنل پریس الہ آباد قیمت ۴ آنے)

یہ دونوں کتابیں بھی نیشنل پریس کے سلسلے کی ہیں - پہلی کتاب انگریزی کی مشہور کتاب رابن سوکروسو کا خلاصہ ہے اور دوسری مارکو پولو مشہور سیاح کے سیاحت نامے کا نہایت مختصر سا خاکہ ہے ۔ لڑکے لڑکیوں کے شوق کی چیز ہے، نیشنل پریس بہت اچھا کام کر رہا ہے —

خطلاتین برائے فارسی

(خطبۂ جناب آقا سید محمد علی صاحب پروفیسر نظام کالج)

آج کل ایشیائی ممالک میں لاتینی حروف کا بہت چرچا ہے اور جب سے ترکی میں یہ حروف رائج ہوگئے ہیں یہ بحث اور بھی قابل غور ہوگئی ہے - ہندوستان اور ایران میں اس پر بڑی بڑی گرم بحثیں ہورہی ہیں - جاپان میں بھی بہت دنوں سے اس پر غور ہورہا ہے - چین اور جاپان کے حق میں تو یہ حروف ایک قسم کی رحمت ہونگے اور اگر ان دونوں ملکوں نے یہ حروف اختیار کرلیے تو وہ ایک بڑی زحمت اور جنجال سے بچ جائینگے۔ لیکن ہزاروں سال کے رواج کا یک لخت چھوڑ دینا کچھ آسان کام نہیں ہے —

آغا صاحب نے اپنے لکچر میں فارسی میں لاتینی حروف کے استعمال کے متعلق بحث کی ہے۔ ان کی رائے اس استعمال کے بالکل مخالف ہے۔ اس کی وجوہ انہوں نے جو بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے :

۱- حروف ناقص ہیں - ایک ایک حرف کئی کئی آوازیں دیتا ہے -

۲- لاتینی حروف فارسی حروف کی ضرورتوں کو کامل طور پر پورا نہیں کرتے - کیونکہ متعدد حروف اور اصوات ایسی ہیں جن کا وجود لاتینی میں نہیں پایا جاتا —

ان وجوہ کو قابل لکچرار نے فارسی اور لاتینی حروف کو بالمقابل لکھ کر سمجھایا ہے —

اس قسم کے نقص کچھ نہ کچھ ہر زبان کے حروف میں پائے جاتے ہیں ۔ چنانچہ خود قابل لکچرار نے فارسی حروف کا لاتینی حروف سے مقابلہ کر کے فارسی خط کے نقائص بتا دئے ہیں ۔

فارسی خط کی ایک خوبی یہ بتائی ہے کہ زود نویسی کے لئے یہ بہت کارآمد ہے ۔ لاتینی حروف میں تحریر بہت طویل ہو جاتی ہے ۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ نقاشی کا بہترین نمونہ ہے ۔

موجودہ خط کے بدلنے میں بڑا نقص قابل لکچرار کی رائے میں یہ ہے کہ کچھ دنوں کے بعد مروجہ خط بالکل غیر مانوس ہو جائے گا اور صدہا سال کی محنت سے جو علوم وفنون پیدا ہوئے ہیں وہ سب ضائع ہو جائیں گے ۔ چنانچہ ایران پر ایک ایسا سانحہ گزر چکا ہے ، یعنی جب پہلوی خط ترک کر کے عربی خط اختیار کیا گیا تو ایران کے قدیم علوم و فنون سب تلف ہو گئے ۔

اس لئے آقا صاحب کی یہ رائے ہے کہ موجودہ خط ہی کی اصلاح اس طور سے کرلی جائے کہ ہمیں ایک جدید خط کی ضرورت نہ رہے ۔ وہ اصلاح یہ ہے کہ اعراب میں جزم کو بالکل ترک کردیا جائے یعنی جس حرف پر کوئی علامت نہ ہو وہ ساکن سمجھا جائے ۔ تشدید کی علامت کی جگہ جزم رکھ لیا جائے ۔ غرض یہ کہ مروجہ خط ہی میں کچھ اصلاح کرلی جائے ۔

اردو خط بھی وہی ہے جو فارسی ہے ۔ اس میں بڑا نقص یہ ہے کہ ہم اس وقت تک الفاظ صحیح نہیں پڑھ سکتے جب تک پورے اعراب نہ ہوں ۔ اور اعراب کا لگانا دقت طلب امر ہے ۔ اور ٹائپ میں تو یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔

اردو زبان کی حالت جو اس وقت ہے آئندہ یوں ہی نہیں رہے گی ۔ اگر ہم اس کی اشاعت اور توسیع کے خواہاں ہیں تو لازم ہے کہ اس کا ٹائپ بنائیں ۔ مروجہ نستعلیق خط کا ٹائپ بنانا نہایت دشوار ہے ۔ اگر بن بھی گیا تو اس میں وہ سہولت نہیں پیدا ہو سکتی جو لاتینی حروف کے ٹائپ میں ہے ۔ البتہ نسخ اختیار کر سکتے ہیں لیکن تلفظ کی صحت اس میں بھی نہیں ہو سکتی ۔ اگر ہم لاتینی حروف لے لیں تو عمدہ سے عمدہ ٹائپ جو صدہا سال کی محنت اور کوشش سے بنا ہے ، ہمیں بغیر کسی زحمت کے مل جائے گا ۔ رہی یہ بات کہ اس میں بعض آوازیں نہیں ہیں تو ان کا بنا لینا کوئی بڑی بات نہیں ، بلکہ پہلے سے بنی بنائی موجود ہیں ۔

ہندوستان میں بہت سی زبانیں مروج ہیں اور اکثر کے خط ایک دوسرے سے نہیں ملتے ۔ اگر یہ سب زبانیں لاتینی حروف اختیار کر لیں تو ان کا سیکھنا کس

قدر آسان ہو جائے - اور جو کچھ بھی ہو' اس حالت میں اردو ہندسٹ کا تو پاپ کٹ جائے گا -

عجیب بات ہے کہ جو خط نہایت خوش نما' اعلی ترقی یافتہ اور مہذب اور نقاشی کا بہترین نمونہ ہے وہ اس زمانے میں جب کہ ٹائپ کی فرماں روائی ہے' اذنوار اور ناکارہ ثابت ہوا اور وہ خط جو ابتدائی اور غیر ترقی یافتہ حالت میں تھے' مفید اور اعلی بن گئے -

مجھے اکثر اردو کی قدیم کتابوں کے مطالعے کا اتفاق ہوتا ہے- پرانے الفاظ کے صحیح پڑھنے اور صحیح تلفظ کے دریافت کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے - اگر لاتینی یا ناگری حروف میں یہ تحریریں ہوتیں تو اتنی دقت نہ ہوتی -

بحث اب حسن اور افادے میں آ پڑی ہے - یا تو حسن کی پوجا کیجئے اور ترقی سے ہاتھ دھو بیٹھئے یا پھر چھاتی پہ پتھر رکھ کر حسن کو خیر باد کہئے اور ترقی و افادہ کے میدان میں آئیے -

ایک روز ایسا آنے والا ہے کہ ہمیں یہ خط بدلنا پڑے گا ' ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی صورت کیا ہو گی - لیکن جتنی دیر ہوتی جائے گی اسی قدر مشکلات بڑھتی جائیں گی -

---

فیضان شوق

(دیوان منشی احمد علی صاحب ' شوق ' قدوائی لکھنوی مرحوم '
حجم ۳۰۰ صفحے ' سائز ۲۰ × ۲۶ ' قیمت دو روپے' لکھائی '
چھپائی ' کاغذ بہت عمدہ ' مع تصویر مصنف' پتہ :
خان بہادر شیخ رضی الدین احمد صاحب بیرسٹرائٹ لا '
گونڈہ (اودھ)

منصر البیان منشی احمد علی صاحب ' شوق ' قدوائی مرحوم اردو زبان کے ان اُستادوں اور مسلم الثبوت شعرا میں تھے ' جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر تھے اور جن کی تمام زندگی اس فن شریف کی خدمت میں گزری ہے -

اس چندسال کے اندر نہایت افسوس ہے کہ ہماری زبان کے کئی گراں پایہ انشا پرداز اور

شاعر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے، اور زیادہ افسوس اس کا ہے کہ اپنی خصوصیات اور کمالات بھی اپنے ساتھ ہی لیتے گئے - حضرت اکبر الٰہ آبادی مرحوم، جناب شاد عظیم آبادی، مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی، مولانا شرر لکھنوی، اور جناب شوق قدوائی اس دور میں ادب اُردو کے زبردست ارکان تھے -

حضرت شوق قدوائی ایک قادرالکلام، کہنہ مشق اور رنگ قدیم و جدید کے مالک تھے - اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے مجموعہ اضداد ہستی تھے - ان کا دیوان اور غزلیں اگر دیکھیے تو مذاق جدید اور جذبات نگاری سے بالکل الگ ہیں، قدیم رنگ نمایاں ہے اور وہ بھی خاص ہے - لکھنؤ کا فرسودہ رنگ رعایت لفظی کا تو اتنا زیادہ نہیں مگر محاورات، ضرب لمثال، بول چال نظم کرنے کی خاص کوشش کرتے ہیں، اور آورد کو آمد بنانے کی بھی - یہی ان کے دیوان کا امتیازی رنگ ہے - اس پر بھی شگفتگی اور برجستگی بہت ہے اور یہ کمال مشاقی کی دلیل ہے کہ کلام گنجلک نہیں ہونے پایا - یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کا خاص ذوق رکھتے ہیں - ان کا زور زیادہ تر لفظی صنائع اور فنی خوبیوں تک ہے لیکن شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ شعر کی اصل روح جو اُسے انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچا دے وہ نہیں ہے اور ہے بھی تو بہت کم - بخلاف اِس کے ان کی نظمیں نہایت پاکیزہ ہیں - اور بعض تو جذبات کی صحیح ترجمانی کے لحاظ سے ملک میں بے حد مقبول ہوئی ہیں - خاص کر "عالم خیال" جس میں ایک ایسی خاتون کے جذبات و خیالات ظاہر کئے ہیں جو اپنے شوہر سے دور ہے، یہ اپنے گھر میں ہے اور شوہر پردیس میں - حقیقت یہ ہے کہ یہ مرحوم کی ایک بے مثل نظم ہے، خصوصاً ہماری تعلیم یافتہ مسلمان خواتین میں اس نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے - اس کے علاوہ اور نظمیں بھی بغایت دل پسند ہیں اور یہ اتنا ذخیرہ ہے کہ اگر کتابی صورت میں چھپے تو اچھا خاصہ حجم ہوگا - اور ہمارا یہ خیال ہے کہ مرحوم کے دیوان سے زیادہ اس وقت اُن کے مجموعۂ نظم کی ملک کو ضرورت تھی -

زیر تنقید دیوان میں غزلیں ہیں، مگر یہ غزلیں اس رنگ میں نہیں جو آج کل مقبول ہے - اگرچہ زیادہ حصہ آخر عمر اور درمیانی عمر کا ہے، کیونکہ ابتدائی عمر کا کلام زیادہ تر ضائع ہوگیا، اور جو بچ رہا تھا اس کا بھی اکثر و بیشتر حصہ خود مصنف نے اپنے ذوق کے سبب تلف کردیا - آخر دیوان میں چند اخلاقی قطعات اور رباعیاں ہیں، مگر ان میں بھی جان شاعری کی وہی کمی ہے جو غزلیات میں ہے - ایک امتیازی خصوصیت دیوان کی یہ ہے کہ غزلوں میں زبان نہایت صاف و شستہ اور صحیح استعمال کی ہے اور اشعار کی تعداد بہت کم رکھی ہے، جو

معتقدین کی خصوصیت تھی' رعایت لفظی زیادہ نہیں' لیکن صحت زبان اور محاورات و ضرب الامثال بلندی کے سوا اور کوئی بات مشکل سے موجودہ دور ادب اور مذاق سلیم کے لئے دل چسپ ہوسکتی ہے -

دیوان کے شروع میں مرحوم کے صاحبزادے شیخ طاہر علی صاحب کا ایک صفحے کا دیباچہ ہے ' اس کے بعد مولوی معین الدین صاحب بی اے (کانٹب) یونیورسٹی ایڈ لا لکھنؤ کا ایک بسیط مقدمہ ۲۸ صفحات کا ہے' جس میں مصنف کے سوانح حیات' خصوصیات کلام ' خصائل' مزاج ' تصانیف و کلام پر تبصرہ اور بہت سی باتیں آگئی ہیں ' تاہم ہمارے خیال میں یہ مقدمہ ابھی تشنہ ہے - اس میں کئی اور اہم چیزیں رہ گئی ہیں ایک تو ان کے تصانیف کا ذکر تفصیلی نہیں ہے - بعض کا نام تک مذکور نہیں- دوسرے ان کے تلامذہ کا بالکل ذکر نہیں اس کے علاوہ بعض اور بھی قابل تذکرہ باتیں چھوٹ گئیں -

دیوان اس مطلع سے شروع ہوتا ہے :

مرا حق مان کر بن تو مرا حاجت روا ہوتا

کہ میں مانے ہوئے ہوں اے خدا تیرا خدا ہوتا

پہلے مصرعے کے لفظ بن پر دوران طباعت میں بحث ہو چکی ہے ' آخر میں تمام " عقیدت مند " اسی نتیجے پر پہنچے کہ اپنی کوتاہ نظری تسلیم کرلی جائے ' اور اُن پر حرف نہ رکھا جائے ' مطلع بجنسہ رہنے دیا جائے لیکن یہ ہمارے خیال میں زبردستی ہے ' جو بات سچ ہو وہ کہنی چاہیے کہ بن یہاں کسی طرح نہیں کھپتا ' ورنہ ردیف بیکار ہوتی ہے ' کیا لکھنؤ میں اب کوئی ایسا زباں داں نہیں جو اس معمے کو حل کرتا ' یا اسے کم از کم کتابت ہی کی غلطی سمجھ لیا جا سکتا - یہ مطلع طبع دیوان کے وقت ہمارے ایک دوست کے پاس بغرض استفسار آیا تھا تو انہوں نے یہ لکھ دیا تھا کہ یہ لفظ (بن) نہیں بلکہ (ہی) یا (بھی) ہے ' اس صورت میں مطلع ٹھیک ہو جاتا ہے ' اور شعرا نے بھی اپنی اپنی رائیں پیش کیں مگر عقیدت مند کب مانتے ہیں - یہ پہلی غزل حمد میں ۷ شعر کی ہے مگر کوئی شعر خاص طور پر قابل ذکر نہیں ' دو ایک شعروں میں ناگوار تعقید بھی ہے دوسرے صفحے سے عشقیہ کلام شروع ہوتا ہے 'پہلا مطلع یہ ہے :

بکتے بکتے تو' تو اے ناصح مرا سر کھا گیا

دل گیا میرا تو پھر تیری گرہ سے کیا گیا

یہ " تیری گرہ سے کیا گیا " نظم کرنے کے لئے کہا گیا ہے - ایسے شعر وہ خود بہت پسند کرتے اور شعر یہ جھوم جھوم کر سناتے تھے - دوسرا شعر ملاحظہ ہو :

شاعر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے' اور زیادہ افسوس اس کا ہے کہ اپنی خصوصیات اور کمالات بھی اپنے ساتھ ہی لیتے گئے - حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم' جناب شاد عظیم آبادی' مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی' مولانا شرر لکھنوی' اور جناب شوق قدوائی اس دور میں ادب اُردو کے زبردست ارکان تھے -

حضرت شوق قدوائی ایک قادرالکلام' کہنہ مشق اور رنگ قدیم و جدید کے مالک تھے - اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے مجموعۂ اضداد ہستی تھے - ان کا دیوان اور غزلیں اگر دیکھیے تو مذاق جدید اور جذبات نگاری سے بالکل الگ ہیں' قدیم رنگ نمایاں ہے اور وہ بھی خاص ہے - لکھنؤ کا فرسودہ رنگ رعایت لفظی کا تو اتنا زیادہ نہیں مگر محاورات' ضرب المثال' بول چال نظم کرنے کی خاص کوشش کرتے ہیں' اور آورد کو آمد بنانے کی بھی - یہی ان کے دیوان کا امتیازی رنگ ہے - اس پر بھی شگفتگی اور برجستگی بہت ہے اور یہ کمال مشاقی کی دلیل ہے کہ کلام گنجلک نہیں ہونے پایا - یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کا خاص ذوق رکھتے ہیں - ان کا زور زیادہ تر لفظی صنائع اور فنی خوبیوں تک ہے لیکن شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ شعر کی اصل روح جو اُسے انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچا دے وہ نہیں ہے اور ہے بھی تو بہت کم - بخلاف اِس کے اُن کی نظمیں نہایت پاکیزہ ہیں - اور بعض تو جذبات کی صحیح ترجمانی کے لحاظ سے ملک میں بے حد مقبول ہوئی ہیں-خاص کر "عالم خیال" جس میں ایک ایسی خاتون کے جذبات وخیالات ظاہر کئے ہیں جو اپنے شوہر سے دور ہے' یہ اپنے گھر میں ہے اور شوہر پردیس میں- حقیقت یہ ہے کہ یہ مرحوم کی ایک بے مثل نظم ہے' خصوصاً ہماری تعلیم یافتہ مسلمان خواتین میں اس نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے- اس کے علاوہ اور نظمیں بھی بغایت دل پسند ہیں اور یہ اتنا ذخیرہ ہے کہ اگر کتابی صورت میں چھپے تو اچھا خاصہ حجم ہوگا - اور ہمارا یہ خیال ہے کہ مرحوم کے دیوان سے زیادہ اس وقت اُن کے مجموعۂ نظم کی ملک کو ضرورت تھی -

زیر تنقید دیوان میں غزلیں ہیں' مگر یہ غزلیں اس رنگ میں نہیں جو آج کل مقبول ہے - اگرچہ زیادہ حصہ آخر عمر اور درمیانی عمر کا ہے' کیونکہ ابتدائی عمر کا کلام زیادہ تر ضائع ہوگیا' اور جو بچ رہا تھا اس کا بھی اکثر و بیشتر حصہ خود مصنف نے اپنے ذوق کے سبب تلف کردیا - آخر دیوان میں چند اخلاقی قطعات اور رباعیاں ہیں' مگر ان میں بھی جان شاعری کی وہی کمی ہے جو غزلیات میں ہے - ایک امتیازی خصوصیت دیوان کی یہ ہے کہ غزلوں میں زبان نہایت صاف و شستہ اور صحیح استعمال کی ہے اور اشعار کی تعداد بہت کم رکھی ہے' جو

مقلدین کی خصوصیت تھی' رعایت لفظی زیادہ نہیں' لیکن صحت زبان اور محاورات و ضرب الامثال بندی کے سوا اور کوئی بات مشکل سے موجودہ دور ادب اور مذاق سلیم کے لئے دل چسپ ہوسکتی ہے -

دیوان کے شروع میں مرحوم کے صاحبزادے شیخ طاہر علی صاحب کا ایک صفحے کا دیباچہ ہے ' اس کے بعد مولوی معین الدین صاحب بی اے (کانتب) بورسٹر ایٹ لا لکھنو کا ایک بسیط مقدمہ ۲۸ صفحات کا ہے' جس میں مصنف کے سوانح حیات' خصوصیات کلام ' خصائل' مزاج ' تصانیف و کلام پر تبصرہ اور بہت سی باتیں آگئی ہیں ' تاہم ہمارے خیال میں یہ مقدمہ ابھی تشنہ ہے - اس میں کئی اور اہم چیزیں رہ گئی ہیں ایک تو ان کے تصانیف کا ذکر تفصیلی نہیں ہے - بعض کا نام تک مذکور نہیں- دوسرے ان کے تلامذہ کا بالکل ذکر نہیں اس کے علاوہ بعض اور بھی قابل تذکرہ باتیں چھوٹ گئی ہیں -

دیوان اس مطلع سے شروع ہوتا ہے :

مرا حق مان کر بن تو مرا حاجت روا ہونا
کہ میں مانے ہوئے ہوں اے خدا تیرا خدا ہونا

پہلے مصرعے کے لفظ بن پر دوران طباعت میں بحث ہو چکی ہے ' آخر میں تمام "عقیدت مند" اسی نتیجے پر پہنچے کہ اپنی کوتاہ نظری تسلیم کرلی جائے ' اور اس پر حرف نہ رکھا جائے ' مطلع بجنسہ رہنے دیا جائے لیکن یہ ہمارے خیال میں زبردستی ہے ' جو بات سچ ہو وہ کہنی چاہیے کہ بن یہاں کسی طرح نہیں کھپتا ' ورنہ ردیف بیکار ہوتی ہے ' کیا لکھنؤ میں اب کوئی ایسا زباں داں نہیں جو اس معمے کو حل کرتا ' یا اسے کم از کم کتابت ہی کی غلطی سمجھ لیا جا سکتا - یہ مطلع طبع دیوان کے وقت ہمارے ایک دوست کے پاس بغرض استفسار آیا تھا تو انہوں نے یہ لکھ دیا تھا کہ یہ لفظ (بن) نہیں بلکہ (ھی) یا (بھی) ہے ' اس صورت میں مطلع ٹھیک ہو جاتا ہے ' اور شعرا نے بھی اپنی اپنی رائیں پیش کیں مگر عقیدت مند کب مانتے ہیں - یہ پہلی غزل حمد میں ۷ شعر کی ہے مگر کوئی شعر خاص طور پر قابل ذکر نہیں ' دو ایک شعروں میں ناگوار تنقید بھی ہے

دوسرے صفحے سے عشقیہ کلام شروع ہوتا ہے 'پہلا مطلع یہ ہے :

بکتے بکتے تو ' تو اے ناصح مرا سر کھا گیا
دل گیا میرا تو پھر تیری گرہ سے کیا گیا

یہ " تیری گرہ سے کیا گیا " نظم کرنے کے لئے کہا گیا ہے - ایسے شعر وہ خود بہت پسند کرتے اور اکثر یہ جھوم جھوم کر سناتے تھے - دوسرا شعر ملاحظہ ہو :

کچھ شباب آتے ہی آج اس پر تو کل اس پر ستم
اک ذرا سا حسن کیا پایا کہ تو، اترا گیا

اس میں زبان کا جو لطف ہے، وہ تو اہل نظر سے مخفی نہیں لیکن پہلے مصرعے میں (کچھ) کچھ یونہیں سا ہے، اور دوسرے میں "ذرا سا حسن" معشوق کے لیے کہنا صحیح ذوق محبت کے منافی ہے۔ سچ یہ ہے کہ حضرت شوق کی شاعری محبت کی شاعری نہیں بلکہ رسمی غزل گوئی تلازمہ و محاورہ بندی ہے۔ اور فرماتے ہیں:

مرے منہ پر کسی سے لے کے تجھ کو پان کھانا تھا
ترے ہونٹھوں کو میرے خون کا بیڑا اٹھانا تھا
یہ آہیں چند میں نے کھینچ دیں صرف اوپرے دل سے
اثر کی کب تمنا تھی فقط اُس کو ڈرانا تھا

آہیں کھینچ دینا، یا کھینچ لینا، دونوں ٹھیک نہیں۔ آہیں کھینچیں ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔ پہلے شعر میں "مرے منہ پر" بھی اچھا نہیں ہے۔ اس زمین میں یہ شعر خوب کہا ہے:

تمہاری، غیر کی، ناصح کی، اب تو سب کی سنتے ہیں
کسی کی ہم نہیں سنتے تھے وہ بھی اک زمانا تھا

حقیقت میں بہت پاکیزہ شعر ہے، یہ حالت ایک وقت انسان پر گذرتی ہے اور پھر ضرور اس کی یاد آتی ہے ——

ذیل کے مطلع میں بھی ایک بات نظم کی ہے، یہ اور اس قسم کے کثرت سے اشعار ایسے ہیں، جن پر خود مصنف کو ناز تھا، اور بہت سے احباب و عقیدت مند محض مروتاً شوق سے سنتے اور جوش و خروش سے داد دیتے تھے۔ آخر میں تو وہ صرف لغت و زبان کی ضرورت سند کے لئے شعر کہا کرتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ محاورات نظم میں بندھ جائیں تاکہ لغت کی کتابوں کے لئے سنداً آئندہ کام آئیں فرماتے ہیں:

دل کھوتا ہے، ہم کو اس سے راز عشق نہ کہنا تھا
"گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" اتنا سمجھے رہنا تھا
کیوں ہنستے ہو، میں جو برہنہ آج جنوں کے ہاتھوں ہوں
کچھ دن گزرے میں نے بھی خوش رنگ لباس اک پہنا تھا

خوش رنگ لباس سے غالباً جوگیا لباس مراد ہے جو بعد کو شدت جنوں نے اتار

پھنکوایا اب شاعر ننگا پھر رہا ہے اور لوگ اس فطری لباس پر ہنس رہے ہیں -
یہ مقطع میر تقی کی شاعری اور اُسی دور قدیم کی یاد دلاتا ہے :

ہمت ہاری ' جی دے بیٹھے' سب لذت کھوئی اے 'شوق'
مرنے کی جلدی ہی کیا تھی ' عشق کا غم کچھ سہنا تھا

متقدمین کی طرح چھوٹی اور طویل بحروں میں ' آخر عمر میں بہت طبع آزمائی کی ہے ' مگر دل میں وہ درد ' وہ کسک نہیں ' نہ صحیح مذاق شعری ' اور متحمت کی چاشنی ہے - بعض بعض شعر ضرور قابل قدر ہیں ' یہ شعر بھی بڑے مزے کا کہا ہے :

آنکھ اس ادا سے اُس نے دکھائی کہ میں نے ' شوق '
چپکے سے اپنا ہے کا بھرا جام رکھ دیا

کوئی نئی بات نہیں ' مضمون پامال و فرسودہ ہے لیکن زبان کی صفائی و سادگی اور بندش کی بر جستگی و چستی نے خاص مزہ پیدا کردیا ہے - یہ شعر اُنہیں کے رنگ کا ہے:

وہ بد خو ہے ' اور ٹھکانا ڈھونڈیں دل بہلانے کا
اب سے آئے گھر سے آئے ' نام نہ لیں گھر جانے کا

اس کے دوسرے مصرعے میں بھی ایک محاورہ کامیابی کے ساتھ نظم کیا ہے - رامپور کے قیام میں جب کہ حضرت شوق کا آخری دور تھا ' وہ ایسی بحروں میں فکر کرتے تھے ' قدرت کلام حاصل تھی - مگر رعایت لفظی اور محاورہ بندی ہاتھ سے کہاں جاتی ہے - درد و اثر ' جذبات نگاری' معاملات ' جو تغزل اور شعر کی جان ہے' بہت کم پائی جاتی ہے - البتہ کہیں کہیں کچھ جھلک ہے ' مثلاً

بو آتی ہے ساتھ ہر نفس کے   کچھ جلنے لگا کباب کا سا

بیٹھ گیا 'شوق' ایک گلی میں   کیا جانوں کیا جی میں آیا
شباب آیا ' وہ آفت ڈھارہے ہیں   نئی دولت ملی اترا رہے ہیں
نہ پوچھو غم میں دل کے ضعف کا حال   کہاں کا دل ہمیں اب کیا رہے ہیں
جگنے ٹکڑے ہیں دل نا کام کے   سب نگینے ہیں تمہارے نام کے
پڑتی ہے تجھ پر فرشتوں کی نظر   منہ چھپا او سونے والے بام کے
سن کے میر انام بولے کون 'شوق' ؟   سیکڑوں دنیا میں ہیں اس نام کے

کیا مزیدار شعر کہے ہیں ' زبان کی سادگی قابل داد ہے' اور سنئے :

کچھ دل کی سناؤں کچھ جگر کی   بیٹھو تو کہوں اِدھر اُدھر کی

کچھ شباب آتے ہی آج اس پر توکل اس پر ستم
اک ذرا سا حسن کیا پایا کہ تو، اترا گیا

اس میں زبان کا جو لطف ہے، وہ تو اہل نظر سے مخفی نہیں لیکن پہلے مصرعے میں (کچھ) کچھ یونہیں سا ہے، اور دوسرے میں "ذرا سا حسن" معشوق کے لیے کہنا صحیح ذوق محبت کے منافی ہے - سچ یہ ہے کہ حضرت شوق کی شاعری محبت کی شاعری نہیں بلکہ رسمی غزل گوئی تلازمہ و محاورہ بندی ہے - اور فرماتے ہیں :

مرے منہ پر کسی سے لے کے تجھ کو پان کھانا تھا
ترے ہونٹوں کو میرے خون کا بیڑا اٹھانا تھا
یہ آہیں چند میں نے کھینچ دیں صرف اوپرے دل سے
اثر کی کب تمنا تھی فقط اُس کو ڈرانا تھا

آہیں کھینچ دینا، یا کھینچ لینا، دونوں ٹھیک نہیں - آہیں کھینچیں ہی فصیح معلوم ہوتا ہے - پہلے شعر میں "مرے منہ پر" بھی اچھا نہیں ہے - اس زمین میں یہ شعر خوب کہا ہے :

تمہاری، غیر کی، ناصح کی، اب تو سب کی سنتے ہیں
کسی کی ہم نہیں سنتے تھے وہ بھی اک زمانا تھا

حقیقت میں بہت پاکیزہ شعر ہے، یہ حالت ایک وقت انسان پر گذرتی ہے اور پھر ضرور اس کی یاد آتی ہے —

ذیل کے مطلع میں بھی ایک بات نظم کی ہے، یہ اور اس قسم کے کثرت سے اشعار ایسے ہیں، جن پر خود مصنف کو ناز تھا، اور بہت سے احباب و عقیدت مند محض سروتاً شوق سے سنتے اور جوش و خروش سے داد دیتے تھے - آخر میں تو وہ صرف لغت و زبان کی ضرورت سند کے لئے شعر کہا کرتے تھے - اور چاہتے تھے کہ محاورات نظم میں بندھ جائیں تاکہ لغت کی کتابوں کے لئے سنداً آئندہ کام آئیں فرماتے ہیں :

دل کھوتا ہے، ہم کو اس سے راز عشق نہ کہنا تھا
"گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" اتنا سمجھے رہنا تھا
کیوں ہنستے ہو، میں جو بڑھ کے آج جلوں کے ہاتھوں ہوں
کچھ دن گزرے میں نے بھی خوش رنگ لباس اک پہنا تھا

خوش رنگ لباس سے غالباً جوگیا لباس مراد ہے جو بعد کو شدت جلوں نے اتار

پھنکوایا اب شاعر ننگا پھر رہا ہے اور لوگ اس فطری لباس پر ہنس رہے ہیں -

یہ مقطع میر تقی کی شاعری اور اُسی دور قدیم کی یاد دلاتا ہے :

ہمت ہاری ' جی دے بیٹھے' سب لذت کھوئی اے 'شوق'
مرنے کی جلدی ہی کیا تھی ' عشق کا غم کچھ سہنا تھا

متقدمین کی طرح چھوٹی اور طویل بحروں میں ' آخر عمر میں بہت طبع آزمائی کی ہے ' مگر دل میں وہ درد ' وہ کسک نہیں ' نہ صحیح مذاق شعری ' اور معصیت کی چاشنی ہے - بعض بعض شعر ضرور قابل قدر ہیں ' یہ شعر بھی بڑے مزے کا کہا ہے :

آنکھ اس ادا سے اُس نے دکھائی کہ میں نے ' شوق '
چپکے سے اپنا مے کا بھرا جام رکھ دیا

کوئی نئی بات نہیں ' مضمون پامال و فرسودہ ہے لیکن زبان کی صفائی و سادگی اور بندش کی بر جستگی و چستی نے خاص مزہ پیدا کردیا ہے - یہ شعر اُنہیں کے رنگ کا ہے:

وہ بدخو ہے ' اور تھکانا ڈھونڈتیں دل بہلانے کا
اب سے آے گھر سے آئیے ' نام نہ لیں گھر جانے کا

اس کے دوسرے مصرعے میں بھی ایک محاورہ کامیابی کے ساتھ نظم کیا ہے -
رامپور کے قیام میں جب کہ حضرت شوق کا آخری دور تھا ' وہ ایسی بحروں میں فکر کرتے تھے ' قدرت کلام حاصل تھی - مگر رعایت لفظی اور محاورہ بندی ہاتھ سے کہاں جاتی ہے - درد و اثر ' جذبات نگاری' محاکات ' جو تغزل اور شعر کی جان ہے' بہت کم پائی جاتی ہے - البتہ کہیں کہیں کچھ جھلک ہے ' مثلاً

بو آتی ہے ساتھ ہر نفس کے — کچھ جلنے لگا کباب کا سا
بیٹھ گیا 'شوق' ایک گلی میں — کیا جانیں کیا جی میں آیا
شباب آیا ' وہ آنت ڈھارہے ہیں — نئی دولت ملی اترا رہے ہیں
نہ پوچھو غم میں دل کے ضعف کا حال — کہاں کا دل ہمیں اب کیا رہے ہیں
چھلنے ٹکڑے ہیں دل ناکام کے — سب نگینے ہیں تمھارے نام کے
پڑتی ہے تجھ پر فرشتوں کی نظر — منہ چھپا او سونے والے بام کے
سن کے میر انام بولے کون 'شوق' ؟ — سینکڑوں دنیا میں ہیں اس نام کے

کیا مزیدار شعر کہے ہیں ' زبان کی سادگی قابل داد ہے' اور سنئے :

کچھ دل کی سناؤں کچھ جگر کی — بیٹھو تو کہوں اِدھر اُدھر کی

ذیل کا شعر کیا لاجواب کہا ہے :

دامن کو ذرا بچائے رہنا دنیا نہیں گرد ہے سفر کی

کٹ گئی عمر لکھتے لکھتے خط اور ابھی حال عشق مجمل ہے

بہر حال دیوان شوق جیسا کہ مقدمہ نگار صاحب نے لکھا ہے " زیادہ تر اس غرض کے لئے ہے کہ آئندہ کے طالبان فن اور محققین زبان ان کے نتائج کتب بینی اور پنجاہ سالہ تجربے سے فائدہ اٹھائیں " مگر شاعرانہ دل فریبیاں بھی اس کے صفحات میں ملتی ہیں اور وہ قدیم طرز میں بھی بندش سے بعض اوقات خاص لطف پیدا کر دیتے ہیں ۔ مثلاً :

ہم نہ مانیں کہ کھلی سرخی خواب آنکھوں سے
پھوٹ نکلا ہے ذرا رنگ شباب آنکھوں سے
دو گھڑی کے لئے وہ آئے تو دو گھر لوٹے
لے گئے چھین کے دل سینے سے خواب آنکھوں سے

کیا مشکل زمین ہے ، جس میں (آنکھوں سے) ردیف ہے ، مگر کیا اچھے اچھے شعر اپنی مشاقی اور قادر الکلامی سے نکال لئے ہیں اور دیکھئے :

اتنی تو اس نے کی مری دل سوزیوں کی قدر
تربت پہ اک چراغ سر شام رکھ دیا
گل ہو کے میں کیا ہنستا ایسا نہ تھا غم میرا
شبنم کی طرح گزرا روتے ہی جنم میرا

اس میں جنم گزرا باندھا گیا ہے ، خدا جانے یہ کہاں تک بلحاظ زبان ٹھیک ہے نئے نئے قافیوں اور ردیفوں میں کثرت سے دیوان شوق میں غزلیں ملیں گی ۔ یہ کیا خوب کہا ہے :

رونے سے میرے کھل گیا ظالم پہ درد عشق
ہچکی جو آئی ، منہ سے کلیجا نکل پڑا

' ذوق و ظفر کی طرح ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت شوق محاورہ بندی و مثل بندی کا جیسا شوق ہے ویسا ہی مشکل زمینوں میں بھی کھیلنے کا ذوق و ملکہ رکھتے ہیں اور ایسے ایسے شعر نکالے ہیں کہ ان کی قدرت کلام کو ماننا پڑتا ہے مگر اپنا رنگ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ فرماتے ہیں :

میں غیر ہوں اس سے کھٹک جائے تو اچھا
دل اس کا مرے دل سے اٹک جائے تو اچھا

دل مرا ٹوٹا تو اس کو کچھ ملال آ ہی گیا
اپنے بچپن کے کھلونوں کا خیال آ ہی گیا

وصل کی شب مجھے کیا کیا ہوے دھڑکے اے شوق
اس کی پرچھائیوں میں تھا نور سحر ہی کا سا

کچھ ہٹا رنگ اسکی مہندی کا تو لطف آنے لگا
چاند کا ٹکڑا وہ ہر ناخن پہ چمکا نے لگا

دو شعر یہ بھی کیا خوب ہیں:

ہاتھوں سے مونہہ چھپا کر دل مفت لو کسی کا
یوں بھی کہیں ہوا ہے سودا ہنسی خوشی کا

پا مردی جنوں نے کیا کیا دکھائیں سیریں
وارفتہ ہو گیا میں صحرا کی زندگی کا

یہ زمین دیکھئے:

سر کو کسی معشوق پہ وار آؤں تو اچھا
جن عشق کا یوں سر سے اتار آؤں تو اچھا

اس قسم کا ابتذال مذاق ہمارے قدیم استادان فن کے کلام میں اکثر ہے، اور یہ نتیجہ ہے لفظی شاعری کا - ذیل کے شعر میں ایک بات پیدا کی ہے —

جبر شیوہ نہیں ارباب وفا کا ورنہ
تو متوجہ کشش دل کے اثر میں رہتا

حسن خالق نے دیا تھا تو دیا تھا لیکن
یہ بھی کیا اس نے کہا تھا کہ ستم گر ہو جا

جان اب نہیں باقی ہے مجھے دفن کرا دو
تم دل پہ نہ جاؤ یہ اچھلتا ہی رہے گا

دل کا دینا مجھے کیا آپ ہی منظور ہوا
بہک پڑی اس پہ جوانی تو میں مجبور ہوا

میری قسمت سے ہوا نذر تغافل وہ بھی
میں تو سمجھا تھا کہ جور اب ترا دستور ہوا

ناخن اب کاوش ہر روزہ کے غم سے چھوٹا
مستقل لطف ہوا، داغ جو ناسور ہوا

ضعف میں بھی کام مثل رنگ چل ہی جائیگا
وہ نہ ہو جنبش مرا پہلو بدل ہی جائیگا

ذیل کا شعر بھی آج کل کون پسند کریگا :

یاد آئے گا چھنگی کا دودھ، جس دن اے مسیح
اس لب معجز نما کا سامنا کرنا پڑا

اس زمین میں اور بھی شعر ہیں مگر ہمارے کام کا کوئی نہیں، ابتذال کا ایک شعر اور دیکھیے :

بلبل سے لڑا دیتے ہیں گُل مجھ کو دکھا کر
دیتے ہیں وہ دھوکا کہ یہ ہے گال ہمارا

یہ شعر اچھا کہا ہے :

میں کس امید پہ دیکھوں ستم ظریف کا منہ
جواب ایک تبسم ہے سو سوالوں کا

یہ پوری غزل سلجھی ہوئی اور اچھی ہے - پھر کہتے ہیں :

دل پڑا نظروں کی تیغوں میں تو کٹ ہی جائے گا
ٹکرے ٹکرے ہوکے پھر غمزوں میں بٹ ہی جائے گا

ہم وہ نہیں کہ حشر میں قائل ہوں آپ سے
میدان ہی میں اٹھ کے قدم لینگے دیکھنا

یہ شعر داد طلب نکل گیا ہے :

وہ دن فراق کا کہ نہ لائے خدا جسے
اس عشق میں پڑا ہے بہر طور دیکھنا

کچھ سہارا مرے جینے کا رہا ہی کب تھا
ابھی مرنا نہیں تم نے یہ کہا ہی کب تھا

دل ہی قابو میں نہیں تجھ پہ جو قابو ہو تو کیا
یاس دونوں سے ہے اب دل ہو تو کیا تو ہو تو کیا

تب تو مارا مجھے حشر آیا تو گھبرائے نا ؟
میں جو کہتا تھا کہ پچھتاؤگے پچھتائے نا ؟

کوئی مقام نظر آگیا جو بن کا سا کہا جنوں نے کہ یہ ہے مرے وطن کا سا

یہ سب غزلیں مشکل زمینوں میں ہیں، اور یہ زیادہ تر خود حضرت شوق

ہی کی اختراع ہیں ۔ شعر تقریباً ایسے ہی ہیں جیسے یہ مطلعے ہیں۔ یہ شعر غور طلب ہے :

چمن سے صبر ہے مجھ تک ہوا تو آنے دے
زہ بستگی کو مرے پنجرے پہ کس صیاد

اس غزل میں کس ' بس قافیہ ہے ۔ اور اس شعر میں ' پنجرا ' بر وزن فاعلن کہا ہے' حالانکہ زبانوں پر تو 'پنجرا' بر وزن فعلن ہے ۔ مقصود شعر صرف بستگی کو باندھنا تھا اور کچھ نہیں ۔ ایک یہ زمین نکالی ہے :

سبزہ رنگوں پر لہرائے ' شوق کریں وہ ترنگ تو پھر؟
بھنگ کا کھانا سہل ہے لیکن موجیں لائیں رنگ تو پھر؟

عجب زمین ہے ' اس میں شعر کہنا مشکل ہے ۔ کلام موزوں البتہ ہوسکتا ہے ۔ دوسرے مصرعے میں بھنگ کھانا محل تامل ہے بھنگ پینا زیادہ متعارف ہے ۔

گالوں سے عارض اس کا شباب آیا نظر
گھونگھروں سے حسن رخ چادر رکاب آیا نظر

موت آگئی اب آئے تو کیا دوگے تم آکر
کچھ نیند نہیں ہے کہ جگا دوگے تم آکر

ہم بھی ہیں ولولوں پہ جو وہ ہیں اُمنگ پر
دونوں تلے ہوئے ہیں برابر کی جنگ پر

یہ سب شعر خاص اُن کے رنگ کے ہیں ۔یہ شعر کیا خوب کہا ہے :

دل پڑگیا کشاکش امید و بیم میں   در پر کبھی نظر ہے کبھی پاسبان پر

مضمون رشک اکثر شعرا نے باندھا ہے ' حضرت شوق فرماتے ہیں :

اس رشک سے لکھا نہ کبھی میں نے ' شوق' خط
آئے گا اس کا نام قلم کی زبان پر

یہ شعر بھی خوب کہا ہے اور ایسی زمینوں میں شعرائے موجودہ کو ضرور فکر کرنا چاہئے بلکہ ان کا عام رواج ہونا چاہئے کہ قید ردیف سے آزاد ہیں ۔ فرماتے ہیں :

وارفتگی عشق میں باقی نہ رہے ہوش
ہستی مری مجھ کو ہوئی اک خواب فراموش

جس ستم گر نے کیا لاکھوں تمناؤں کا خوں
یاد کرتی ھے تمنا پھر اس کو آج کل

" کو آج کل " اس غزل کی زمین ھے ' مگر یا کیزہ شعر نکلا ھے - اور فرماتے ھیں

ملنے والے چھوڑتے جاتے ھیں کچھ رو جان کر
جا رھے ھیں ھم دیار بیکسی کو آج کل

یہ کچھ رو کچھ بیا نہیں - چند اور منتخب شعر لکھتا ھوں :

ظالم کی جفا کہ نہ مرا درد جگر کم
ھے لاگ بڑا بر کی ادھر کم نہ ادھر کم
مل کے ھوے جو آشنا ھم سے نظر نظر سے ھم
کٹ کے ھوے جدا جدا ھم سے جگر جگر سے ھم

وہ ترس کھا کر جودل سے مجھے حزیں کی سی کہیں
لب نمک پروردہ ان کے ھیں انھیں کی سی کہیں
غرور جور کا نانی ھے اور کچھ بھی نہیں
یہ مقتضاے جوانی ھے اور کچھ بھی نہیں

نفس کی چال تورے گھر سے چل کے جاتے ھیں
یہیں پھر آتے ھیں جب ھم نکل کے جاتے ھیں

ھے آئینے میں اپنا محو دیدار آپ ھی آپ تو
وہ اپنی ناک چوتی ھے گرفتار آپ ھی آپ تو

گلیوں گلیوں ھم نے لاکھوں ٹھکرے پتھر کھائے ھیں
لڑکوں نے دیوانہ پا کر ناک چنے چبوائے ھیں

ان دونوں مذکورہ شعروں میں صرف دو محاورے باندھنا تھے ' وہ تو بندھ گئے مگر مذاق لطیف کا خون ھو گیا - اور سنئے :

دل ھے فریادی کہ دست ظلم کا گل ھے دراز
باندہ لو جوڑا کہ قصہ مختصر ھی کیوں نہ ھو

یہ غزل کیا خوب کہی ھے:

دل لوٹکے گئی ھے کہ جگر لے کے گئی ھے
کچھ تو مرے پہلو سے نظر لوٹکے گئی ھے

اللہ کرے آج نہ پلٹائے اسے یاس
امید جسے جانب در لیکے گئی ہے
باد سحری ان کو مرا حال دکھانے
سوکھا ہوا اک برگ شجر لیکے گئی ہے

ذیل کا شعر مصنف نے نکالدیا ' مگر ہمیں یاد رہ گیا تھا ' دیوان میں نہیں ہے :

برچھی سے کبھی میلے چرایا نہیں پہلو
جب آئی ہے تب لذت جگر لیکے گئی ہے

یہ غزل کیسی مشکل زمین ہے مگر مطلع ہی سے اس کا اندازہ کر لیجیے :

روؤں اے بادل تو جل تھل بھر کے چھوڑوں تو سہی
تجھہ کو میں پانی سے پتلا کر کے چھوڑوں تو سہی

"توسہی" کی ردیف میں صرف اپنا کمال اور مشاقی دکھانا تھا۔ ابتذال کی حدھوگئی

یہ شعر خوب کہے ہیں :

ہر روز ترقی پہ جو ہے حسن کی صورت
ایک ایک سے ملتی نہیں تصویر کسی کی

اس قافیے میں یہ شعر خوب کہا ہے اور مجھے بہت پسند آیا :

پہنچا ہے جنوں تک اثر جوش گل ایسا
بلبل سی چھکنے لگی زنجیر کسی کی

یہ مطلع بھی بہت پاکیزہ کہا ہے :

کیا قیامت ہے کہ چڑھتا ہے نہیں سے کوئی
روز اک دل انہیں دے لا کے کہیں سے کوئی
گر پڑا ہاتھہ سے آئینہ ' یہ ہم نے دیکھا
پوچھے اب اُن کے تحیر کو انہیں سے کوئی
ان بلاؤں نے کہاں سے مرا گھر دیکھہ لیا
کہ فلک سے کوئی آتی ہے زمیں سے کوئی

وہ خوش کہ ہے جگر کو نظر میں لئے ہوئے
میں خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لئے ہوئے
زلفوں سے دل کو پھونک بھی دو ورنہ عمر بھر
بیٹھے رہو گے درد وہ سر میں لئے ہوئے

دوسرے مصرعے میں 'فود کو' تھا پھر مصنف نے 'درد وہ' بنایا - لیکن حقیقت یہ ہے کہ 'کو' اور 'وہ' دونوں برائے بیت ہیں - ذیل کا شعر کیا خوب کہا ہے حالانکہ زمین اپنی مشکل ہے -

خدا ہی ہے مری توبہ کا جب ساقی کہے مجھ سے
ارے پی بھی کہاں کی پارسائی لے کے بیٹھا ہے
دیکھنا اس کا نہ ہو اے شوق اگر مد نظر
آنکھ میں پتلی تو پتلی میں نظر ہی کیوں بنے
بچپن میں جو اڑاتے تھے کل پر لئے ہوئے
سر آج اڑا رہے ہیں وہ خنجر لیے ہوئے
قد جو اوروں سے ہے نیچا تو نہ شرماؤ تم
ناز سے باغ میں نخل گل تر نیچا ہے

دونوں شعر ابتذال ذوق کے گواہ ہیں اور ذیل کے شعر خوب ہیں :

ہماری جان وہ کیا لیں بدن میں جب ہو بھی
بدن بھی کھلکے ملا پیرہن میں جب ہو بھی

غالباً اہل زبان ایسی جگہ 'جب ہو بھی' کی جگہ 'ہو بھی' اب کافی اور فصیح سمجھتے ہیں —

درازدستی زلف رسا کے ہم قائل
مگر کہاں دل وحشی بدن میں جب ہو بھی
چھری کے وار پہ منہ سے دعا نکلتی ہے
کسی کا ہاتھ' کسی کی زبان چلتی ہے
بتاؤں کیا شب فرقت میں سانس کی حالت
تمام رات چھری سی جگر پہ چلتی ہے
ہوا نہ بگڑے کہاں تک دیار الفت کی
تری زبان تو ہر وقت زہر اگلتی ہے
ہوا ہو' چاہے زمانہ ہو چاہے' رنگت ہو
زیادہ سب سے تمہاری نظر بدلتی ہے

مذکورہ غزل کیا خوب کہی ہے' مشکل زمینوں میں دو تین شعروں کی اور وضعت فرمائیے —

تیر کو کیوں دوں کہ جس رخ جائے وہ دل لے کے جائے
دوں نظر کو جو پھرے اور سوئے قاتل لے کے جائے
جھڑکیاں ان کی سہوں میں یہ تو ممکن ہے مگر
مسکرا ہی کیوں نہ دیں غصہ اتر ہی کیوں نہ جائے

یہ جناب شوق قدوائی مرحوم کے رنگ تغزل پر ایک بسیط نظر تھی، حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ مگر زمانے کی بد مذاقی کی اُدھر بہا لے گئی اور پھر ایسا رنگ چڑھا کہ طبیعت ثانیہ بن گیا۔ ورنہ وہ صرف بیانیہ نظموں کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ اور ان کی بہت سی نظمیں بے مثل ہیں، بہت مقبول ہیں، کورس میں شامل ہیں، اور ارباب ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کے بلند اقبال صاحبزادے شیخ طاہر علی اور داماد لائق شیخ رضی الدین صاحب بیرسٹر ان کی نظموں کو بھی اسی شان اور اہتمام سے جلد چھپوا دیں گے۔ اور مقدمے میں جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری ہوجائے گی۔ تاکہ اس بلند پایہ شاعر کی اصلی کاوش فکر کے نتائج سے دنیا محروم نہ رہے اور یوں دیوان کے مطالعے کے بعد ناظرین مایوس نہ ہوں بلکہ اس کوفت کی پوری تلافی ہوسکے —

عناصر اربعۂ رباعی (فارسی)

مؤلفۂ مولوی مسعود علی صاحب بی۔ اے، ملنے کا پتہ: آقا سید محمد علی
پروفیسر نظام کالج حیدرآباد۔ دکن۔ قیمت ۹ آنے، حجم ۵۹ صفحے۔
سائز ۱۸ × ۲۲۔ لکھائی چھپائی، کاغذ متوسط

یہ ایک فارسی لکچر ہے، جو مؤلف صاحب نے "شعبۂ جامعۂ معارف ایران در حیدرآباد" کے ایک جلسے میں ۲۱ جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۴۴ھ کو دیا تھا، اور اب شائع ہوا ہے۔ اس میں رباعی کی تاریخ، اس کے اوزان مقررہ کے بعد اپنے خیال کے موافق یہ بتایا ہے کہ فارسی ادبیات میں رباعی کے چار نمایاں عناصر بابا طاہر عریان، ابو سعید ابوالخیر، خیام اور سحابی استر آبادی ہیں۔ ان نامور شعرا کے مختصر حالات بھی دیے ہیں اور کچھ کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ رباعی پر یہ ایک اچھا خاصہ چھوٹا سا رسالہ ہے —

غالب اور اس کی شاعری

از مولوی احمد الدین احمد صاحب مارہروی بی۔ اے، سائز چھوٹا۔
قیمت ۹ آنہ حجم ۴۰ صفحے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ متوسط
ملنے کا پتہ: سفیر بک ایجنسی۔ سبزی منڈی۔ الہ آباد۔

یہ مسلمہ ہے کہ ہندوستان میں جتنی روشن خیالی، تعلیم، اور سلامت مذاق بڑھتی جاتی ہے، اتنی ہی غالب شناسی بھی ترقی کر رہی ہے اور کرے گی۔ یہ رسالہ

بھی حالی و بجنوری کی حقیقت گوش نوا کی ایک صدائے باز گشت ہے۔ مؤلف نے مختصراً غالب کے کلام سے اس کا کمال ثابت کیا ہے اور یہ کہ حکمائے یورپ کے نزدیک حقیقی شاعری کیا ہے، شعر کی اصلی روح کیا۔ اور وہ غالب کے یہاں ایک بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مذہب

اسلام اور غیر مسلم

مولفۂ: مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواروی۔ ملنے کا پتہ:
مسلم بک ڈپو پھلواری شریف ضلع پٹنہ (بہار) سائز چھوٹا،
لکھائی، چھپائی، کاغذ متوسط۔ حجم ۷۲ صفحے، قیمت ۸ آنے

یہ اسلام کے خلاف اعتراضات کا ایک مفید تردیدی رسالہ ہے اور اس قسم کے مفید رسالے جناب مؤلف اور بھی شائع کر چکے ہیں جو نہایت مقبول ہوے ہیں۔ بعض کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے اسلام پر یہ ایک عام دشمنان اسلام کا اعتراض ہے کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ اس کا نہایت متین رد اس مختصر رسالے میں ہے —

تعلیم

بچوں کا دستور العمل (یا) سیرت و کردار

مصنفۂ مولوی محمد عبدالرحمن صاحب رئیس۔ ملنے کا پتہ:
مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ، حیدر آباد دکن قیمت آٹھ آنے
حجم ۹۰ صفحے

یہ چھوٹا سا رسالہ مؤلف نے بچوں کی ابتدائی تربیت اور اصلاح اخلاق کے لیے لکھا ہے قلم جلی ہے اور چھوٹے چھوٹے سبق ہیں - مثلاً : مدرسہ ' لباس ' وقت کی پابندی ' قرض ' حسد وغیرہ - زبان سہل ہے - جسے بچے بخوبی پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں ' اور اُن کے لیے مفید بھی ہے - بعض بیان اور کتابت کی غلطیاں البتہ محتاج اصلاح ہیں قیمت بھی زیادہ ہے اور نام بھی ہمارے خیال سے بھونڈا اور لمبا ہے —

فلسفۂ رنج و راحت

مصنفہ مولوی عبدالرب صاحب 'کوکب' مولوی فاضل اڈیٹر
رسالۂ اتالیق - حیدرآباد دکن - سائز چھوٹا - حجم ۵۹ صفحے '
قیمت دس آنے - لکھائی ' چھپائی ' کاغذ معمولی —

اس مثنوی میں مصنف صاحب نے یہ بتایا ہے کہ انسان کو ہر وقت خوش و مسرور رہنے کی کوشش کرنا چاہیے اور جو کچھ غم و آلام اُسے ہوتے ہیں ' ان کے اسباب وہ خود پیدا کرتا ہے - ذوق سلیم ہو تو ہر شے سے آدمی انبساط حاصل کرسکتا ہے - مثنوی کا بیان ذرا خشک ہے - اور شعری محاسن و دل کشی کم ہے - قیمت بھی بہت زیادہ ہے —

معیارالاخلاق ـ عربی

از مولوی عبدالرب صاحب 'کوکب' مولوی فاضل مدیر رسالۂ اتالیق
حیدرآباد دکن - قیمت درج نہیں - ملنے کا پتہ : مؤلف' محلہ
شاہ علی بنڈہ - حیدرآباد - دکن سائز ۱۸ × ۲۲ لکھائی'
چھپائی' کاغذ نہایت خراب -

یہ ایک عربی کا مختصر رسالہ ہے - جسے مبتدی عربی پڑھنے والوں اور کم عمروں کے لیے اخلاقی تعلیمی رسالہ سمجھنا چاہئے مختلف عنوانوں اور سرخیوں کو قائم کر کے اخلاق کی حقیقت ' اخلاق شریفانہ ' رذائل اخلاق آسان عربی میں بتائے گئے ہیں —

گاے بیل

(مؤلفۂ جناب محمد نصیر ہمایوں صاحب بی - اے - قومی
کتب خانہ ریلوے روڈ ، لاہور) —

یہ صاف اور سلیس زبان میں چھوٹی سی کتاب گاے بیل پر ہے - اس میں گاے بیل کی نسل، دودھ، بیماریوں، خوراک ، ان کی دیکھ بھال وغیرہ کے متعلق تمام حالات بہت اچھی طرح بیان کئے ہیں - تصویریں بھی دی ہیں —

ظریف معلم جلد اول و دوم

مؤلفۂ بابو ادیتہ پرشاد صاحب بی - اے، ال - ال - بی، وکیل لکھنؤ -
قیمت فی جلد ۵ آنے - ادیتہ بھون لکھنؤ)

قابل مؤلف نے باتوں باتوں، لطیفوں، چٹکلوں اور حکایتوں میں بچوں کو پڑھنے لکھنے کی چاٹ لگائی ہے - اسی کے ضمن میں اخلاقی سبق بھی آ گئے ہیں - اکثر سبق مکالمے کی صورت میں ہیں اور بہت دلچسپ ہیں - آج کل بچوں کے لئے بہت سی کتابیں لکھی جارہی ہیں، لیکن ایسی پر لطف کتابیں دیکھنے میں نہیں آتیں - زبان بہت صاف ستھری اور بامحاورہ ہے - کہیں کہیں سادہ تصویریں بھی ہیں - بچوں کے لئے یہ بہت اچھا تحفہ ہے —

تاریخ و سیر

مزارات حرمین

مؤلفۂ مولوی علی شبیر صاحب - سررشتہ دار انتظامی ہائی کورٹ حیدرآباد - دکن
مطبوعہ انوارالاسلام پریس - قیمت ۳ روپیہ ۸ آنہ - حجم ۳۰۰ صفحات
سے زیادہ - مجلد فل کلاتھ ۲۰×۲۶ - لکھائی، چھپائی عمدہ کاغذ متوسط سفید

جناب مؤلف کا یہ سفرنامۂ حرمین بھی ہے اور حقیقت میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مشہور مزارات و مقابر کی ایک جامع اور مفصل تاریخ ہے - جناب مؤلف

مذہب سے محبت اور اسلامی درد اپنے دل میں رکھتے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ سنہ ١٣٤٥ھ میں زیارت حرمین اور فریضۂ حج کے لئے گئے تھے اور ابن سعود والی حجاز و نجد نے ایک عبا بھی مرحمت کی تھا۔ انھوں نے حرمین کے مزارات اور مقابر کا یہ تذکرہ نہایت قابلیت سے مورخانہ انداز میں لکھا ہے۔ اس خاک پاک میں جتنے مزار اور قبرستان تاریخی و مذہبی رکھتے ہیں۔ ان سب کو جستہ جستہ موصوف نے دیکھا اور ان کی موجودہ و سابقہ حالت کو لکھا ہے۔ موجودہ حالت تو وہ ہے جو سعودی حکومت نے شرعاً مقابر کی بلندی و پختگی کو ناجائز سمجھ کر انھیں ڈھا دیا ہے۔ اور سابقہ حالت کو موصوف نے عربی فارسی انگریزی کی تاریخوں اور یورپ و ایشیا کے سیاحوں اور حاجیوں کے سفر ناموں سے اخذ کرکے بیان کی ہے۔ اس حیثیت سے یہ کتاب اپنی موضوع کے لحاظ سے تاریخ کی ایک اہم کتاب ہوگئی ہے۔ اور اب تک غالباً اس خاص موضوع پر عربی فارسی میں بھی کوئی کتاب نہ تھی۔ بیان میں کہیں مذہبی غلو نہیں ہونے پایا ہے اور زبان بھی صاف شستہ ہے، جا بجا جغرافی و تاریخی نوٹ دے کر اور زیادہ کتاب کو مفید بنادیا ہے، اب یہ مسلمانوں کے ان مقدس مقامات کے متعلق تاریخی معلومات کا مفید عمدہ ذخیرہ ہوگئی ہے —

وحیات جلیل

یعنی تذکرۂ علامۂ میر عبدالجلیل بلگرامی۔ مولانا جناب مقبول احمد صاحب صمدنی۔ دو حصوں میں۔ تعداد صفحات تقریباً چھ سو۔ مطبوعہ رام نراین لال الہ آباد۔ قیمت تین روپے)

اس کتاب میں ہندوستان کے ایک نامور فاضل علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس کے ضمن میں بہت سے مشاہیر اور مقامات واقعات کا ذکر آگیا ہے جو تاریخی لحاظ سے بہت ہی قابل قدر ہے۔ کوئی صفحہ حواشی سے خالی نہیں۔ حواشی بجائے خود کتاب سے کئی گنا زیادہ ہیں، جو بعض اوقات بہت طویل اور کہیں کہیں غیر ضروری نظر آتے ہیں، لیکن تاریخ کے شائق کے لئے وہ بہت کار آمد ہیں۔ فاضل مولف نے اس تذکرے کو نہایت تحقیق، دلی شوق اور کمال محنت سے لکھا ہے۔ صدہا کتابیں کھنگال ڈالی ہیں اور کوئی ماخذ جسے اس موضوع سے بعید تعلق بھی تھا، ان کی نظر سے نہیں بچا۔ قابل مؤلف کی نظر اور معلومات بہت وسیع ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر سچی خوشی ہوئی، اور حقیقت یہ ہے کہ مؤلف نے لکھنے کا حق ادا کردیا ہے۔

کہنے کو تو علامہ میر عبدالجلیل کا تذکرہ ہے لیکن در اصل اس عہد کا تاریخی مرقع ہے - جو لوگ اٹھتے بیٹھتے کتابیں لکھ ڈالتے ہیں اور تحقیق و محنت سے جی چراتے ہیں، اُن کے لئے سبق اور جو اس رستے پر چلنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اعلیٰ نمونہ ہے - ہر لکھنے والے کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بغیر مسلسل محنت اور جانکاہی کے کوئی اچھی چیز پیدا نہیں ہوسکتی —

جن صاحبوں کو ہندوستان کی تاریخ اور حالات سے ذرا بھی لگاؤ ہے وہ اسے ملنا کر ضرور پڑھیں —

یہ معلوم کرکے اور بھی خوشی ہوئی کہ وہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے سوانح و حالات لکھ رہے ہیں - وہ کتاب اس سے بھی زیادہ قابل قدر ہوگی —

اُردو کے جدید رسالے

ادبی دنیا

(ماہانہ - چیف اڈیٹر جناب تاجور نجیب آبادی - اڈیٹر جناب حنیف ہاشمی
لاہور - سالانہ چندہ تین روپے بارہ آنے)

یہ نیا رسالہ بہت آب و تاب کے ساتھ، بہت بڑی تقطیع پر جناب شیخ سر عبدالقادر کی نگرانی میں لاہور سے نکلنا شروع ہوا ہے - سر عبدالقادر کو اردو زبان سے خاص لگاؤ ہے، انہوں نے اردو کی بہت خدمت کی اور کبھی اس سے غافل نہیں رہتے - "ادبی دنیا" کو ان کی سرپرستی مبارک ہو - چیف اڈیٹر جناب تاجور بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں - وہ نئے نئے ڈھنگ سے اردو کی اشاعت اور فروغ کی کوشش کرتے رہتے ہیں - لاہور کی سوسائٹی اور وہاں کے اخباروں اور رسالوں میں ان کا اثر کچھ کم نہیں :

پہلے رسالے میں پہلا مضمون "ادبی دنیا کا مقصد اشاعت" ہے جسے "ایک انقلابی ادبی پروگرام" سے موسوم کیا گیا ہے اس مقصد یا "انقلابی پروگرام" کا خلاصہ یہ ہے —

۱ - "تصنیفی اردو کو عام بناکر اس کے سمجھنے والوں کی تعداد کو بڑھانا" :

۲ - "اردو ادب کو دوسری علمی زبانوں کے خزانوں سے سرمایہ دار بنانا" —

۳ - "اردو انشا پردازی اور شاعری پر آسان زبان میں تنقیدی زبان کے ذریعے نوجوانوں اور طلبہ میں صحیح ذوق ادب پیدا کرنا" —

۴ - "اردو شاعری کو بہت سی غیر قدرتی پابندیوں سے آزاد کرکے آزاد زبانوں کی شاعرانہ خوبیوں کا اس میں اضافہ کرنا" -

(ب) اردو گرامر میں ضروری تغیر و تبدل اور ایسے نئے قواعد کا اضافہ کرنا جن کی موجودگی میں جدید الفاظ، جدید تراکیب اور جدید محاورات صحیح قرار دیے جائیں جو اردو کی شرائین میں خون کی طرح پھیل گئے ہیں" —

(ج) " دوسری زبانوں کے ایسے آسان اور خوشگوار الفاظ اردو میں داخل کرنا جن کے ہم معنی لفظ اردو میں نہیں ہیں یا جن کا مفہوم ہم معنی لفظ کے بدلے میں زیادہ وسیع اور خاص معنی کا حامل ہے" —

اخباری تعلی سے قطع نظر کی جائے تو یہ مقاصد، اگرچہ نئے نہیں مگر بہت معقول اور بہت خوب ہیں - ضرورت صرف عمل کی ہے - اردو اور ہندی پر یہ بجا اعتراض ہے کہ ان کے لکھنے والے زبان مشکل بناتے جاتے ہیں، لیکن اس کی وجہ بالکلیہ یہ نہیں ہے کہ ان کے انشا پرداز خواہ مخواہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر عربی اور سنسکرت کے لفظ اپنی عبارت میں داخل کرتے ہیں بلکہ ایک مجبوری بھی ہے - جدید تعلیم اور جدید علوم کی وجہ سے جو نئے نئے خیالات، نئے نئے اسلوب اور نئے نئے مفہوم پیدا ہو رہے ہیں، ان کے ادا کرنے کے لئے ان زبانوں میں سخت دشواری ہوتی ہے - جو لوگ اس سے بے خبر ہیں، وہ اس دشواری کو نہیں سمجھ سکتے اور جنہیں ان چیزوں سے سابقہ ہے وہ جب خون جگر کھا کر کچھ لکھتے ہیں تو ہمارے شاعر اور انشا پرداز اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں - زبان کی سلاست اور صفائی الفاظ پر نہیں، خیال کی صفائی اور سلاست پر ہے - پھر مضمون طرح طرح کے ہیں، ہر مضمون کے لئے ایک سی زبان استعمال نہیں ہو سکتی - اور پھر اپنی اپنی طبیعت ہے، طرز تحریر کا انحصار ہر شخص کی طبیعت پر ہوتا ہے - علاوہ اس کے مشکل اور آسان اضافی چیزیں ہیں - جو چیز کل آسان تھی آج مشکل ہے، اور آج جسے مشکل کہتے ہیں کل آسان خیال کی جائے گی - نئے نئے خیالات کے ادا کرنے کے لئے جب لفظ نہیں ملتے تو انہیں مجبوراً عربی اور سنسکرت کی طرف ہاتھ بڑھانا پڑتا ہے - باوجود اس کے ہم فاضل اڈیٹر سے بالکل متفق ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو صاف ستھری اور سلیس زبان لکھی جائے - مگر اس کا کیا علاج جب خود اڈیٹر صاحب ایسی زبان لکھتے ہیں جو ان کے بیان کردہ مقصد کے خلاف ہے - دو ایک نمونے ملاحظہ ہوں :

" کیا اس تلاش اور گدا گر مغنی کو بھی جو جو ٹہار نغمہ اندر بھیج رہا تھا ان جذبات کا احساس تھا جو ایک غیر مرئی سامع کے دل میں ماضی کی ایک آواز کی طرح بیدار ہو رہے تھے " —

" اس مرتعش آواز کی المناک یاد تازہ کردی "
" جس سے طبیعت پر ایک سائرفی السلام مغلی کی الجھی ہوئی یا جلون خود فراموشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی " —
" بی - اے میں پنجاب یونیورسٹی کا ریکارڈ بیٹ کیا " - (بیٹ کا لفظ کس قدر مکروہ ہے)

یہی مضامین نگاروں کے مضامین کی حالت ہے ۔ حالانکہ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر وہ مناسب اصلاح کر سکتے ہیں تا کہ کم سے کم مطلب تو سمجھ میں آ جائے یا بے رابطی قائم نہ رہے ۔ مثلاً ملاحظہ فرمایئے :

" مادام رولاں کی شہرت کا سکہ جمنے سے پہلے ہی اس نو عمر لڑکی پر بہت سے نوجوانوں کی نگاہیں اٹھ رہی تھیں " (یہاں مادام رولاں اور نو عمر لڑکی دو الگ معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں ایک ہیں)
" اس سے اس کی انقلابی روح کا معیار معلوم ہوتا ہے "
" وہ اپنی غیر سلاست زبان اور قادر الکلامی سے اعصاب کی آخری مد ہوشی کو بھی بیان کر جاتا ہے "
" آہ ! خوفناک شعور کے طویل وقفوں کے ساتھ میں نے شراب پی "
" اس کا انجام کارکنان قضا و قدر کے ہاتھوں حسرت پرستوں کا انتہائے تمسخر معلوم ہوتا ہے " ۔

یہ چند جملے اعتراض کی نظر سے نہیں لکھے گئے ، بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس اصول پر عمل کس قدر دشوار ہے ۔ شاید اسی خیال سے اڈیٹر صاحب ہر پرچے کے آخر میں مشکل الفاظ کا فرہنگ بھی لکھ دیتے ہیں ، لیکن اس سے کچھ کام نہیں نکلتا —

سب سے مشکل آخری مقصد ہے ۔ اب تک جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں ان میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس میں اس مقصد کی تکمیل میں کوشش کی گئی ہو ۔ البتہ مختلف زبانوں کے نظم و نثر کے ترجمے ضرور پیش کئے گئے ہیں لیکن وہ ایسے نہیں جن کی ہمیں ضرورت ہے —

باوجود ان تمام باتوں کے اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ ' ادبی دنیا ' اردو رسالوں میں خاص وقعت رکھتا ہے ۔ اس نے غور و فکر اور دلچسپی کا بہت اچھا سامان بہم پہنچایا ہے اور اچھی اچھی تصویروں سے رسالے کی دلکشی میں اضافہ کیا ہے ۔ ہماری رائے میں وہ مضمون اور نیرنگ خیال کے بھی بعض ہے ۔ اس نے جن مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے وہ بہت قابل قدر ہیں اور ہماری دلی

تمنا ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہو —

پیام تعلیم

(جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دھلی کا پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ ۔
سالانہ چندہ دو روپے)

یہ رسالہ حقیقی طور پر تعلیم کا پیام ہے ۔ بہت سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے ۔ ھندوستان کے تعلیمی حالات اور عام تعلیم پر بہت اچھے اچھے مضمون ہوتے ھیں بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے مضمون اور قصے کہانیاں الگ ھوتی ھیں ۔ طالب علموں ' بچوں اور بڑوں سب کے لئے بہت ھی اچھا پرچہ ہے ۔ اس کے پڑھنے کے بعد یہ معلوم ھوتا ہے کہ ھم نے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کیا ہے اور یہ بڑی بات ہے — چندہ بھی بہت کم ہے —

مبصر

(ماھانہ ' لکھنؤ ۔ مدیر : جناب ابوالعلاء ناطق '
معاون : جناب حکیم آشفتہ۔ چندہ سالانہ چار روپے)

انکشاف

(ماھانہ لکھنؤ۔ اڈیٹر جناب سید محمد نسیم ' چندہ سالانہ دو روپے)

خضر راہ

(ماھانہ لکھنؤ ۔ اڈیٹر جناب حامد علی ' چندہ سالانہ چار روپے)

یہ تینوں رسالے لکھنؤ سے شائع ھوتے ھیں ۔ خوشی کی بات ہے کہ لکھنؤ میں اس قسم کا علمی ذوق پیدا ھوتا جاتا ہے ۔ ان سب میں ' مصبر ' کا پایہ بلند ہے ۔ علمی اور ادبی مضامین بہت اچھے ھیں ۔ نظم اور افسانے کا بھی کافی حصہ ھوتا ہے اور رسالے کو ترقی دینے کی ھر طرح کوشش کی جاتی ہے —

رسالۂ انکشاف لکھنؤ کے محکمۂ عالیہ اسلامیہ ایک آنہ فنڈ کی جانب سے شائع ہوتا ہے اور اس کی آمدنی مساجد کی مرمت اور مدارس کی ترقی میں صرف کی جاتی ہے۔ یہ مقصد بہت مستحسن ہے۔ لیکن سوال اس میں ہے کہ آیا یہ رسالہ محکمۂ عالیہ کے لئے آمدنی کا باعث ہوسکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بجائے فائدے کے نقصان ہو۔ ادبی اور تاریخی مضامین کے ساتھ مذہبی مضامین بھی درج ہوتے ہیں۔ اگرچہ تفسیر کلام پاک اور باب الفتاوی کے ساتھ پیکر عصمت، معصوم عورت اور فریب نظر جیسے ڈرامے اور افسانے اور معمولی غزلیں کچھ بے جوڑ سے معلوم ہوتے ہیں تصویروں کا بھی اہتمام کیا گیا ہے —

خضر راہ بھی اردو کے عام رسالوں کی طرح اردو ادب کی ترقی کا کوشاں ہے۔ اس میں بھی دوسرے رسالوں کی طرح نظم و نثر دونوں ہوتی ہیں۔ کوئی خاص بات ایسی نہیں جو امتیازی ہو۔

کامیابی

(حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ کا ماہانہ رسالہ
اڈیٹر ڈاکٹر احمدسعید صاحب بریلوی سالانہ قیمت دو روپے دہلی)

حال ہی میں ایک لمیٹڈ کمپنی "حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی" کے نام سے دہلی میں قائم ہوئی ہے جس کا مقصد اردو کتب کی اشاعت، نئی کتابوں کی تالیف ہے۔ یہ خیال بھی خواجہ صاحب کے دماغ کی اپج ہے۔ بہت اچھی سوجھی ہے، اگر اس کا انتظام اچھے ہاتوں رہا اور کام قاعدے اور اصول سے ہوا تو اسے بہت بڑی کامیابی سمجھنا چاہئے۔ یہ رسالہ اس کمپنی ہی کا ہے جو اس کے مقاصد کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بہت اچھے اچھے مضامین شائع کرتا رہتا ہے۔ رسالے کا مقصد "مسلمانوں کی علمی، ایجادی اور اجتہادی قوتوں کو بیدار کرنا اور ان کو ترقی و کامیابی کا بہترین طریقہ بتانا" قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ رسالہ ان مقاصد کو ابھی کماحقہ انجام دینے سے قاصر ہے، لیکن بہت سی دلچسپیوں کا مجموعہ ہے اور عمدہ مضامین کے ساتھ معمولی چیزیں اور ظرافت کے ساتھ ہی بھی اور متانت کے ساتھ ظرافت اور چھوٹی بڑی معلومات سب کو اس طرح سمو دیا ہے کہ پڑھنے والے کو شکایت نہیں ہو سکتی۔ اس قدر ساز و سامان کے ساتھ سالانہ چندہ بہت ہی کم ہے —

امداد باہمی

(ماہانہ ' قادیان - اڈیٹر شیخ محمود احمد عرفانی صاحب '
سالانہ قیمت چھہ روپے)

امداد باہمی بہت مبارک تحریک ہے اور ہندوستان میں اب اس کے فوائد ظاہر ہوتے جاتے ہیں - اس رسالے کا مقصد یہی تحریک ہے - اس میں مختلف انجمنوں کے حالات ' زراعت وغیرہ کے متعلق مفید معلومات ہوتے ہیں - رسالہ اپنے مقاصد کو خوبی سے انجام دیتا ہے اور جو لوگ اس تحریک کے قدر داں اور حامی ہیں وہ اس کی ضرور قدر کریں گے —

ایجوکیشنل گزٹ

ماہانہ - جالندھر - اڈیٹر - شیخ محمدجان صاحب بی - اے '
بی ٹی ؛ لالہ دینا ناتھہ دو ساج بی - اے ' بی ٹی ؛
سردار وطن سنگھہ بی - اے ' بی ٹی ؛ سید محسن ترمذی
منشی فاضل و ادیب فاضل - سالانہ چندہ تین روپے)

مقصد رسالے کے نام سے ظاہر ہے - اگرچہ یہ رسالہ دو تین سال سے جاری ہے لیکن اب خاص اہتمام کیا گیا ہے اور اس کے حجم اور مضامین میں بہت ترقی نظر آتی ہے - تعلمی مضامین خاص طور پر بہت مفید ہیں اور غور و فکر سے لکھے جاتے ہیں - علاوہ تعلمی مضامین کے ادبی ' معاشرتی تاریخی اور زرعی مضامین بھی درج ہوتے ہیں - تمام مضامین کا معیار مقاصد کے لحاظ سے بہت اچھا ہے - اور رسالہ بہت مفید اور کارآمد ہے - تعلیمی رسالے اس حیثیت اور نوعیت کے بہت کم دیکھنے میں آے ہیں - رسالے کے آخر میں ایک ضمیمہ "رہنماے اطفال" کے نام سے شامل ہے جو جلی خط میں ہے اور اس میں بچوں کے لئے بہت سی مفید معلومات اور چھوٹے چھوٹے مضمون آسان' نظمیں اور اُن کے کام کی باتیں ہوتی ہیں —

رسالۂ کمیکل سوسائٹی

(مسلم یونیورسٹی علی گڈھ - اڈیٹر جناب محمد لطیف قریشی بی - ایس سی - اسسٹنٹ اڈیٹر ذوالفقار الحسنین صاحب - سہ ماہی - سالانہ چندہ دو روپے)—

یہ رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی جانب سے شائع ہوا ہے - یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی اسی زمانے میں علمی تحقیق اور علمی کاموں کی طرف متوجہ ہے - یہ رسالہ دو حصوں پر مشتمل ہے - ایک حصے میں اردو مضامین ہیں اور دوسرے میں انگریزی - اُردو انگریزی کا میل علی گڈھ کالج میں ابتدا سے چلا آرہا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ شان اب تک قائم ہے - مضامین ایسے ہیں جسے ہر لکھا پڑھا شخص شوق سے پڑھ سکتا ہے اور کچھہ نئی معلومات حاصل کر سکتا ہے - حتی الامکان دقیق اصطلاحات کے استعمال سے احتراز کیا گیا ہے اور مطالب کو صاف اور سہل طریقے سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے - یہ دیکھہ کر خوشی ہوتی ہے کہ انجمن ترقی اُردو اور جامعۂ عثمانیہ کی وضع کردہ اصطلاحات نے ملک میں قبولیت حاصل کرلی ہے- چنانچہ اس رسالےمیں بھی جگہ جگہ ان اصطلاحات سے کام لیا گیا ہے- رسالہ بلا شبہ ملک کے لئے مفید ہے اور اس کے ذریعے سے اس علم کے سمجھنے میں عام طور پر سہولت ہوگی - علم کیمیا پر دنیا کی آیندہ ترقی کا بہت کچھہ انحصار ہے اور اسے مقبول بنانا ایک ملکی خدمت ہے —

مسیحاے زماں

(ماہانہ - تجارہ ' الور - مدیر قاضی حکیم سید محمد کرم حسین صاحب - قیمت سالانہ دو روپے) مقام تجارہ (ریاست الور) راجپوتانے کا یہ پہلا ماہوار علمی و ادبی و طبی رسالہ ہے - اس میں ایک آدھ مضمون تجارت پر ہے اور چند مضامین طبی ہیں - کچھہ مجرب نسخے بھی درج ہیں - نوجوانوں کی غلط کاریوں کے متعلق بھی معلومات ہیں اور سب سے زیادہ دواؤں کے اشتہارات ہیں - شاید یہی اس رسالے کی غرض اشاعت ہو —

چمنستان شعرا

ایک قدیم و نایاب اردو زبان کے شاعروں کا تذکرہ ہے، جو انجمن ترقی اردو نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے، اور اس کی تصحیح و ترتیب میں نہایت محنت و کوشش سے کام لیکر ایک دل چسپ و محققانہ مقدمے کے ساتھ چھاپا ہے ۔ تذکرے کے مؤلف (دکن) کے مشہور مورخ و تذکرہ نویس لالہ لچھمی نرائن، شفیق و صاحب، ہیں ۔ سنہ ۱۱۷۴ ھ میں یہ تذکرہ تالیف ہوا، اور دنیا میں اس کا صرف ایک نسخہ ہی پایا جاتا تھا ۔ عالی جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے ۔ سکریٹری انجمن ترقی اردو کا مقدمہ بھی قابل دید ہے ۔ حجم تقریباً ۴۰۰ صفحے ۔ جلد نہایت اعلی قسم کی قیمت مجلد پانچ روپے آٹھ آنے سکۂ انگریزی غیر مجلد چار روپے بارہ آنے سکۂ انگریزی —

اردو

جلد ۹ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ ع حصہ ۳۶

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

سائنس

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہونگے، ان کو کسی قدر تفصل سے بیان کیا جائے - ان تمام مسائل کو حتی‌الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی - اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے سائنس دانوں کے علاوہ یورپ کے فضلا نے بھی اس رسالے میں مضمون لکھنا منظور فرمایا ہے - اس رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوا کریں گے —

سالانہ چندہ آٹھ روپے سکۂ انگریزی (نو روپیہ چار آنے سکۂ عثمانیہ) —

امید ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

فہرستِ مضامین

دور تراجم

از

(جناب حاجی احمد فخری صاحب)

ہمارا زمانہ تعلیم و تربیت کا زمانہ ہے ' ہمارا زمانہ تہذیب و تمدن کا زمانہ ہے ' ہمارے زمانے میں علوم و فنون کی کثرت ہے ' ہمارے زمانے میں اختراعات و ایجادات کی بھر مار ہے ۔ آج کل تصنیفات و تالیفات کا بازار گرم ہے ۔ ان دنوں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کے آثار نمودار ہیں ۔ مگر اس دور میں جو شے اوروں سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ترجمہ ہے ۔ اس لئے اگر اس دور کو ' دور تراجم ' کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اس زمانے کی تصنیف اور تالیف جو کچھ ہے وہ ترجمے کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے ―

اس امتیاز کی سب سے بڑی وجہ سلطان العلوم اعلیٰ حضرت شہنشاہ دکن کی علم پروری اور اردو نوازی ہے ۔ آپ کی شاہانہ فیاضیوں اور علمی قدر دانی نے ہندوستان میں اردو یونیورسٹی قائم کر کے کم مایہ اور نو عمر اردو کا پایہ عرش اعلیٰ تک بلند کر دیا ہے ۔ اگر چندے یہی لیل و نہار رہے تو وہ وقت دور نہیں کہ یہی سبک مایہ اور نو خیز زبان " السنۂ عالم " کے دوش بدوش نظر آئیگی ۔ جن لوگوں کو حضرت مولانا مولوی سید وحیدالدین سلیم (مرحوم) پروفیسر جامعۂ عثمانیہ کی زندۂ جاوید تصنیف وضع اصطلاحات کے مطالعے کا موقع ملا ہے

وہ جانتے ہیں کہ اردو کی کیا شان ہے اور اس میں ترقی کر نے اور علمی زبان بننے کی کس قدر صلاحیت مضمر ہے —

یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ جب کوئی قوم علوم و فنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہے - اور زندہ اقوام کی سعی و کوشش کے نتائج کو اپنے اندر جذب کر کے اپنے علمی خزانوں کو معمور کرتی ہے - چنانچہ قدماے عرب نے اپنی ترقی کے زمانے میں یہی کیا کہ دوسری اقوام کے علمی خزانوں کو اپنی زبان میں منتقل کر لیا اور ان کے جواہر ریزوں کو اپنی زبان کے نقش و نگار میں برتا — یہی باعث ہے کہ علوم قدیمہ میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جس سے عربی کا خزانہ خالی ہو - اگر دنیامیں عربوں کا وجود نہ ہوتاتوصدیوں تک اقصاے عالم پر جہل و نادانی کابادل اور اسی طرح محیط رہتا جس طرح عروج اسلام سے قبل تھا - اگر ایک ابن رشد کی ذات عالم وجود میں جلوہ گر نہ ہوتی تو ارسطو اور اس کا فلسفہ دونوں کے دونوں صفحۂ ہستی سے اس طرح معدوم ہو جاتے کہ گویا کبھی عالم وجود میں آے ہی نہ تھے —

جب یہ مرحلہ خاطر خواہ طے ہو چکتا ہے تو قوم ترقی کے میدان میں دوسرا قدم اٹھاتی ہے اور تصنیف و تالیف کا جامہ پہن کر زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں نظر آنے لگتی ہے - نہ آج تک کبھی اس کے خلاف ہوا ہے اور نہ توقع ہےکہ اس کے خلاف کبھی ہوگا - یہی باعث ہےکہ فرماں رواےدکن کی شاہانہ اولوالعزمیوں کے طفیل ہندوستان کے بہترین دل و دماغ اپنی تمام تر توجہ اسی مفید اور کار آمد صنف کی طرف مبذول فرما رہے ہیں - اندریں حالات یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترجمے کے مالہ و ماعلیہ پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ ترجمہ کیا ہے اور وہ اصول کیا ہیں جن کی پابندی سے ترجمہ ترجمہ کہلا نے کا مستحق ہو تا ہے اور جس کی خلاف ورزی سے ترجمہ اپنے مرتبے سے گر جا تا ہے اور اس قابل نہیں رہتا

کہ اس پر ترجمے کا اطلاق ہو سکے - آخر کچھ تو بات ہے کہ ' معرکۂ مذہب و سائنس' اور ' فلسفۂ تعلیم ' معمولی تراجم سے ممتاز ہیں —

ترجمے کی تعریف

ہمارے نزدیک ترجمے کی تعریف یہ ہے کہ کسی مصنف کے خیالات کو لیا جاے ' ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جاے' ان کو اپنے الفاظ و محاورات کے سانچے میں ڈھالا جاے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جاے کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق معلوم نہ ہو —

اس تعریف کی رو سے یہ امر بلا شائبۂ شک ثابت ہوتا ہے کہ ترجمے میں مترجم پر مصنف کے خیالات کی پابندی فرض ہوتی ہے' اس کے الفاظ و محاورات اور اس کے اسلوب بیان کی تقلید فرض نہیں ہوتی - اگر ان باتوں کی پابندی ضروری ہوتی تو اصل زبان میں کیا برائی تھی کہ زحمت ترجمہ گوارا فرمائی جاتی - اگر اس قسم کی لغو اور لایعنی پابندیاں کہیں نبھ جائیں اور کوئی باکمال مترجم ان بے کار اور غیر ضروری بندشوں سے عہدہ برآ ہو بھی جاے تو اس کو محض اتفاق حسنہ پر محمول کرنا چاہئے اس کو شمع ہدایت سمجھنا اور اس پر فخر کرنا جائز نہیں' اس لئے کہ بسااوقات دو زبانوں کے انداز بیان میں اس قدر مغائرت ہوتی ہے کہ تقلید نا ممکن ہوتی ہے - اگر کوئی خام مذاق اور نومشق مترجم تقلید کے پیچھے پڑتا ہے تو وہ غیر زبان کے الفاظ و محاورات کی بندشوں میں خود گم ہو کر رہ جاتا ہے - پڑھنے والوں پر یہ بھی نہیں کھلتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے - اور کس لئے کہہ رہا ہے - مصنف کا مطلب کچھ ہوتا ہے ' مترجم کے الفاظ سے کچھ اور معلوم ہوتا ہے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تقلید کی بدولت ترجمہ ترجمہ نہیں رہتا بلکہ لفظوں کا گورکھ دھندا بن جاتا ہے - ہمارے نزدیک ترجمے کا اصل اصول وہی بدنام اور مکروہ شے ہے' جسے عرف عام میں تصرف اور پروفیسر حمیداللہ خاں صاحب کی زبان میں خیانت اور بددیانتی کہتے ہیں تصرف کے بغیر ترجمے میں نہ کبھی کام چلا ہے اور نہ آئندہ چلنے کی امید ہے - اس باب میں

جس قدر آزادی سے کام لیا جائے گا ترجمہ اسی قدر تصنیف کے قریب آ جائے گا - مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ترجمے میں تصرف کرنا کچھ اُن ہی بزرگوں کو زیبا ہے جو دونوں زبانوں کے ماہر ہوتے ہیں اور اُس علم میں ید طولیٰ رکھتے ہیں جس کا ترجمہ کرنے کی وہ جسارت فرماتے ہیں؛ بلکہ دونوں زبانوں میں سے ایک زبان مترجم کی مادری زبان ہوتی ہے. آج کل جن دو زبانوں کی ضرورت ہے ان میں سے ایک انگریزی ہے اور دوسری اردو - ایک قدیم اور سرمایہ دار زبان ہے اور دوسری نوعمر اور کم مایہ - ایسی حالت میں مترجم کا فرض ہے کہ انگریزی سے کماحقہ واقف ہو اور اردو اس کی مادری زبان ہو - اگر اردو اس کی مادری زبان نہ ہوگی تو وہ ترجمے کی بندشوں سے عہدہ برآ نہ ہوسکے گا اور اگر انگریزی سے پوری طرح واقف نہ ہوگا تو مصنف کے خیالات کی تہ تک نہ پہنچ سکے گا - الغرض ان اوصاف سہ گانہ میں جس نسبت سے کمی ہوگی، ترجمے میں اسی نسبت سے خامیاں رہ جائیں گی—

زباندانی کا معیار

اب بحث طلب امر یہ ہے کہ زباندانی کا معیار کیا ہے اور وہ کونسی کسوٹی ہے جس پر کس کر یہ بتایا جاسکتا ہے کہ کون شخص زباندان ہے اور کون نہیں اور کس کے مضمون میں کس قدر الفاظ و محاورات ہیں کہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں اور کس قدر ہیں کہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں - شمالی ہندوستان اور قلمرو نظام میں ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو اُردو دانی کا مدعی نہ ہو اور جسے اس امر کا دعویٰ نہ ہو کہ اردو میری مادری زبان ہے اور میں نے اس کو اُس عالم میں حاصل کیا ہے جب میں میں نہ تھا دلی اور لکھنؤ کے رہنے والے تو خالص اہل زبان ہیں، اُن کا تو کیا کہنا، ان کے لئے تو یہ امر باعث ننگ و عار ہے کہ اُن کا دامن ادب شرمندۂ تعلیم ہو مگر:

جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے   ہر ہاتھ کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

روزانہ بول چال میں اپنا مافی‌الضمیر ادا کر دینا اور معمولی چٹھی چپاتی لکھ لینا اور بات ہے اور ادیبانہ انداز سے اپنا مطلب بیان کرنا اور اس میں کشش وگیرائی پیدا کر کے ناظرین کے دلوں پر اثر کرنا اور بات ہے - اس باب میں اہل زبان اور بیگانۂ زبان و لسان ' نیم تعلیم یافتہ اور فارغ‌التحصیل ' سب برابر ہیں؛ جب تک کوئی شخص متواتر اور پے در پے زبان کی نزاکتوں پر غور نہیں کرتا اور جب تک اپنے خیالات مختلف اور گونا گوں انداز سے پبلک کے سامنے پیش کرنے کی مشق و مزا ولت بہم نہیں پہنچاتا اس وقت تک وہ ترجمے اور تصنیف و تالیف کی ذمہ داریوں سے سبک دوش نہیں ہو سکتا ' لیکن دلّی اور لکھنؤ والے اس میں جس قدر جلد اور جس قدر آسانی سے کمال پیدا کر سکتے ہیں اس قدر جلد اور آسانی سے غیر نہیں کرسکتے ؛ خواہ وہ پنجاب کے رہنے والے ہوں یا دکن کے ' خواہ وہ دلی اور لکھنو میں سے کسی کی تقلید کو ضروری سمجھتے ہوں یا دونوں سے آزاد ہونا اپنی شان کے شایاں خیال کرتے ہوں —

اس زمانے میں یہ بات عام طور پر دیکھی جاتی ہے کہ لوگ انگریزی میں فی‌الجملہ بصیرت حاصل کر لیتے ہیں اور اس کے پروں پر اُڑ کر مملکت اردو کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں - ان کے دل و دماغ پر اس خیال خام کا غلبہ ہوتا ہے کہ اردو ہماری مادری زبان ہے ' اس میں کد و کاوش لا حاصل ہے ' اِس میں سعی و کوشش ہماری شان کے شایاں اور ہماری ہمت کے لائق نہیں - اس طرف صرف وہی کوتاہ‌بیں اور نا عاقبت اندیش لوگ توجہ کرتے ہیں جن کے دماغ عقل سلیم سے عاری ہوتے ہیں - اردو انگریزی کے تابع ہے ' جب انگریزی آ گئی تو اردو خود بخود آ جائے گی - " بانو کو تسخیر کر لو باندی خود بخود حاضر ہو جاے گی " - مگر یہ اُن حضرات کی کوتاہ نظری اور خام مذاقی کی دلیل ہے - اردو کتنی ہی سبک مایہ اور نو عمر سہی ' مگر زندہ زبان ہے ' اس کا وجود انگریزی پر مبنی نہیں - صرف چند بڑے بڑے اصول ہیں کہ انگریزی

سے ملتے جلتے ھیں، ورنہ دونوں میں کوئی تعلق نہیں - جب تک اردو پر اردو کی حیثیت سے توجہ نہیں کی جاتی، اس وقت تک اردو میں بصیرت نصیب نہیں ہوتی- کسی موضوع کو لینا اور اس کو موثر اور دلکش انداز سے پڑھنے والوں کے دلوں پر نقش کرنا، ایک فن ھے جو مدتوں کی کد و کاوش اور سالہا سال کی سعی و کوشش سے حاصل ہوتا ھے اور جس شے کا نام ادبی سادگی ھے وہ تو ایک ایسا کمال ھے جو تمام کمالات ادب کے بعد نصیب ہوتا ھے - یہی باعث ھے کہ میرانیس جیسے قادر الکلام بزرگ کو کہنا پڑا ھے کہ:

اس سادگی کی قدر کوئی جانتا نہیں　　جو جانتا ھے اور کو وہ مانتا نہیں

ہمارے نزدیک مترجم اور مصنف میں کچھ فرق نہیں، دونوں کی حدیں ایک مقام پر جا ملتی ھیں - کامیاب اور قابل تقلید مترجم وہی شخص ہوسکتا ھے جس میں مصنف بننے اور تصنیف کرنے کی صلاحیت مضمر ہوتی ھے اور ترجمے کی گونا گوں ذمہ داریوں سے وہی شخص عہدہ برا ہو سکتا ھے، جس نے انداز بیان پر اس درجے قدرت حاصل کرلی ہو کہ جس مطلب کو جس پہلو سے چاھے ادا کر جائے - بہترین مترجم وہی بزرگ ثابت ہوئے ھیں جن میں یہ قوت بوجہ اتم موجود تھی، لیکن جن لوگوں میں یہ قوت کم تھی وہ کامیابی اور شہرت کے میدان میں اسی قدر پیچھے رہ گئے جس قدر اس قوت میں کمی تھی - جو لوگ مصنف کے انداز بیان کی تقلید سے انحراف کرنے اور ترجمے میں تصرف سے کام لینے کی قوت نہیں رکھتے اُن کی ادبی زندگی محض عارضی اور چند روزہ ہوتی ھے، بلکہ مرنے سے پہلے ھی ان کا خاتمہ ہو جاتا ھے - حیات ابدی اور شہرت سرمدی کچھ ان ھی بزرگوں کا حصہ ھے جو منظر عام پر جلوہ گر ہونے سے پہلے کمالات صوری و معنوی سے بہرہ اندوز ہوتے ھیں اور شب و روز کی متواتر اور جانکاہ محنت سے اپنے اندر وہ قابلیت پیدا کر لیتے ھیں جو ادائے فرض کے لئے ضروری اور لا بدی ہوتی ھے —

مثال کے طور پر مرزا غالب کو لیجئے اور ان کے ایک شعر پر غور کیجئے۔ فرماتے ھیں :

محرم نہیں ہے تو ھی نواھاے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

کیا کوئی شخص اس غیر فانی شعر پر ترجمے کا الزام عائد کر سکتا ہے ' کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے ' کیا اس میں وہ تمام خوبیاں موجود نہیں ھیں جو اعلیٰ درجے کے شعر میں ھونی چاھئیں ' کیا اس میں وہ تمام اوصاف و صفات موجود نہیں ھیں جوشعر کی جان اور ادب کی روح رواں ھیں ؟ اب ذرا 'عرفی' شیرازی کا شعرملاحظہ ھو :

هر کس نه شناسندۀ راز است وگرنه
اینها همه راز ست که معلوم عوام است

کیا مرزا کا شعر عرفی کے شعر پر مبنی نہیں ہے ' کیا مرزا نے اس سے اِستفادہ نہیں کیا ھے ' کیا مرزا نے اس شعر کی روح کو اپنے الفاظ میں جلوہ گر نہیں کیا ھے' اور کیا اپنی طرف سے اس پر ایک گونہ لطیف اور پاکیزہ اضافہ نہیں فرمایا ھے ۔ اور کیا اپنے انداز خاص میں کد و کاوش اور مذاق سلیم کی داد نہیں دی ھے' کیا اس میں اور تصنیف میں کچھہ فرق ھے' کیا اس میں وہ تمام باتیں موجود نہیں ھیں جو تصنیف کے لئے لازمی ھیں اور کیا مرزا اس میں حق بہ جانب نہ تھے ' کیا اس پر سرقے کا الزام اور چوری کا بہتان عائد ھو سکتا ھے ؟ ھمارے نزدیک اس قسم کے باریک اور لطیف اضافوں پر سرقے کا الزام لگانا اور ان کو خیانت اور بد دیانتی پر محمول کرنا ذوق سلیم کا منہ چڑانا ھے ۔ اور یہ صرف ان ھی لوگوں کا حصہ ہے جو انگریزی کے پروں پر اُڑ کر قلم رو اردو کو عبور کرنا چاھتے ھیں ۔ اس امر سے کوئی صاحب ذوق انکار نہیں کر سکتا کہ اسی قسم کے نازک اور لطیف اضافے کا نام ' تصرف ' ھے اور یہی ترجمے کی جان اور ادب و انشا کی روح و رواں ھے ۔ ھمارے نزدیک ترجمے کی بہترین مثال یہی ھے اور اسی کی تقلید ھونی چاھئے —

اسی طرح شیخ علی حزیں ' کا ایک شعر ملاحظہ ہو - فرماتے ہیں :

چون نفی نفی اثبات است' از مردن نمی ترسم
بقاے من' چو شمع کشتہ باشد د رفنائے من

میر 'انیس' اس کو لیتے ہیں اور اپنے انداز میں یوں ادا کرتے ہیں :

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمع کشتہ ہوں' فنا میں ہے بقا میرے لئے

کیا میر صاحب کا یہ شعر شیخ کے شعر کا ترجمہ نہیں ہے ' کیا میر صاحب نے اپنے شعر کی بنیاد اسی شعر پر نہیں رکھی ہے اور کیا اس میں اپنی غیر معمولی شاعرانہ قابلیت سے تصرف نہیں فرمایا ہے ؟ اگر میر صاحب زحمت تصرف گوارا نہ فرماتے تو یہ شعر اس بلندی پر جلوہ گر نہ ہوتا ' جس پر اس وقت میر صاحب کے ذوق لطیف کے طفیل نظر آ رہا ہے -

ملّا طاہر وحید کا ایک شعر ہے :

ز شیخ شہر جاں بردم بہ تز و یر مسلمانی
مدار اگر بہ ایں کافر نمی کردم چہ می کردم؟

ایک شخص نے اس کو لیا اور ان الفاظ میں اس کا ترجمہ کر دیا :

مسلماں بن کے جاں میں نے بچائی شیخ نجدی سے
مدارا گر نہ اس کافر سے میں کرتا تو کیا کرتا؟

کیا یہ شعر ملا کے شعر کا صحیح ترجمہ نہیں ہے ' کیا اس میں کہیں کور کسر ہے ' کیا مترجم نے اس میں تصرف سے کام نہیں لیا ' کیا شیخ شہر کی جگہ شیخ 'نجدی' نہیں کردیا ہے اور "بہ تز ویر مسلمانی کا ترجمہ " مسلماں بن کے" نہیں کیا ' کیا اس سے بہتر انداز میسر ہو سکتا ہے ؟ یہ سب کچھ ہے ' مگر ارباب ذوق جانتے ہیں کہ یہ شعر اس قدر بلند نہیں ہے جس قدر ملا کا شعر ہے - اس لئے کہ تصرف کچھ زیادہ باریک اور لطیف نہیں ہے اور مترجم اپنی طرف سے کوئی

ایسا اضافہ نہیں کر سکا جس سے تصرت کرنے میں حق بہ جانب سمجھا جاے۔
' عرفی شیرازی ' کا ایک اور شعر ہے :

مدہ عنان تعلق بہ حسن ہر ذرہ   بر آر دستے و بر فرق آفتاب انداز

اس کا ترجمہ جناب ' آزاد ' انصاری ان الفاظ میں فرماتے ہیں :

ذرات کی چمک پر کب تک مٹا رہے گا
اٹھ اور اٹھ کے اک دم ہاتھ آفتاب پر ڈال

کیا اس میں جناب ' آزاد ' ترجمے کے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے ' کیا اس میں تصرت کا عمل جلوہ گر نہیں ہے' کیا جناب 'آزاد' پر خیانت اور بد دیانتی کا الزام لگایا جائیگا ؟ اس لئے کہ ' عرفی' کے شعر میں کہیں اٹھنے کا ذکر نہیں ہے —

اسی طرح حزیں کا شعر ہے :

مسی مالیدہ لب را رنگ پان است
تماشا کن تہ آتش دخان است

'سودا' نے اس کو لیا اور ان الفاظ میں ادا کر دیا :

مسی مالیدہ لب پر رنگ پان ہے
تماشا ہے تہ آتش دھوان ہے

اس میں ' سودا' نے کسی قسم کا تصرت نہیں کیا' اسی لئے اصل شعر میں کسی قسم کا اضافہ نہ کر سکا ' بلکہ شعر کو اُس بلندی پر نہ پہنچا سکا' جہاں حزیں نے اپنے شعر کو پہنچا دیا تھا —

قرآن مجید میں ایک آیت ہے - انا عرضنا الامانۃ الخ - خواجہ حافظ اس کو لیتے ہیں اور اپنے ناقابل تقلید انداز میں یوں ادا کرتے ہیں :

آسمان بار امانت نہ توانست کشید   قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

حقیقت میں ترجمہ اسے کہتے ہیں اور تصرت کی یہ شان ہے —

اسی طرح مندرجۂ ذیل اشعار و اقوال کو لیجئے اور فرداً فرداً ہر ایک پر غور

کیجئے اور یہ دیکھئے کہ ان میں کوئی شعر یا کوئی قول ایسا ہے جو تصرف کی دست برد سے محفوظ ہو:

بوے یار من ازیں سست وفا می آید   گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم
(نظیری نیشا پوری)

کیفیت چشم' اس کی مجھے یاد ہے سودا   ' ساغر' کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
(سودا)

در محفل خود راہ مدہ ہم چو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را
نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جاے
دوستو! درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو (خواجہ میر درد)
دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بہ تو دادم
باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی (سعدی)
پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
انسے بھی تو پوچھئے تم ایسے کیوں پیارے ہوے (میر تقی میر)
گفتہ بودم غم دل باتو بگویم چو بیائی
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی (سعدی)
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے (مرزا غالب)
داماں نگہ تنگ' گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد
مرے ذوق نظر کو دیکھنا بزم حسیناں میں
وہ گلچیں ہوں بہاے گل بھرو نگار تنگ داماں میں (وفا رام پوری)

عربی اقوال و ضرب الامثال: " الکلب انجس مایکون اذا اغتسل "

سگ بدریاے هفت گانه بشو   چونکه تر شد پلید تر گردد (سعدی)

الصمت زینة العالم و ستر الجاهل :

ترا ' خامشی ' اے خداوند هوش   وقار است ' و نا اهل را پردہ پوش (سعدی)

راع اباک یراع ابنک :

تو بجاے پدر چه کردی خیر   تا همان چشم داری از پسرت (سعدی)

کُل یوم هو فی شان :

دل بھی تیرے هی ڈھنگ سیکھا ہے   آن میں کچھہ ہے آن میں کچھہ ہے (درد)

سناء ذکاء لا یزال من دعاء الخفاش :

شپر گر نور آفتاب نه خواهد   نور بازار آفتاب نه کاهد (سعدی)

السعید من اکل وارع و الشقی من مات ودم :

نیک بخت آنکه خورد و کشت و بد بخت آنکه مرد و هشت   (سعدی)

السطان احوج الی العقلاء من العقلاء الی السطان :

پادشاهاں به خرد مندان محتاج تراند که خرد مندان به پادشاهاں

یہاں تک جو کچھہ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق اس ترجمے سے ہے جو عربی اور فارسی سے اردو میں کیا گیا ہے' اس کے بعد اس ترجمے کا نمبر ہے جو عربی اور فارسی سے انگریزی میں کیا گیا ہے - اگر اس پر ایک سر سری نظر ڈالی جاے تو یہ مضمون بجاے خود ایک مستقل کتاب بن جاے- اس لئے محض چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں اور یہ دکھایا جاتا ہے کہ انگریزی میں مترجم حضرات ترجمے کے باب میں کس قدر آزادی سے کام لیتے ہیں اور اس کو کہاں سے کہاں پہنچادیتے ہیں - مثالیں ملاحظہ ہوں :

(۱) ملم هر سخن را بیان معانی   ملم جان و عقل هنر را قوالب

منم از نژاد بزرگان ساماں که بودند شاهان چترو کواکب (منوچهری)

I can explain the deepest thought in all sciences,

I am the heart and soul of reason and knowledge.

I am descended from the Imperial House of Saman,

Whose kings bore the power of sovereignty.

(۲) آب جیحون از نشاط روے دوست . خنگ مارا تا میان آیدهمی (رودکی)

Glad at the friend's return, the Oxus deep,

Up to our girths in laughing waves shall leap.

(۳) اگر شه روز را گوید شب است این - بباید گفت اینک ماه و پروین

Should he (the king) say "the night is day"

Reply: Behold the moon and the pleides.

(۴) . در شعر سه‌تن پیمبرانند هر چند که لانبی بعدی

ابیات و قصیده وغزل را فردوسی و انوری و سعدی

The sphere, poetic has its prophets three

(Although there is no prophet after me)

Firdausi in the epic, in the ode

Sadi and in qasida Anwari. (Prof Brown's translation)

(۵) ز شیر شترخوردن‌وسوسمار عرب‌را بجائی رسید است‌کار

که تخت‌کیان را کند آرزو تفو بر توایـ چرخ‌گردان تفو (فردوسی)

From feeding on camel's milk and desert lizard, so have the affairs of the Arabs prospered

That they covet the throne of the Chosroes.

Shame on thee O circling Heavens, shame,

۶ عاقلے را پرسیدند نیک بخت کیست وبدبخت چیست ' گفت نیک بخت آنکه خورد و کشت و بد بخت آنکه مرد و هشت (سعدی)

They asked of a wise man who is the man of good fortune & who of bad? He said " The man of good fortune is he who ate & tilled ; the man of bad fortune is he who died and left (everything he had),,

۷ اگر جز به کام من آید جواب - من و گرز و میدان و افراسیاب (فردوسی)

If the answer prove contrary to my wish

Then I shall take the mace and the field against afrasiyab,

۸ خروشید و جوشید و جامه درید - بزاری بران کودک نا رسید

برآورد بانگ و غریو و خروش زمان تازمان زوهمی رفت هوش (فردوسی)

She screamed and raved and rent her garment in lamentation

over the unblossomed youth.

She sobbed and wailed and shouted & fainted again & again.

۹ دلیرے که به نام او اشکبوس همی بر خروشید برسان کوس

The intrepid Ashkboos roared like a drum

۱۰ دلم ازخدمت شیراز بهکلی بگرفت وقت آنست که پرسی خبر ازبغداِدم

سعدیاحب وطن گرچه حدیثے است صحیح نتوان مرد بهسختی که من این جازادم (سعدی)

My soul is weary of shiraz, utterly sick and sad

If you seek news of my doings , you will have to ask at Baghdad

Sadi, that love of one's native land is a true tradition is clear,

But I cannot afford to die of want because my birth was here.

۱۱ آن را که جاے نیست همه شهر جاے اوست

درویش هر کجا که شب آمد سراے اوست (سعدی)

The whole town is the home of him who has no home.

The poor man's house is whereever night overtakes him.

(سعدی) بنده چه دعوی کند حکم خداوند راست ۱۲

What objection can a servant raise? It is for the master to command.

بدم گفتی و خورسندم عفاک‌الله نکو گفتی ۱۳

(خواجه حافظ) جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را

Thou didst speak me ill, & I am content, God pardon thee thou didst speak well.

A bitter answer befits a ruby lip which feeds on sugar.

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را ۱۴

به خال هندوش بخشم سمرقند و بخارا را

If that beauty of Shiraz would take my heart in hand,

I would give for her dark mole Samarqand & Bukhara.

(From Robinson's Persian poetry)

Sweet maid, if thou wouldst charm my sight,

And bid those arms my neck infold, That rosy cheek that lily hand,

would give thy poet more delight

Than all Bukhara's vaunted gold,

Than all the gems of Samarqand. (Sir william Jones)

بده ساقی می باقی که در جنت نخواهی یافت ۱۵

کنار آب رکناباد و گل گشت مصلی را

Boy bring me the wine that remaineth, for in paradise thou

wilt not see the banks of the waters of Ruknabad, nor the rose bower of our Moselay. (Robinson's Persian poetry)

Boy, let yon liquid ruby flow.
And bid thy pensive heart be glad,
Tell them their Eden cannot show,
A stream so clesr as Ruknabad,
A bower so sweet as Mosalay. (Sir william Jones)

۱۶ فغان کین لولیان شوخ و شیرین کار و شهر آشوب
چنان بردند صبر از دل که ترکان خوان یغمارا

Alas! those saucy lovely ones' those charming disturbers of our city; bear away patience from my heart as Turkomans their repast of plunder. (Robinson's Persian poetry).

Go boldly forth my simple lay,
Whose accents flow with artless ease,
Like orient pearls at random strung,
My notes are sweet the damsels say,
And oh far sweeter, if they please,
The nymph for whom they are sung. (Sir william Jones)

ز عشق نا تمام ما جمال یار مستغنی است
به آب و رنگ و خال و خط چه حاجت روی زیبارا

Yet the beauty of maidens is independent of our imperfect love, To a lovely face, what need is there of paints and dyes, of mole or down.

حدیث از مطرب و مے گو و راز دهر کمتر جو
که کس نکشود و نکشاید به حکمت این معمارا

Speak of the musician and of wine and search less into the secrets of futurity;

for no one in his wisdom ever hath discoverd or everwill discover that mystery.

من از آں حسن روز افزوں که یوسف داشت دانستم
که عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

I can understand how the deauty of Joseph, which added now luster to the day,

withdraw zalikha from the veil of her modesty.

بدم گفتی و خورسندم عفاک الله نکو گفتی
جواب تلخ مے زیبد لب لعل شکر خارا

Thou hast spoken evil of me, and I am contented - God forgive thee. Thou hast spoken well; for even a bitter word is beseeming when it cometh from a ruby sugar - dropping lip.

نصیحت گوش کن جاناں که از جاں دوست تردارند
جوانان سعادت مند پند پیر دانا را

Give ear O my soul, to good councel, for better than their own souls love youths of happy disposition the admonition of the aged wise.

غزل گفتی و در سفتی ' بیاؤ خوش به خواں 'حافظ'
که بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

Thou hast composed thy ghazal; thou hast strung thy pearls.

Come and sing it sweetly. O Hafiz, for heaven hath shed upon thy poetry the harmony of the pleiades.

مندرجۂ بالا سطور میں ترجمے کے جو نمونے ہدیۂ ناظرین کئے گئے ہیں ' ان سے ارباب بصیرت یہ ضرور محسوس کریںگے کہ ترجمے میں جو زبان برتی گئی ہے وہ انگلستان کی ٹکسالی زبان ہے ' وہ ایسی زبان ہے جو شب و روز وہاں بولی اور لکھی جاتی ہے ' وہ ایسی زبان ہے جو وہاں کے روز مرہ اور محاورے کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے' وہ ایسی زبان نہیں جس کو دیکھکر فصحاے انگلستان ناک بھوں چڑھائیں اور ٹکسال باہر سمجھہ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں' بلکہ وہ ایسی زبان ہے کہ انگلستان کے آدمیوں اور انشا پردازوں کے لئے باعث ناز اور موجب افتخار ہے - ہم نے متعدد انگریز حضرات سے سنا ہے کہ فٹز جیرالڈ نے عمر خیام سے صرف خیالات کا اقتباس کیا ہے اور مشرقی جذبات کو مغربی لباس میں اس خوبی اور خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ اگر وہ عمر خیام کا نام نہ لے تو دوئی متنفس اس پر سرقے کا الزام نہیں لگا سکتا - سی طرح پروفیسر براؤن کی نسبت علماے ادب کی یہ راے ہے کہ " فارسی زبان کے شہ پاروں کو فصیح اور بلیغ انگریزی کا جامہ پہنانا اسی کا حصہ ہے "- یہ ہے ترجمہ جو مترجم کے لئے مایۂ فخر و ناز اور اس کی شہرت اور ناموری کے لئے چشمۂ آب حیات ہے - اس کے برعکس ہمارے یہاں کے ترجموں کو لیجئے اور ان پر ایک سر سری نظر ڈالئے ' آپ کو معلوم ہو گا کہ ہمارے مترجم حضرات جو زبان برتتے ہیں وہ اردو نہیں ہے ' بلکہ اچھی خاصی انگریزی ہے - وہی الفاظ و محاورات ہیں ' وہی بندشیں اور ترکیبیں ہیں ' وہی طرز ادا اور وہی اسلوب بیان ہیں کہ بے کم و کاست اردو میں برتے جاتے ہیں' اس لئےکہ ان بزرگ زادوں کے یہاں تصرف کا نام خیانت اور اجتہاد کا نام بد دیانتی ہے —

موجودہ ترجمے اور تالیف کے نمونے

اب ہم موجودہ ترجمے اور تالیف کے چند نمونے ھدیۂ ناظرین کرتے ھیں، جن کے مطالعے سے معلوم ھو گا کہ ھمارے نو عمر مترجم اور نو خیز مؤلف اس باب میں کیا کیا گل کاریاں فرمارھے ھیں —

(۱) ....ھمارے پاس جو کچھہ ' کافی ' معلومات ' ھے ' ۔

(۲) (Hest) وہ ھے ۔ (Jps Sout) ' وے ' ھیں —

(۳) اطالیہ میں آسکن (Oscan) اور امبرین (Umdvian) کی طرح ' جو ' دونوں لاطینی زبان سے تعلق رکھنے والی بولیاں تھیں —

(۴) تاریخی ' زمانے کے ' آس پاس ' (قریب)

(۵) زبانیں ' ترسیل خیال ' کے لئے بنتی ھیں (اظہار خیال)

(۶) انگریزی بولنے والا شخص ایسے شخص کے لئے جو صرف فرانسیسی جانتا ھو ' ناقابل فہم ھے ' ۔

(۷) جس کا تلفظ ' کمزور ' ھو گیا ھے ؟

(۸) زبان کی ' کوئی ' اچھی خاندان واری تقسیم کرنے کےلئے.....الخ (کوئی زائدھے)

(۹) وہ ' کہیں اور ابھی ' ممکن نہیں (انگریزی انداز ھے)

(۱۰) خیام اور حافظ کے بعد کرانے دو نے ' سعدی پر ' لکھا ھے (پر=متعلق)

(۱۱) سعدی کا مرتبہ بحیثیت ایک ' متفکر ' اور معلم ' کے دکھایا گیا ھے (متفکر غلط

(۱۲) پہلے اور چوتھے ' بابوں ' میں (باب میں)

(۱۳) سعدی ' شیریں فاصح ' اور ' خوشنام شاعر ' مقام شیراز سنہ ۱۱۸۴ ع میں بعہد اتابک پنجم ' فارس ' پیدا ھوا ۔

(۱۴) اسے دس دینار میں ' خرید کیا ' (خریدا)

(۱۵) خدائے تعالی کے فضل و کرم کو ' مناظر قدرت کے اندر دکھایا ' ھے ۔

(۱۶) یہ نظم فراغ اور باوسعت ھے —

(۱۷) اور پھر 'محکم' اور دل نشین بھی ہے (فراخ اور با وسعت نظم کیسی ہوتی ہے' محکم کے کیا معنی؟)

(۱۶) وہ اپنے ایک دوست سے استدعا کرتا ہے 'کہ وہ اس کے لئے اُس کی ادائیگی سے سبکدوشی حاصل کرے' (کہ میری طرف سے میرا قرض بیباق کردیں)

(۱۷) اس نے مرافعہ کرنے کو ترجیح دی ہے۔ (اس نے مرافعہ دائر کیا ہے)

(۱۸) جس کی تعریف بذریعۂ حدود کی گئی ہے۔ (جس کی حدیں معین کردی گئی ہیں)

(۱۹) تم کو شریر ہونا چاہئے۔ (لازم ہے کہ تم شریر ہو)

(۲۰) برطانیہ اپنے اچھے دفاتر استعمال کریگی۔ (Good office) کا ترجمہ ہے)

(۲۱) بیکار لوگوں کی مضبوطی (تعداد)

(۲۲) ملکۂ ثریا عنقریب قید ہونے والی ہے۔ (اس کے بچہ ہونے والا ہے)

(۲۳) جس کی تعریف بطور بیوہ کے کی گئی ہے۔ (جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ بیوہ ہے)

(۲۴) اگر کوئی چیز فائدہ ہوگئی تھی تو اس سے ٹیکس متعلق تھا۔ (خدا جانے یہ کونسی زبان ہے)

(۲۵) وہ ایک خوش نصیب سپاہی تھا (Soldier of fortune)

(۲۶) نتیجے میں (۲۷) 'بدنصیب الفاظ' (۲۸) 'قابل افسوس عبارت'۔

(۲۹) وہ ان کو 'وقتاً فوقتاً' ٹالتا رہا ہے (From time to time)

(۳۰) مرافعے کی سماعت 'ہمارے روبرو' مرافعان کی موجودگی میں کی جائے گی (ہمارے روبرو = جو ہمارے روبرو ہیں)

(۳۱) ملازم میں ایسی بداعمالی بھی ہوسکتی ہے جو معاہدۂ ملازمت کو ایک فریق کے بخلاف مرضی فریق ثانی ساقط کردینے کو جائز بنائے—

(۳۲) وہ مسلمان جو ایک ہی مسجد میں 'عبادت کرتے' ہیں۔ (نماز پڑھتے ہیں)

(۳۳) ہمیں اس بات کا خفیف سا خفیف اندازہ بھی تو نہیں ہوتا کہ زمانۂ تاریخی سے پہلے جو ہزاروں سال گذرے ہیں' یعنی اس قدیم زمانے میں جب انسان نے

پہلے پہل زبان کوحیات اجتماعی اور صنعتی اور ذہنی ارتقا کا وسیلہ بنایا تھا،
کیا واقعات پیش آئے تھے۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ ہم تمام مشترکہ زبانوں کی
درجہ بندی نہیں کرسکتے؛ اور ہماری تحقیق اگر کہیں تھوڑی بہت کام آتی ہے
تو صرف مختلف مجموعوں کی تقابلی صرف و نحو کے مطالعے میں اور اس
صنف میں بھی ہم بجز سامی، فنی، یوگری، ملای، ایشیائی اور بانتو
خاندانوں کے اور کسی کے متعلق کچھ نہیں کرسکے ہیں۔ تو ان سب باتوں
سے یہ لازم آتا ہے کہ انسانی زبانوں کی وحدت یا کم از کم اُن زبانوں کے
جو آج معروف ہیں، آغاز اور ابتدا کے مسئلے کو اٹھانا کچھ زیادہ سودمند
نہیں ہوسکتا۔ (یہی زبان ہے جس کو "فرنگی اُردو" کہتے ہیں)

(۳۴) وہ شعر جنسے کسی پادشاہ وقت کی تعریف جو زندہ ہے، پائی جاتی ہو، اڑا دیے گئے
ہیں۔ (وہ شعر اُڑادیے گئے ہیں جن میں کسی بادشاہ وقت کی تعریف پائی جاتی ہو)

(۳۵) اب اشعری اور اہل سنت اکثر عقائد میں ——— ملتے ہیں (کب نہ ملتے ہے؟)

(۳۶) انسان اپنے افعال کا 'خود' مختار ہے (انسان خودمختار ہے۔ یا اپنے افعال
کا مختار ہے)

(۳۷) دو سب سے اخیر بابوں میں (اخیر کے دو بابوں میں)

(۳۸) اس کے بعد سعدی کو اپنا ہم خیال بناکر دونوں دوست تفریح گناں باہر کو
روانہ ہوے (یہ دونوں دوست کون ہیں جنھوں نے سعدی کو اپنا ہم
خیال بنایا تھا؟) (۳۹) علےالصباح جب واپسی کا ارادہ ہوا تو سعدی
نے دیکھا کہ اس کے دوست نے اپنا دامن گل ریحان اور سنبل و ضمیران سے
بھر رکھا تھا (بھر رکھا ہے) (۴۰) اس تصور کے زیر اثر نظمیں لکھیں

(۴۱) ممکن ہے کہ میں خود خریدار بن جاؤنگا (ممکن ہے کہ میں خود خریدوں)

(۴۲) ہر ممکن طریقے سے (۴۳) ہر ممکن کوشش کرونگا)

(۴۴) شیر خوار بچہ پھول کو دیکھ کر اپنا ننھا سا ہاتھ بڑھائیگا اور اصرار کریگا کہ یہ اس سے (مجھسے) جدا نہ ہو —

(۴۵) وہ (یعنی آنکھ) فخریہ کہنے لگتی ہے کہ اس کی (مہری) پیدائش حسن کی خاطر تھی —

(۴۶) اس نے کہا کہ اس کے والد صاحب (میرے والد صاحب) اس سے (مجھسے) بہت ناراض تھے (بہت ناراض ہیں)

(۴۷) اس نے مجھسے کہا کہ وہ لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے (میں اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہوں)

(۴۸) اسی کو سینے سے لگائے رہ کر میں نے زندگی کے دن گزارے ہیں —

(۴۹) مذہبی نقطۂ نگاہ کو چھوڑ کر (اگرچہ یہ ایک مسلوہ کے لئے نا ممکن ہے) بھی ہم ترکوں کے طرز عمل کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتے —

(۵۰) اگر آپ اس کے ہمراہ اس کے محمل میں جائیں تو وہ یہی تماشا اپنے شیشے کے آلات یا برقی بیٹری کے ذریعے بتلائیگا (دکھا ئیگا)

(۵۱) لیکن یہاں آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آپ آرام و اطمینان سے آگ کے قریب بیٹھے ہوئے اور بغیر بجلی سے مضرت پہنچنے یا بارش سے بھیگنے کے خوف سے سب کچھ دیکھ سکتے اور سن سکتے ہیں —

(۵۲) وینس کی دلہن —— جس کو شاعری، مصوری، نقاشی، بت تراشی اور موسیقی ہمیشہ سے آراستہ کرتے آئے ہیں (آراستہ کرتی آئی ہیں)

(۵۳) ان بیانات و خیالات کا میں کیا جواب دوں، جس کو سننے کے بعد کیمیاداں کی نگاہیں اور خیالات ملٹن کے ابلیس کے خیالات کی طرح جو اس کے مرتبے کے تنزل کے قبل تھے، بجنسہ پستی کی طرف مائل ہوتے ہیں، اور جو بجائے کسی مقدس یا پاک شے کے نسبتاً دنیوی نمود و نمائش دولت اور حقیر سونے کو پسند کرتا ۔ اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے —

(۵۴) انگلستان میں دو عاشق و معشوق کی شادی ہونے والی تھی (عاشق ومعشوق کی شادی ہونے والی تھی)

(۵۵) شادی سے ایک روز پہلے عاشق زار نے اپنی ہونے والی دلہن کے (منگیتر کے) ایک چاہنے والے کی ایک ناز یبا حرکت سے مشتعل ہوکر اُسے گولی کا نشانہ بنا کے مار ڈالا (اسے گولی کا نشانہ بنادیا۔ مگر کس کو؟)

(۵۶) ہر وہ شخص نہیں سمجھ سکتا جس نے اقلیدس شروع سے نہ پڑھی ہو ہر فضول ہے)

(۵۷) کلیم پونا کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان میں سے تھے۔ اول ڈویژن میں رہ کر اس نے ایک خاص اعزاز سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا —

(۵۸) کچھ مدت تک تو متلون مزاج متلون نواب زادہ اپنی بیوی کے ساتھ خوش رہا (اپنی بیوی سے خوش رہا)

(۵۹) اور چونکہ سوائے اس بیٹی کے دوسرا کوئی اس کے حصے کا مالک نہ تھا ، اس لئے اپنے خسر کے مرنے کے بعد تمام آلات جغرافیہ اور بہت بڑا ذخیرہ بھری نقشوں اور دیگر مقامات کا جہاں جہاں اس نے اپنی زندگی میں سفر کیا تھا ، معہ گھر کے مال و اسباب ، سب کا مالک بیٹی اور داماد ہوئے -

(۶۰) حکمراں شاعر نہیں تھے (نہیں غلط ہے - نہ تھے چاہئے)

(۶۱) اس کا سبب میر نے شاعرانہ طریقے سے بڑا پر لطف پیش کیا ہے (شاعرانہ انداز میں پر لطف طریقے سے پیش کیا ہے)

(۶۲) اس انتخاب میں قدیم طرز کے اشعار میں نے نہیں درج کئے ہیں - اگر کوئی ملیں تو مجھے معاف کیجئے (اگر کوئی ملے یا اگر کچھ ملیں)

(۶۳) ان تینوں کے بعض وہ شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں جن میں امر امر کی طرف اشارہ ہے (۱- بعض ایسے شعر۔ ۲- وہ شعر)

(۶۴) عطار کا کلام خود ان کے اپنے زمانے میں مدون نہیں ہوا (اپنے زائد ہے)

(۶۵) میں نے خود بھی عرصہ ہوا 'پند نامہ' ایک خلاصے کے ذریعے سے جو براہ کرم میرے لئے حسن فہمی نے تیار کیا تھا مطالعہ کیا تھا۔ (پند نامے کا خلاصہ پڑھا تھا وغیرہ)

(۶۶) بعض متداول و معروف تشبیہات کے ساتھ بعض عالی شان اور جلیل القدر خیالات پائے جاتے ہیں—

(۶۷) پانچ سو (پانسو) آدمی خیال کرتا ہے کہ وہ بوڑھا ہے (میں بوڑھا ہوں) اس کی مثال ایسے اونٹ کی ہے جو بندھی ہوئی آنکھوں سے چکی کے گرد گھومتا ہے۔ (وہ ایسا اونٹ ہے جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے اور)

(۶۸) یہ حکایات اس روح (Spirit کا ترجمہ ہے) میں نہیں لکھی گئی ہیں جو سعدی میں پائی جاتی ہے۔

(۶۹) جسے میں کسی قدر مختصر پیرایے میں درج کرتا ہوں (مختصر طور پر)

(۷۰) وہ آگ فوراً اس ایندھن میں لگ جاتی ہے' جو ققنس نے جمع کرلیا ہے (جمع کر رکھا ہے) اور ہلکے ہلکے (آہستہ آہستہ) اسے جلا دیتی ہے

(۷۱) قاضی نے صوفی کو حکم دیا کہ وہ ان الفاظ سے توبہ کرے (قاضی نے حکم دیا کہ ان الفاظ سے توبہ کرو)

(۷۲) ۱۰-شوال تاریخ وصال قاضی صاحب کا عرس .... کیا جاتا ہے (کیامعنی؟)

(۷۳) اور اس وقت تک شاعری کی ہر صنف میں قسمت آزمائی کرچکے تھے (طبع آزمائی)

(۷۴) گاؤں کے مکھیا نے قاضی صاحب سے اظہار ہمدردی کی (کیا)

(۷۵) قاضی صاحب نے کہا اچھا لیجئے (لیجئے زائد ہے) میں کوشش کرونگا تمہاری بات نہ ٹالوں گا —

(۷۷) شیخ نے فرمایا کہ تصور شیخ کیا کرو- اور اس کی مشق یہاں تک بہم پہنچاؤ
کہ " من تو شدم تو من شدی " کا قول صادق آجاے اور مرید اور شیخ میں
وهی رشته اور تعلق نه هوجاے جو جسم کو روح سے ہے (نہ غلط ہے)

(۷۸) کتاب کا آخری حصہ جس میں تاریخ تصنیف کتاب ضرور رهی ہو گی
(ضرور هو گی)

(۷۹) ظاہرا شکل و صورت (ظاهری)

(۸۰) اس کی روح ان تمام ردو بدل سے بری ہے (اس تمام ردو بدل سے)

(۸۱) اس کا سمجھنا ذرا بہت مشکل ہے - (ذرا زائید ہے)

(۸۲) دونوں قریب قریب ایک ہی ہیں (دونوں قریب قریب ایک ہیں -
بلکه یکساں هیں)

(۸۳) ان اشعار میں عشق حقیقی کا اصل ترک دنیا، ترک آرزو پر فہا یت
قرینے کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے (کیا معنی ہیں ؟)

(۸۴) اگر تم میری مدد کرو تو میرا دامن معصیت بالکل دھل جاے ، مدد
کیجئے (شتر گر بہ ہے)

(۸۵) اظہار معصیت محض اس لئے کر تے ہیں تا کہ وہ اپنی عبادت وغیرہ پر
تکیہ کر کے نہ بیٹھ جائیں (تا کہ غلط ہے کہ چاہیے)

(۸۶) بنگ سبب ہے اور معصیت اس کا لازمی اثر (نتیجہ)

(۸۷) ایک زمانہ تھا کہ بنگ بنگاب سے بے نیاز تھا (تھی)

(۸۸) اس کی بدولت ہم دنیا سمجھنے کی کوشش کر تے ہیں (دنیا کو)

(۸۹) بنگاب کے زیر تصت رہیں ، (ما تحت)

(۹۰) بنگ کے سر بستہ ھاے راز کو انہوں نے منکشف کر دیا ہے
(رازهاے سربسته)

(۹۱) 'ک' کے نیچے تین نقطے رکھنے سے وہ 'گ' ہو جاتا ہے (وہ زائد ہے)

(۹۲) 'ر' کے نیچے تین نقطے رکھنے سے وہ 'ڑ' ہو جاتا ہے (ڑ ہو جاتی ہے)

(۹۳) کہیں سنہ ۱۸۷۰ ع میں جرمن ایک متحد قوم بن پائے -

(۹۴) ان گدھوں کی طرح 'لاطینی' حرفوں سے نہ پوچھنا چاھئیے کہ جرمن زبان کیوں کر بولی جائے، بلکہ گھر میں بیٹھنے والی ماؤں سے، سڑک پر کھیلنے والے بچوں سے، بازار میں پھرنے والے لوگوں سے (خدا جانے کیا مفہوم ہے)

(۹۵) سولھویں صدی کی 'ادبی پیداوار' سوائے مذھبی کتبوں وغیرہ کے اور کچھہ نہ تھی -

(۹۶) (Plays) 'کھیل ڈراما' کی (Spirit) 'روح' سے خالی ھیں-

(۹۷) اس کا سب سے پہلا ناول ایک آوارہ گرد کی خود نوشتہ سوانح عمری کے طور پر (عنوان سے) شائع ہوا —

(۹۸) اس کی غنائی شاعری موسیقی سے خالی ہے (خالص انگریزی انداز بیان ہے)

(۹۹) ایک گروہ اس کا مخالف تھا، جو اس کی واقعیت پسندانہ کو مخرب اخلاق سمجھتا تھا (واقعیت پسندانہ کیا ؟)

(۱۰۰) وہ ان پردوں کے پیچھے انسانیت کے عین کو دیکھتا ہے (عین کیا معنی ؟)

(۱۰۱) اس کی سعی سے ملک کے نظم و نسق میں کوئی دیرپا خارجی نتائج حاصل 'نہیں ہوئے' -

(۱۰۲) تمدن کے نمونے اور کلاسیکی روح کے مجسمے ملے -

(۱۰۳) جرمنی کی اسٹیج پر کویلوں کا قبضہ تھا - (فرنگی اردو ہے) -

مندرجۂ بالا سطور میں ترجمے اور تالیف کے جو نمونے ہدیۂ ناظرین کئے گئے ہیں وہ ان جوانانِ ادب کے زورِ طبع کے نتائج ہیں، جو شہرت اور ناموری کے پروں پر اُڑے چلے جاتے ہیں۔ اور انگریزی انشا و ادب کی اعانت و امداد سے سلطنت اردو کو اپنی قلمرو میں شامل کر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان نمونوں پر اردو کا اطلاق ہو سکتا ہے، کیا کوئی مبصر اور ماہر زبان ان پر اردو کا اتہام عائد کر سکتا ہے؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اردو روزمرہ کے نمونے ہیں؟ کیا کوئی شخص لکھ سکتا ہے کہ ان میں اور انگریزی میں کچھ فرق ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہمارے نزدیک تو یہ اچھی خاصی انگریزی ہے جو انگریزی داں حضرات کے قلموں سے ٹپک پڑی ہے۔ سیدھی سادی اردو لکھنی اور دلی اور لکھنو کے روزمرہ کی پیروی کرنی انھیں لوگوں کا کام ہے جو شہرت اور ناموری کے میدان میں پیچھے رہنا چاہتے ہیں۔

زندگی کے ہر شعبے میں دو قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو ترقی کرنا اور آگے بڑھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں ـ دوسرے وہ بزرگ ہیں جو روایات قدیم سے انحراف کرنا اور کسی ناسپردہ راستے میں قدم رکھنا خلاف ایمان تصور فرماتے ہیں۔ اس امر میں سر موشک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ لکیر کا فقیر رہنا اور رسم و رواج قدیم کی بندشوں سے آزاد نہ ہونا گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن جدت طرازی اور اختراع پسندی کے شوق میں مسلمہ حدود و قیود کو نظر انداز کرنا اور قدیم نمونوں کو توڑ پھوڑ کر رکھدینا کونسی دانائی اور کہاں کی ترقی ہے۔ ہمارے نزدیک جدت طرازی اور حدودشکنی صرف انھی بزرگوں کا حصہ ہے جو سالہا سال غور وفکر کی داد دیتے ہیں اور مدت العمر کی متواتر اور لگاتار کدو کاوش کے بعد اپنی ذات میں وہ قابلیت پیدا کرلیتے ہیں جو آگے بڑھنے اور جدت دکھانے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ دنیا عالم اسباب ہے یہاں یکساں اسباب سے یکساں

نتائج نکلتے ہیں۔ نومشق اور خام مذاق حضرات نہ کبھی ترقی کرسکے ہیں، نہ قیامت تک کرسکیں گے۔ دو اَن مل اور بے جوڑ لفظوں کو پاس پاس رکھہ دینا اور اس کو جدت اور ندرت قرار دینا اُنھی لوگوں کا کام ہے، جو ذوق سلیم سے بے بہرہ ہیں۔ جب تک قدامت پرستی اور جدت پسندی ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں اس وقت تک اصلی اور حقیقی معنی میں ترقی نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک اس دور میں اِس امر کی سخت ضرورت ہے کہ ایک محکمہ قائم کیا جاے اور اس کا نام "محکمۂ احتساب ادب" رکھا جاے۔ اور اس کو یہ خدمت سپرد کی جاے کہ پہلے ہر مضمون پر نقادانہ نظر ڈال لے اور اس کے بعد اس کو شائع ہونے کی اجازت دے؛ ورنہ وہ وقت دور نہیں ہے کہ اُردو اُردو نہ رہے گی، اچھی خاصی انگریزی بن جائے گی —

اس مقام پر ہمارے نام نہاد جدت پسند حضرات کی طرف سے یہ اعتراض ہوگا کہ "ہر زبان کی یہی حالت ہے اور ہر زبان کو کم و بیش یہی مدارج طے کرنے پڑے ہیں۔ کوئی زبان اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم کے نوجوان اپنی زبان کی خدمت اپنے ذوق ہمت پر لیتے ہیں، اس میں طرح طرح کے نمونے جمع کرتے ہیں اور اس طرح اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتے ہیں"۔ اس میں کچھہ شک نہیں کہ یہ عمل یوں ہی جاری رہا ہے اور یوں ہی رہے گا۔ مگر محکمۂ احتساب بھی ہمیشہ قائم ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ قائم ہوتا رہےگا۔ انگریزی اس قدر وسیع اور سرمایہ دار زبان ہے کہ اس کی تقلید جزو ایمان سمجھی جاتی ہے مگر اس کے باوجود بھی "احتساب" کا یہ عالم ہے کہ بال کی کھال نکالی جاتی ہے اور لفظ لفظ کی قدر و قیمت معین کی جاتی ہے۔ 'نگار' ہندوستان میں نہایت مقتدر رسالہ ہے۔ اُس کے مدیر ہمہ داں ہیں۔ اطراف و جوانب سے استفسارات کی بھرمار ہوتی ہے۔ اور وہ ہمہ داں فاضل اُن سب کا جواب دیتے ہیں۔ اسی مقتدر رسالے کے

کسی نمبر میں ایک دفعہ ایک قدامت پرست بزرگ نے جناب مدیر سے ذہنیت کے متعلق کچھ سوال کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ "یہ لفظ Mentality کا صحیح ترجمہ ہے، اس لئے آپ کو بھی اپنی ذہنیت میں تبدیلی کرنی چاہئے"۔ مگر فاضل ہمہ داں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ انگریزی Mentality کے خلاف اس سے کہیں زیادہ جہاد کیا جاتا ہے، جس قدر اردو میں ذہنیت کے خلاف روا رکھا جاتا ہے۔ اگر جناب مفتی ادب کی نظر میں یہ نکتہ ہوتا تو اس فضول اور بیکار لفظ کی حمایت سے پرہیز کرتے۔ اس کے علاوہ ہم اپنے جدت پسند حضرات سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ اگر اردو کی جگہ فرنگی اردو نے لے لی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ہمارے نزدیک اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس اردو کو صرف وہی بزرگ سمجھ سکیں گے جن کی آنکھیں انگریزی علم ادب کے مطالعے سے روشن ہوں، اور جن کی نظر میں وہ انداز بیان پہلے سے موجود ہے جس کی تقلید لیکن جو لوگ اس نعمت عظمیٰ سے بے بہرہ ہیں، وہ محروم رہ جائیں گے۔ اور جب یہ لوگ محروم رہے تو جناب کی جدت طرازیاں اور معنی آفرینیاں کس کام آئینگی۔ کیا جناب کے سامنے وہ بزرگ زانوے ادب تہ فرمائینگے جو انگریزی تعلیم اور انگریزی اندازبیان دونوں سے واقف ہیں؟ کیا یہ حضرات جناب کی سعی وکوشش کے محتاج ہیں۔ یا ان بزرگوں کو آپ کی اعانت و امداد کی ضرورت ہے؟ اگر آپ کا یہ خیال ہے تو غلط اور سراسر غلط ہے۔ جس قدر جلد آپ اس کو نکال ڈالینگے ملک وقوم اور زبان و ادب پر آپ اسی قدر احسان فرمائینگے۔ ہمارے نزدیک جو لوگ آپ کی خدمت کے محتاج اور آپ کی امداد کے خواہاں ہیں، وہ وہی لوگ ہیں جو آپ کی زبان سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کیا ہندوستان کے طول و عرض میں کوئی اردو داں شخص ایسا ہے جو "اچھے دفاتر" کا مطلب سمجھ سکے اور "بدنصیب الفاظ" اور "قابل افسوس عبارت" کی کنہ تک پہنچ جائے؟ اگر کوئی شخص ان انوکھی اور نرالی ترکیبوں کو سمجھ سکتا ہے تو وہ وہی شخص ہے جس کی آنکھیں "ادبیات انگریزی" سے روشن ہیں۔ ہمارے

نزدیک "Soldier of fortune" کا ترجمہ " خوش نصیب سپاھی " کرنا اور اس کو دیانت اور امانت قرار دینا دیانت اور امانت کا منہ چڑانا ھے —

اس مقام پر ایک اعتراض اور بھی ھوسکتا ھے وہ یہ ھے کہ ایک زمانہ تھا کہ عربی فارسی وغیرہ سے اردو میں ترجمہ کیا جاتا تھا - اس وقت جو لوگ مشرقی زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرتے تھے وہ عربی اور فارسی ترکیبیں اسی کثرت سے برتتے تھے، جس قدر اس دور میں انگریزی ترکیبیں برتتے ھیں - مثلاً

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں

ھر اک سے پوچھتا ھوں کہ جاؤں کدھر کو میں ' مرزا غالب '

اس شعر میں " چھوڑا نہ رشک نے " خالص فارسی ترکیب ھے - جو " رشکم نہ گذاشت " کا لفظی ترجمہ ھے - اس کے جواب میں ھم معترض حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرتے ھیں کہ فارسی اور انگریزی میں کسی قدر فرق ھے، اگر وہ فرق نظر میں ھوتا تو یہ اعتراض نہ کیا جاتا - وہ فرق یہ ھے کہ جس وقت فارسی سے اردو میں ترجمہ کیاجاتا تھا، اس وقت ھماری زبان فارسی تھی یا کم از کم تعلیم یافتہ گھرانوں میں بے تکلف سمجھی جاتی تھی - اس لئے اردو میں فارسی کی تقلید غیرمانوس اور ناقابل فہم نہ تھی بلکہ کلام میں ایک خاص لطف پیدا کردیتی تھی اور سننے والے کو یہ محسوس ھوتا تھا کہ ھماری ھی چیز ھے- جو مختلف لباسوں میں ھمارے سامنے جلوہ گر ھے، لیکن اس زمانے میں انگریزی ھماری زبان نہیں ھے اور نہ کوئی خاندان ایسا نظرآتاھے جس میں انگریزی مادری زبان کی حیثیت سے بولی جاتی ھو اور اگر کوئی ایک آدھ خاندان ایسا ھے بھی تو اُس کو اُردو اور ترقی اُردو، دونوں سے کچھ سروکار نہیں- اس لئے ھم بلاتکلف کہہ سکتے ھیں کہ فارسی سے ترجمہ کرتے وقت ھماری الفاظ پرستی نبھہ گئی ' لیکن انگریزی سے ترجمہ کرتے وقت نہیں نبھہ سکتی - مثال کے طور پر ھم ایک انگریزی نظم پیش کرتے ھیں جس کا پہلا ٹکڑا یاد رہ گیا ھے "The poem hangs on the berry bush"

اس کا ترجمہ ایک صاحب کہاں بزرگ ان الفاظ میں فرماتے ھیں کہ "نظم " بیری کی جھاڑی " پر لٹکتی ھے" - ہم جناب مترجم کی خدمت میں نہایت ادب و انکسار سے التماس کرتے ھیں کہ آپ تمام ھندوستان کا سفر کریں اور اس سرے سے اس سرے تک چکر لگائیں اور اردو داں حضرات سے دریافت فرمائیں کہ " بیری کی جھاڑی " کے کیا معنی ھیں: اس کے جواب میں ھر شخص یہی کہے گا کہ بیری ایک درخت ھے جس میں بیر لگتے ھوں - آپ کو ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جو اس کا مفہوم وھی سمجھتا ھو جو جناب کے ذھن میں ھے - اب مجبور ھوکر جناب فرمائیں گے کہ صاحب وہ "بیری کا درخت" ھے یہ "بیری کی جھاڑی" ھے ' ان دونوں میں فرق ھے' وہ ھندوستانی "بیری" ھے یہ انگریزی "بیری" ھے - اس کے جواب میں وہ عرض کرے گا کہ جناب یہ تو معلوم نہیں کہ انگریزی "بیری" کسے کہتے ھیں اور اس کے معنی کیا ھیں ' لیکن " بیری کی جھاڑی " کے جو معنی ھمارے ذھن میں آتے ھیں وہ تو ھندوستانی ھیں انگریزی نہیں' ھم جاھل اور ناخواندہ لوگ انگریزی کو کیا سمجھہ سکتے ھیں - اس کے جواب میں جناب فرمائیں گے کہ حضرت 'درخت' اور جھاڑی میں بہت فرق ھے' آپ دونوں کو ایک کیوں سمجھتے ھیں" - اب وہ کہے گا کہ حضور فرق تو ضرور ھے ' مگر میں نے اپنے دل میں سمجھہ لیا تھا کہ آپ کسی ایسے علاقے کے باشندے ھیں جہاں درخت کو جھاڑی کہتے ھوں گے - بہر کیف "بیری کی جھاڑی" سے ھم جو کچھہ سمجھہ سکتے ھیں وہ تو یہی ھمارا بیری کا درخت ھے' باقی آپ جانیں اور آپ کی "بیری کی جھاڑی" جانے - اس جواب سے کبیدہ خاطر ھوکر جناب فرمائیں گے کہ اچھا "Berry bush" کا ترجمہ کیا کیا جائے - اس کے جواب میں ھم جناب سے عرض کریں گے کہ بیری کو نکال دیجئے ,, جھاڑی" رھنے دیجئے' کام چل جائے گا - اگر ادب و انشا کی شان دکھانی منظور ھے تو "اشجار و نباتات" وغیرہ الفاظ موجود ھیں' ان سے کام لیجئے؛ لیکن اردو داں پبلک کو اندھیرے میں نہ رھنے دیجئے اس لئے کہ اس نظم میں "بیری" کی کوئی خصوصیت نہیں' جو

چیز مقصود بالذات ہے وہ سرسبز اور ہرا بھرا درخت ہے، کوئی خاص درخت نہیں کہ خواہی نہ خواہی اس کا اظہار کیا جائے۔ خدا جانے وزن اور قافیے کی کیا کیا مجبوریاں ہوں گی جن کے باعث شاعر کو "Berry bush" لکھنا پڑا ہوگا، اگر یہ مجبوریاں نہ ہوتیں تو آپ دیکھ لیتے کہ شاعر صرف "bush" لکھتا - "Berry bush" ہرگز نہ لکھتا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ شاعر کی مجبوریوں کی تقلید کریں اور اردو داں حضرات سے ایسا لفظ رو شناس کرائیں جس کا مفہوم وہ غلط سمجھنے پر مجبور ہیں - اس کے علاوہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ لفظ "Berry" نہایت اہم اور ضروری لفظ ہے اور اس کے بغیر کسی طرح کام نہیں چل سکتا تو ہم عرض کریں گے کہ جذبات انگیزی اور شعر آفرینی میں لفظ "Berry" (بیری) کو جو کچھ دخل ہے وہ انگریزی میں ہے اُردو میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں بیری کو واقعات حیات سے اگر کوئی تعلق ہے تو وہ یاس خیز اور غم انگیز ہے، یعنی اس کے پتے گرم پانی میں ڈالے جاتے ہیں اور ان سے مُردے کو غسل دیا جاتا ہے - اگر اس درخت کو جذبات مسرت و انبساط سے کوئی واسطہ ہوتا تو ادب اردو میں کہیں تو ذکر آتا۔ ہمارے نزدیک اس نظم کا مفہوم یہ ہے کہ تلامیذ الرحمٰن حضرات کی شعر بیں نگاہیں جب کسی تر و تازہ اور سر سبز نو نہال کی نازک نازک پتیوں اور نرم نرم پنکھڑیوں پر پڑتی ہیں تو ان میں شعر و قصائد کے دفتر کے دفتر مضمر پاتی ہیں۔ یعنی جوانان چمن کے خدا داد اور طرب انگیز حسن کو دیکھ کر عاشق مزاج شاعر کے دل میں شعر گوئی اور شعر خوانی کے جذبات موجزن ہو جاتے ہیں - اسی طرح جب شکسپیر کسی بازار میں سے گذرتا ہے تو وہ بازار بازار نہیں رہتا بلکہ تھیٹر بن جاتا ہے - یعنی ملک الشعرائے انگلستان کی فطرت شناس نگاہیں بازاروں اور تجارت گاہوں میں فطرت انسانی کے ایسے ایسے اسرار و معارف دیکھ لیتی ہیں جو سطح بیں لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں- یہ خدائے سخن ان کو لیتا ہے اور انہیں غیر فانی اور لازوال ڈراموں کی تصنیف میں صرف کرتا ہے - ہمارے نزدیک یہاں بھی شکسپیر کی کوئی قید نہیں ہے -

اس لئے کہ یہاں یہ لفظ حقیقت میں اسم معرفہ نہیں ہے بلکہ نکرہ ہے اور اس سے اعلیٰ درجے کا ڈراما نویس شاعر مراد ہے - یعنی جب کسی اعلیٰ درجے کے ڈراما نویس شاعر کا گذر بازاروں اور تجارت گاہوں میں ہوتا ہے تو اس کی فطرت شناس نگاہیں فطرت انسانی کے گہرے اسرار و معارت تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ ان کو ڈراما نویسی میں صرت کرتا ہے، حالانکہ بازاروں اور تجارت‌گاہوں کو شعر گوئی اور مضمون آفرینی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ چیزیں تو شاعرانہ جذبات کے حق میں سم قاتل ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جاے تو شاعر کا منشا وہی ہے جو 'عرفی' کے اس شعر سے پایا جاتا ہے :

هر کس نه شنا سندهٔ راز است و گرنه
ایں ها همه راز است که معلوم عوام است

اب ہم فاضل مترجم سے دریافت کرتے ہیں کہ جناب کے ترجمے سے پڑھنے والوں کے دلوں پر یہی اثر ہوتا ہے کہ نہیں - اگر نہیں ہوتا تو کیا جناب کامیاب ہیں اور جناب کی سعی مشکور ہے ؟ کیا ملک و قوم پر جناب کا کوئی احسان ہے' یا زبان و ادب پر جناب کی کوئی عنایت ہے ؟

اگر یہ کہا جاے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طلبا انگریزی جانتے ہیں ' اس لئے ان کے سامنے فرنگی اردو کے نمونے پیش کرنے میں کیا مضائقہ ہے ؟ تو ہم دریافت کرتے ہیں کہ ترجمے کی کیا ضرورت ہے - انگریزی میں علوم کی تعلیم کیوں نہیں دی جاتی ؟ اور برطانی ہندوستان کی اور یونیورسٹیوں کی تقلید کیوں نہیں جاتی ؟ آخر کوئی تو خوبی ہے کہ رسم قدیم سے انحراف کیا گیا اور اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا ہے ہمارے نزدیک اردو سے انحراف کرنا اور اس کی جگہ ' فرنگی اردو ' سے کام لینا اس مقصد کو فوت کرنا ہے' جس کے لئے جامعۂ عثمانیہ عالم وجود میں جلوہ گر ہے —

اصول تراجم

اب هم اپنی ناقص عقل و راے کے مطابق چند اصول ملک و قوم کے سامنے پیش کرتے هیں اور اپنے الوالعزم نو جوانوں سے درخواست کرتے هیں که ان پر غور کریں اور یه دیکھیں که وہ اصول مذاق سلیم کے معیار پر پورے اُترتے هیں که نهیں - اگر اُنهیں اپنے لئے مفید اور کار آمد پائیں تو اُن پر کار بند هوں ' ورنه اپنے لئے کچھ اور اصول مقرر کریں اور ان سے شمع هدایت کا کام لیں' تا که ترجمے کی تنگ و تاریک گھاٹیوں میں سر ٹکراتے نه پھریں —

---

(۱) اسماے معرفه

اسماے معرفه کی دو قسمیں هیں (۱) اسماے اشخاص (۲) اسماے مقامات۔

اسماے اشخاص کے متعلق یه اصول هے که اصل زبان کے تلفظ کا اتباع نه کیا جاے بلکه قطع و برید کر کے اس کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال لیا جاے - مثلاً Gallon سے جالینوس - ' Socretes ' سے سقراط ' Aristotles ' سے ارسطو اور ' Plato ' سے افلاطون بنانا انهی بزرگوں کا کام تھا ' جنهیں ' دربار ادب ' سے ذوق سلیم عطا هوا تھا - ورنه همارے زمانے کے نو عمر اور خام مذاق حضرات تو ' Ptolmy ' کو پٹالمی لکھتے هیں اور اس پر فخر و مباهات کی بنیادیں اٹھاتے هیں - حالانکه اب سے صدیوں پہلے بزرگان عرب اس کو ' بطلیموس ' لکھ گئے هیں - همارے نو خیز علماے ادب کے علم و فضل کا یه عالم هے که اُن کو یه بھی معلوم نهیں که انگریزی میں اس کا صحیح تلفظ ٹالمی هے یا پٹالمی' اگر یه ' علم برداران ادب ' صرف اتنی زحمت گوارا فرماتے که کسی ڈکشنری کو کھول کر دیکھ لیتے تو وہ کم از کم اپنی انگریزی دانی کا پردہ نه کھلنے دیتے —

اسی طرح انگریزی میں Herschel ایک لفظ هے' جسکا تلفظ هرشل هے' مگر

دلدادگان تقلید کا مذاق گوارا نہیں کرتا کہ زبان کے کسی حرف کو بیکار رہنے دے اس لئے وہ اسکو ' ہر سہل ' بنالیتے ہیں - چنانچہ ' شارلمین ' کو چار میگن بنانا اور ' لین تین' کو ' لین تیگنی' دکھانا انہی کی شان تھہرکے شایاں اور انھی کی ہمت کے لائق ہے جو محض سرمائے کی بدولت ' سلطنت انشا و ادب' کو فتح کرنا چاہتے ہیں - جن بزرگوں نے ' Pharoah ' کی جگہ فرعون تراشا تھا' ان کا مذاق قابل تقلید تھا ' مگر ہمارا مبلغ علم بھی کچھ کم لائق تعریف نہیں ہے کہ انگریزی تلفظ اردو میں برتنا جزو ایمان سمجھتے ہیں اور فرعون کی جگہ پھیروھا ' اور ' موسیٰ' کی جگہ 'موزیز' لکھنا اپنے لئے ذریعۂ نجات خیال کرتے ہیں —

ہمارے نزدیک اس زمانے کے مترجم اور مؤلف حضرات کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ انگریزی اسمائے اشخاص کو لیں ' اس کا صحیح تلفظ معلوم کریں اور یہ دیکھیں کہ ہماری زبان کی نزاکت اس کی متحمل ہو سکتی ہے کہ نہیں - اگر ہو سکتی ہے تو اس کو اصلی صورت میں لے لیں' ورنہ قطع و برید میں سر مو تکلف نہ کریں - مثلاً ملٹن ' پوپ گرے ' جانسن' ٹینی سن' ولیم' واسن' کارلائل' گرین' میکالے ' چرچل ' سادھن ' ھکسلے' ریڈنگ ' ھلیر وغیرہ ایسے اسم ہیں کہ اردو میں آنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ' ان کے متعلق کسی قسم کی کد و کاوش کی ضرورت نہیں' ان کو بے تکلف اُن کی اصلی صورت میں لےسکتے ہیں —

(۲) اس کے بعد ایسے اسمائے اشخاص کا نمبر ہے جو حروف کے اعتبار سے ثقیل ہیں' مگر تلفظ کے لحاظ سے ثقیل نہیں ہیں ' اس لئے لازم ہے کہ اردو میں ان کو اس انداز سے لیا جائے کہ ثقل دور ہو جائے' مثلاً Vaghan (واگھن) نہایت ثقیل ہے مگر ' وان' ثقیل نہیں ہے اور یہی صحیح ہے - اسی طرح Pugh کا تلفظ 'پگھ' نہیں ہے بلکہ 'پیو' ہے - اس لئے اگر 'وان' اور 'پیو' کو لیا جائے تو ثقل بھی دور ہو جاتا ہے اور مترجم کا دامن سہو و خطا سے بھی

پاک ہو جاتا ہے ۔ زیلے ' ہرلے ' لیسٹر ' گلاسٹر ' ہیجیت وغیرہ بھی اسی قسم کے اسماے اشخاص ہیں کہ حروف کے اعتبار سے ثقیل اور تلفظ کے اعتبار سے لطیف ہیں —

(۳) اس کے بعد ایسے اسماے اشخاص کو لیجئے جن کے املا و تلفظ میں کچھ فرق نہیں ' مگر ہماری زبان کی نزاکت ان کے ثقل کے تحمل سے عاجز ہے ۔ مثلاً Aristotle اس کا تلفظ انگریزی میں بھی یہی ہے جو اس کے حروف سے ظاہر ہے ۔ اس میں جتنے حرف ہیں سب ضروری ہیں ۔ نہ کوئی زائد ہے نہ ساقط از آواز ' مگر اردو میں آنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ۔ یہاں تک کہ قدماے عرب نے بھی اس میں تصرف کیا اور اسے ارسطاطالیس بنالیا جو کم ہوتے ہوتے صرف ارسطو رہ گیا ۔ اب یہ اس قابل ہے کہ اردو میں بے تکلف برتا جاے اسی طرح Socrates (ساک - ری - ٹیز) کا ثقل ناقابل برداشت تھا ' مگر مذاق سلیم کا خدا بھلا کرے ' سقراط ' بناکر ہم پر اور ہماری زبان پر احسان کردیا ۔ اسی طرح Daniel کا صحیح تلفظ (ڈے ۔ نی ۔ ال) تھا جو ذرا سے تصرف سے دانیال بن گیا ۔ قدماے عرب نے جوزف ' جونز اور جیکب کو یوسف ' یونس اور یعقوب بنالیا تھا ' مگر واے برحال ما کہ اپنی شے غیروں سے لیتے ہیں اور اس انداز سے لیتے ہیں کہ اُنھی کا عطیہ معلوم ہوتا ہے —

اس باب میں ہمارے زمانے کے مترجم اور مؤلف حضرات کا فرض ہے کہ اپنے اجتہاد سے کام لیں اور قطع و برید کرکے الفاظ کو اس قدر لطیف کرلیں کہ ہماری زبان پر بار نہ ہوں ۔ مثلاً لیبالت ' یا لیبولت ثقیل ہے ' لیبال بنالیجئے ' ثقل دور ہوجاے گا ' لفظ زبانوں پر پھسلنے لگیگا اور اس انداز میں آجائیگا کہ گویا خالص اُردو زبان کا لفظ ہے ۔ اسی طرح لب فنتز کو لب فز بنا لیجئے کہ ثقل سے نجات ملے —

اس مقام پر یہ احتمال ہے کہ کہیں یورپ نواز حضرات کی طرف سے یہ اعتراض نہ ہو کہ جرمنی اور فرانسیسی وغیرہ کی اکثر کتابوں کے ترجمے انگریزی میں شائع ہوتے ہیں، اُن میں اسمائے اشخاص میں کسی قسم کا تصرف روا نہیں رکھا جاتا بلکہ اُن کو بے کم و کاست اُسی طرح ہدیۂ ناظرین کردیا جاتا ہے، جس طرح اصلی زبانوں میں لکھے جاتے ہیں۔ اس کے جواب میں ہم اُن حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرتے ہیں کہ اُن زبانوں میں اور اُردو میں ایک گونہ فرق ہے۔ وہ سب زبانیں رومی حروف میں لکھی جاتی ہیں، ان کا رسم خط ایک ہے، اس کے برعکس اُردو کا رسم خط ان سے مختلف ہے، وہاں ایک زبان کی تقلید دوسری میں ممکن ہے، یہاں ممکن نہیں ہے۔ اُردو، فارسی، اور عربی کا رسم خط قریب قریب ایک ہے، اس لئے کہ یہ سب کی سب زبانیں عبرانی حرفوں میں لکھی جاتی ہیں۔ جب عربی یا فارسی کی کسی کتاب کا ترجمہ اُردو میں کیا جاتا ہے تو اسمائے اشخاص کے باب میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی، جس طرح وہ عربی فارسی وغیرہ میں لکھے جاتے ہیں، اسی طرح اُردو میں حوالۂ قلم کردیے جاتے ہیں۔ مثلاً عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم وغیرہ اُردو میں بجنسہ اسی طرح لکھے جاتے ہیں، جس طرح عربی میں لکھے جاتے ہیں لیکن انہی کو رومی حروف میں لکھئے اور 'ال' کو ساقط نہ کیجئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اسی طرح فارسی کے الفاظ 'خود' و 'خویش' وغیرہ کو لیجئے اور واو معدولہ کو قائم رکھنے کی کوشش کیجئے، ایک آن واحد میں آپ کے علم و فضل کی قلعی کُھل جائیگی —

(ب) اسمائے مقامات

(الف) ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ 'روزیٹا' کیا ہے اور 'ڈیمیٹا' کہاں ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ 'رشید' کیا ہے اور 'دمیاط' کس کو کہتے ہیں۔ حالانکہ 'روزیٹا' اور 'ڈیمیٹا' انہی دونوں کی خرابی ہے

جب کوئی یورپین بزرگ 'مصر' کا جغرافیہ لکھنے بیٹھے ہونگے تو 'رشیدہ' پر ان کی نظر پڑی ہوگی' اس کو انھوں نے اپنی زبان کی نزاکت پر ایک گونہ بار محسوس کیا ہوگا اور اسے 'رشیت' یا 'رشیتّ' بنا لیا ہوگا اس کے بعد رزیتّ اور روزیتّ ہوا ہوگا' اس کے بعد روزیٹا ہوگیا ہوگا' جو اب رائج ہے۔ یہی مصیبت 'دمیاط' پر نازل ہوئی ہوگی کہ بالآخر ڈیمیٹا ہوکر رہ گیا۔ جب کوئی ہندوستانی بزرگ (ہندو یا مسلمان) جغرافیہ لکھنے بیٹھے ہونگے تو اُن کے سامنے ضرور کوئی انگریزی تصنیف ہوگی' اس میں دیکھا ہوگا کہ Rosetta لکھا ہے' اٹھایا اور 'روزیٹا' لکھدیا۔ اگر یہ بزرگ ذراسی سعی و کوشش سے کام لیتے اور مصر کا نقشہ اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا فرماتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ دریاے نیل کے دہانے پر روزیٹا نہیں ہے' رشیدہ ہے۔ اسی طرح ڈیمیٹا نہیں بلکہ 'دمیاط' ہے۔ مگر اتنی زحمت کون اٹھاے۔ یہ تو اسماے معرفہ ہیں' ان میں کد و کاوش لغو اور تحقیق و تدقیق لا یعنی ہے۔ مکھی پر مکھی ماردی اور کام چلا لیا' مگر کیا یہ بزرگ تصنیف و تالیف کی اہم ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گئے! کیا یہ حضرات اپنے فرض منصبی سے عہدہ برا ہو سکے' کیا علوم و فنون پر ان کا کوئی احسان ہے' کیا ہماری زبان اُن کی ممنونِ منت ہے؟ نہیں نہیں' ہرگز نہیں۔ بلکہ آئندہ نسلوں کی سہولت پسندی اور بد مذاقی کی تمام تر ذمہ داری انھی ناقص التعلیم مصنفوں اور انھی غیر ذمہ دار مؤلفوں کی گردن پر ہے —

اسی طرح عربی داں حضرات جانتے ہیں کہ 'اسود' کے معنی سیاہ فام کے ہیں' اسی سے لفظ سودان بنا ہے' جو ملک حبش کا دوسرا نام ہے۔ انگریزی میں ڈال کی آواز کہاں کہ صحیح تلفظ ادا کرتی' اس لئے سوڈان ہو گیا۔ انگریزی سے ردو میں آیا' مگر ڈال ساتھ لایا۔ اس وقت اردو کے کسی اخبار یا کسی رسالے کو

اٹھا کر دیکھئے ' سوڈان ' ملایا - ' سوداں ' کا کہیں ذکر نہ آئے گا - کیا اسی کا نام تحقیق ہے؟ کیا اسی کو اجتہاد کہتے ہیں ؟ کیا نام نہاد مؤلفوں اور مترجموں کا یہی فرض ہے کہ انگریزی کی ماسیانہ اور سوقیانہ تقلید کریں اور جو کچھ وہاں پائیں وہی اپنے ہاں لے آئیں ؟

گزشتہ جنگ عظیم میں ' کنٹارہ ' اس قدر مشہور ہو گیا تھا کہ ہندوستان کا کوئی اخبار اس سے خالی نہ تھا - اس کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی ہے کہ عربی سے اسے کوئی نسبت نہیں معلوم ہوتی - دماغ محو حیرت تھا کہ اس میں (ٹ) کہاں سے آ گئی - اتفاق حسنہ سے ارض مقدس جانا ہوا تو ایک اسٹیشن پر جلی حرفوں میں لکھا دیکھا " قنطرة الخیر " اب سمجھ میں آیا کہ ' کنٹارہ ' اسی قنطرہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے - انگریزی میں حروف (ق) و (ط) کی آواز کہاں کہ صحیح تلفظ ادا کرتی - مجبوراً Kantara لکھنا پڑا - جب ہمارے اخبار نویس حضرات کی صحت پسند نگاہیں اس پر پڑیں تو (K) اور (ٹ) کو موجود پایا - اب کیا شے مانع تھی کہ وہ اس کو کنٹارہ نہ بنالیتے اور ان کے روز افزوں مشاغل انہیں اتنی اجازت کہاں دیتے ہیں کہ کم و بیش تحقیق کر لیتے کہ اصل زبان میں وہ لفظ کیا ہوگا جو انگریزی میں کنٹارہ کی صورت میں جلوہ گر ہے - بعینسہ یہی افتاد لفظ 'قط' پر پڑی کہ رفتہ رفتہ کوٹ ہو کر رہ گیا ہے —

اب تک تو ہم نے اُن اسماے مقامات پر ایک نظر ڈالی ہے جو کسی زمانے میں ہمارے تھے - مگر اب غیروں کے قبضے میں ہیں اور غیروں کی وساطت سے ہم تک پہنچے ہیں - اب ہم ایسے اسماے مقامات پر غور کرتے ہیں جو غیروں کے ہیں اور غیروں کی وساطت سے ہم تک پہنچے ہیں - اگرچہ توقع تو نہیں ہے کہ ہمارے تقلید پرست حضرات اس باب میں کسی قسم کے تصرت کی تکلیف گوارا فرمائیں گے ؛ اس لئے کہ جب خود اپنے گھر کے الفاظ کے متعلق ان کی سرد مہری کا یہ عالم ہے تو غیروں کے الفاظ کے متعلق کیا کچھ نہ ہوگا —

(ب) جن بزرگوں کی آنکھیں عربی ادب سے روشن ھیں اور جن کے مطالعے میں مصری اخبار رھتے ھیں، وہ جانتے کہ Mar-seilles کا فصیح تلفظ کیا ھے اور Brussels کو کیا لکھتے ھیں، مگر ھمارے ابنائے وطن اُن کو جب لکھتے ھیں، مارسلیز اور برسلز لکھتےھیں؛ مارسیل اور بروسیل کے پاس نہیں پھٹکتے، اس لئے کہ یہ جاھلوں اور نا اھلوں کا شیوہ ھے۔ مگر دیکھنا یہ ھے کہ اردو میں آنے اور زبانوں پر پھسلنے کی صلاحیت کن میں ھے اور کس کے ثقل سے زبان کی نزاکت ابا کرتی ھے۔ اس کے علاوہ ھمارے صورت پرست حضرات اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیتے ھیں کہ خواہ کتنی ھی کوشش کی جائے مگر اردو داں حضرات ان کا صحیح تلفظ کبھی ادا نہ کریں گے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ھماری زبان ان کا صحیح تلفظ ضبط تحریر میں لانے سے قاصر ھے، بلکہ یہ الفاظ اپنی اصلی صورت میں کچھ اس قدر ثقیل واقع ھوئےھیں کہ ھمارے گلے کی ساخت انھیں مشکل سے گوارا کرتی ھے۔ جن لوگوں کو انگریزی میں شدبد ھے وہ تو اس کا صحیح تلفظ ادا کرنا سیکھ جاتے ھیں، باقی حضرات کو ایک گونہ تکلف ھوگا۔ وہ ان کے صحیح اعراب پر غور نہ کریں گے بلکہ اپنے انداز میں مارسلیز اور برسلز کہنے لگیں گے۔ اس لئے صورت پسند اشخاص کی یہ کوشش رائگاں جائے گی کہ اسمائے مقامات میں کوئی حرف ایسا نہ رھنے پائے کہ اردو میں نہ آجائے۔ بڑھتے بڑھتے یہ لے یہاں تک ترقی کر گئی ھے کہ ھندوستان کے حدود کے اندر بھی اپنے الفاظ اپنے انداز میں نہیں لکھے جاتے، بلکہ انگریزی سے مستعار لئے جاتے ھیں۔ ھندوستان میں جہلم ایک مشہور دریا ھے، اس کے کنارے پر ایک خوبصورت شہر ھے، صاحب بہادر کی نوک قلم نے اس کو Ghelum لکھدیا؛ اب کیا تھا، ھمارے صورت پرست حضرات کو ایک موقع مل گیا، وہ بھی جھیلم لکھنے اور بولنے لگے۔ اسی طرح مچھلی پٹم سے مسولی پٹم اور

ماھوری سے مسوری بنگیا۔ یہی افتاد سپاٹو پر پڑی ھوگی کہ ھوتے ھوتے 'سو بیٹھو' ھو کر رہ گیا۔ خدا کا شکر ھے کہ دھلی اس تصرف سے اب تک محفوظ ھے ' اگر چند روز یہی حال رھا تو وہ وقت دور نہیں کہ یہ عروس البلاد بھی ڈیلھی ھو جاے گی۔ اور تو اور جب تک حیدرآباد میں قدم نہ رکھا تھا ' اس وقت تک یہ نہ معلوم تھا کہ تلنگی بھی کوئی زبان ھے۔ Telugo کو دیکھا تھا ' اسی کو جانتے تھے' یہ خبر نہ تھی کہ تلوگو تلنگی کی آفت رسیدہ صورت ھے —

آج کل بعض اصحاب کو خالص سنسکرت الفاظ کے احیا کا شوق دامنگیر ھے۔ مگرا ھم ان کی خدمت میں نہایت ھی ادب و احترام سے التماس کرتے ھیں کہ اردو اور سنسکرت میں فرق ھے ' سنسکرت ماں ھے اردو اس کی بیٹی ھے ' سنسکرت ایک ضعیف اور سن رسیدہ خاتون ھے ' اردو ایک نو خیز نو نہال ھے ' مگر اس کے باوجود بھی ماں ماں ھے' بیٹی بیٹی ھے ' آج کل بیٹی کا وجود ماں کے وجود پر مبنی نہیں ھے ' یہ بیٹی کے ارتقا اور اس کے نشو و نما کا دور ھے ' ماں کی ترقی کا زمانہ گذر چکا ھے ' اس زمانے میں بیٹی کو اختیار ھے کہ جس طرح چاھے قدم اٹھاے اور جو رستہ چاھے اپنے لئے اختیار کرے۔ سنسکرت میں ان الفاظ کا تلفظ یہی ھو گا جو ھمارے بعض اھل وطن لکھتے اور استعمال کرتے ھیں ' مگر اردو میں جن الفاظ نے ڈھل ڈھلا کر خاص صورت اختیار کرلی ھے وہ یونہی رھنی چاھیے' اس میں کسی قسم کا تصرف نہ ھونا چاھیے۔ ایسے بیشمار لفظ ھیں جو سنسکرت سے آئے ھیں' مگر اردو میں اس طرح نہیں بولے جاتے جس طرح خالص سنسکرت میں بولے جاتے تھے' ایسے الفاظ کو آج کل خالص اردو الفاظ سمجھنا چاھیے ' سنسکرت نہ سمجھنا چاھئے۔ فہرست ملاحظہ ھو :

(۱) ھندی الفاظ : گھر (گرہ) گھڑا (گھٹ) اُجلا (اُجل) آدھا (آردھ) اندھیرا (اندھکار) آسرا (آشرے) آنکھ (اکھی) آگے (اگر) انگلی (اگرہ) پانی

(پانڑی) برھمن (براھمنز) اور تمام اعداد جو اردو میں رائج ھیں۔ اسی طرح عربی کے اکثر الفاظ ھیں کہ اردو میں غلط طور پر استعمال کئے جاتے ھیں، عربی داں حضرات اُن کو دیکھہ کر ناک بھوں چڑھاتے ھیں اور ھم پر علم کی کمی کا الزام لگاتے ھیں - ھم ان کی خدمت میں بھی وھی التماس کرتے ھیں' جو برادران وطن کی خدمت میں کر چکے ھیں کہ جس صورت میں وہ مستعمل ھیں اسی میں رھنے دیں، ان میں تصرف نہ فرمائیں' اس لئے کہ وہ اردو الفاظ ھیں عربی نہیں ھیں۔ مثالیں ملاحظہ ھوں :

(۲) عربی الفاظ : غش (غشی) مسلمان (مسلم) مصافہ (مصفہ) زیادتی (زیادت) سلامتی (سلامت) ھدیہ (ھدیّہ) مغیلان (ام غیلان) مدارا (مداوات) وغیرہ۔

(۳) عربی الفاظ جو فارسی میں غلط طور پر مروج ھیں :
صم و بکم (اصم و ابکم)، حور (حوراء)، ابدال (بدیل)، فضولی (فضول)، حضوری (حضور)، قران (قرآن)، مشاطہ (مشّاطہ)، مواسا (مواسات)، مفاجا (مفاجات) وغیرہ۔

(۴) غیر زبانوں کے الفاظ جو انگریزی میں غلط طور پر برتے جاتے ھیں :

کیلف	Caliph	خلیفہ	سیپاے	Sepoy	سپاھی
ایڈمرل	Admiral	امیرالبحر	ڈرے گو مین	Dragoman	ترجمان
مگزین	Magazine	مخزن	ٹے رف	Tarif	تعریف
کاٹن	Cotton	قطن	پے - رے - ڈائز	Paradise	فردوس(پردیس)
جے کال	Jackal	شغال	کے - رے - ون	Caravan	کاروان
شوگر	Sugar	شکر	ڈیس - پاٹ	Despot	داس پتی
آٹومن	Ottoman	عثمان	مناریٹ	Minaret	منارہ
کرمزن	Crimson	قرمزی			

سائس	Syce	سائیس	سے - ڈان	Maidan	میدان
چٹ	Chit	چٹھی	چیرول	Cheerool	چڑیل

(۵) انگریزی الفاظ جو اردو میں غلط بولے جاتے ہیں :

لاٹ ، جرنیل ، کرنیل ، کپتان ، لفٹین ، سارجن ، پلٹن ، رفل ، کانجی ہوز ، کارتوس ، توس ، اردلی ، ڈپٹی ، گارڈ ، میم ، اجیٹن ، جنوری ، فروری ، مارچ ، اپریل ، مئی ، جولائی ، اگست ، ستمبر ، اکتوبر ، دسمبر ، فراش بین ، رس بھری ، پلٹس ، پنسل ، پنشن ، اسٹیشن ، انڈرینس ، مڈل ، کمیٹی ، پتلون ، برجس ، واس کٹ ، کرکٹ ، توایہ ، بسکٹ ، کونین ، کوکین ، دریس ، ساٹن ، بوتل ، دراز ، بگل یا بکل ، لال ٹین ، پوٹاس ، تھیٹر ، سنتری ، پکٹ ، مسکوٹ ، سکتر ، کھان افسر —

(۶) غیر ملکی مقامات ، جن میں ہم تصرف کرتے ہیں : روس ، روم ، امریکہ ، افریقہ ، لندن ، قرطبہ ، اشبیلیہ ، قبرس ، غرناطہ ، قسطنطنیہ ، ادرنہ ، انگورہ ، درۂ دانیال —

(۷) غیر ملکی اشخاص کے نام ، جن میں تصرف کیا گیا ہے : ارسطو ، افلاطون ، فلاطون ، سکندر ، اسکندر ، بطلیموس ، قیصر ، بقراط ، سقراط ، جالینوس ، طامس ، فرادریق ، طالیس ، فیلقوس ، پلاطس ، مرقس ، مریم ، متی ، وغیرہ —

الفاظ سازی اور ازالۂ ثقل کے لئے " وضع اصطلاحات " بہترین تصنیف ہے ، جو اُستاذی حضرت مولانا سلیم مرحوم کی مساعی جمیلہ کے ذریعے عالم وجود میں آئی ہے ۔ اس کی تقلید کیجئے ، ذوق سلیم خود بخود پیدا ہوجائیگا —

(ج) ہمارے نزدیک اُس شخص کا مذاق قابل پرستش تھا ، جس نے انگلینڈ کے لئے ' انگلستان ' تراشا تھا ۔ یہ لفظ اس قابل تھا کہ اس کی تقلید کی جاتی اور جن ملکوں کے اخیر میں ' لینڈ ' ہے اُن سب کا ترجمہ " ستان " سے کیا جاتا ، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کی تقلید نہ کی گئی اور اس کے

وزن پر اور اور الفاظ نہ بنائے گئے ' خیر اب بھی کچھہ نہیں گیا ' اگر ارباب ذوق چاھیں تو یورپ کے اکثر ثقیل الفاظ کو لطیف بنا کر اپنی زبان اور ادب پر احسان کرسکتے ھیں - مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اسکاٹ لینڈ کے باشندے ' اسکاچ ' کہلاتے ھیں ' اس سے ' اسکا چستان - بنالیں ' اسی طرح ' پولینڈ ' کا نام ' پولستان ' اور ھالینڈ کا ' ھالستان ' رکھہ لیں - سوئٹزرلینڈ بذات خود جس قدر خوبصورت اور خوش وضع ملک ھے ' نام اسی قدر ثقیل اور بدنما ھے ' اگر اس سے " سوئستان " بنالیا جاے تو کیا مضائقہ ھے ' اس لئے کہ وھاں کے باشندوں اور اُس ملک کی ساختہ چیزوں کو سوئس کہتے ھیں —

اسماے نکرہ

اسماے نکرہ کے متعلق کچھہ زیادہ کد و کاش کی ضرورت نہیں ' لغت کی کتابیں اور الفاظ کی فرھنگیں موجود ھیں ' اکثر الفاظ کا ترجمہ ھوچکا ھے ' جو باقی ھیں ان کے لئے نئے نئے لفظ تراشے جارھے ھیں ' الفاظ تراشی اور اصطلاح سازی کے اصول منضبط ھوچکے ھیں - ان کی مدد سے ما و شما سب لوگ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق الفاظ تراش سکتے ھیں - رستے کے نشیب و فراز دور ھوچکے ھیں ' اب صرف ھمت مردانہ کی ضرورت ھے کہ اس ھموار اور سیدھے رستے میں گام زن ھو اور منزل مقصود تک پہنچ جاے - آج کل مترجم حضرات کا فرض صرف اس قدر ھے کہ کسی مستند لغت کی اوراق گردانی کی تکلیف گوارا فرمائیں اور لفظ کے مقابلے میں لفظ رکھہ دیں ' اس سے زیادہ سعی و کوشش کی ضرورت نہیں - مگر اتنی بات ضرور ھے کہ جوھر قابلیت موجود ھو اور جو صاحب تالیف و ترجمہ پر اپنی ھمت صرف فرمائیں وہ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کے ماھر ھوں ' اور فرھنگ و لغات میں سے وھی لفظ انتخاب کریں جو سہاق کے

لحاظ سے موزوں اور سباق کے اعتبار سے مناسب ہو۔ اگر اس جوہر میں کمی ہو تو لازم ہے کہ یہ حضرات اپنی زبان و قلم کو اُردو کی خدمت سے روک لیں اور کسی اور مفید اور کار آمد شعبے کی طرف توجہ مبذول کریں' جو ان کی شان کے شایان اور ان کے مرتبے کے لائق ہو ' ورنہ اُن بزرگوں کی مساعی جمیلہ کا ستیاناس ہوجائیگا جنھوں نے سالہا سال کی کد و کاوش اور مدت‌العمر کے غور و فکر کے بعد ایسے پاکیزہ اور لطیف الفاظ تراشے ہیں۔ جیسے شہ‌پارے ' اور 'اخبار پارے ' عادلہ اور مقننہ' حزنیہ اور طربیہ وغیرہ' اس لئے کہ استفادے کا یہ اصول اعظم ہے کہ مستفید اور مستفاد دونوں قریب‌السطح ہوں' یعنی شاگرد کا دماغ اس حد تک نشو و نما پاچکا ہو کہ وہ استاد کے اسرار و نکات کی کُنہ تک پہنچ سکے اور ان اسرار و معارت کو اپنے اندر جذب کرلے ' جو استاد اس کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ اگر استاد ہمائے گرم پرواز ہوگا اور شاگرد خرلنگ تو نتیجہ جو کچھ نکلے گا وہ ظاہر ہے۔ یہی باعث ہے کہ اکثر نو مشق اور خام مذاق بزرگ زادے اُن الفاظ و اصطلاحات کو ٹھیک طور پر استعمال بھی نہیں کرسکتے جو بزرگان ادب کی جانکاہ کوششوں کے طفیل ہم تک پہنچے ہیں ۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ انگریزی میں ایک لفظ Line ہے' اردو میں اسے لائن بھی کہتے ہیں اور لین بھی بول جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فیلن کی ڈکشنری میں اس کے معنی حسب ذیل ہیں :

(۱) رسی ' ڈور ' دھاگہ (۲) لکیر ' خط ' دھاری' ریکھا ' جدول ' کشش

(۳) [ریاضی] خط ' لکیر ' ریکھا (۴) حد ' مینڈ

(۵) جھری ' شکن ' خط و خال ' مکھ ریکھا

Though on his brow were graven lines austere (Byron)

اگرچہ اس کے چہرے پر جھریاں پڑگئی تھیں ۔

(۶) قطار ' صف ' پنکتی آلی باڑ لنگ۔

Unite thy forces and attack their lines

اپنی فوج فراہم کر کے ان کی صف پر حملہ کرو

(۷) (فن طباعت) سطر - (۸) رقعہ، پرچہ (۹) (اصطلاح شاعری) مصرع، سطر، پد

(۱۰) ڈھنگ - طور - طریقہ - راستہ - پیشہ - (۱۱) نسل - سلسلہ - بنساولی،

خاندان - گھرانا (۱۲) (جغرافیہ) خط ارضی، مثل خط استوا وغیرہ -

(۱۳) جریب - (۱۴) (فوجی اصطلاح) پیدل - (۱۵) کھائی - خندق - مورچہ -

(۱۶) انچ کا بارھواں حصہ - سوت - (۱۷) (اصطلاح موسیقی) پردہ -

(۱۸) (ریلوے کی اصطلاح) لوہے کی پٹری - لیک، سڑک (۱۹) نقشہ، خاکہ

(۲۰) (مثنیات) سیدھ - درست - (۲۱) تک - سلسلہ - ڈھنگ -

تم کیا کام کرتے ہو -	What line are you in
صف جنگ	Line of Battle
خط حسن، روپ ریکھا	Line of beauty
سطر	Line of writing
رات دن کی برابر لکیریں	Equinoctical lines
خط نصف النہار	Meridian line
جنگی جہاز	Ships of lines

(نوٹ: خط کشیدہ الفاظ اردو میں مستعمل نہیں ہیں)

ایک معمولی سی ڈکشنری میں ایک لفظ کے اس قدر مترادفات موجود ہیں - اب اس امر کا انحصار مترجم کے علم و فضل پر ہے کہ ان میں سے وہی لفظ انتخاب کرے جو سیاق و سباق کے اعتبار سے بہترین ہو - دنیا میں ایسی کوئی قوت نہیں جو غلط انتخاب کے وقت مترجم کا قلم روک لے اور اس کو صراط مستقیم سے منحرف نہ ہونے دے - اگر کوئی شخص 'صف' کی جگہ 'سطر' منتخب کرلے تو اس کا کیا علاج - مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ انگریزی

میں ایک فقرہ ہے کہ Milton stands in the front line of poets اگر کوئی صاحب کمال اور با مذاق بزرگ اس کا ترجمہ اس طرح فرمائیں کہ ملٹن شاعروں کی پہلی سطر میں کھڑا ہے، تو اُن کے ذوق و کمال کی نسبت کیا رائے قائم کی جائے گی ؟ حالانکہ اسی قسم کی لغزشیں ہیں جن پر 'روح تنقید' کے فرعمر اور نامور مصنف ناز کرتے ہیں اور اسی قبیل کی فروگزاشتیں ہیں، جن پر آپ فخر و مباہات کی بنیادیں اُٹھاتے ہیں۔

(۲) اس کے بعد ایسے سمائے فکرہ کا نمبر ہے جن کا ترجمہ اب تک اردو میں نہیں ہوا ہے۔ ایسے الفاظ کے متعلق انجمن ترقی اردو اور جامعۂ عثمانیہ کی سرگرم کوششوں سے توقع ہے کہ وہ اس کمی کو جلد از جلد پورا کردے گی، لیکن جب تک یہ کمی پوری نہ ہو اس وقت تک ، وضع اصطلاحات ، بہترین استاد رہبر اور کامل ترین رہنما ہرلنگ ، اس کے اصول کی تقلید کریں اور ذوق سلیم کے موافق الفاظ تراشیں اور خاص جب کسی لفظ کا صحیح مفہوم معلوم ہو جاتا ہے تو لفظ تراشی اور اصطلاح سازی کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔ مشکل صرف اس وقت تک ہوتا ہے جس وقت تک دماغ اس کے صحیح مفہوم سے خالی ہوتا ہے اور چشم و گوش اس سے آشنا نہیں ہوتے۔ مثلاً دوران مطالعہ میں ایک لفظ (Telepathy) نظر پڑا۔ پہلے یہ لفظ نہ آنکھوں نے دیکھا تھا، نہ کانوں نے سنا تھا۔ اس کے مفہوم سے دماغ آشنا ہوتا تو کیوں کر اور معنی معلوم ہوتے تو کیسے ؟ بہر کیف ڈکشنری اُٹھائی ، اوراق گردانی کی تکلیف گوارا کی ، دماغ پر زور دیا ، غور اور توجہ سے مطالعہ کیا ، یہاں تک کہ دماغ اس کے صحیح مفہوم کی کنہ تک پہنچ گیا ؛ اسی وقت اس کے لئے مندرجۂ ذیل الفاظ تراش لئے :

(۱) قلبی پیغام رسانی (۲) قلبی خبر رسانی (۳) دماغی پیغام رسانی
(۴) دماغی خبر رسانی (۵) ذہنی پیغام رسانی (۶) ذہنی خبر رسانی
(۷) غیبی پیغام رسانی (۸) غیبی خبر رسانی —

اسی طرح پڑھتے پڑھتے ایک اور لفظ [* Subjective) mind)] نظر سے گذرا' یہ پرانا لفظ ہے' بچپن سے پڑھتے چلے آئے ہیں' لفظی معنی معلوم ہیں' مگر اصطلاح کے معنی سمجھنے سے دماغ قاصر ہے' ڈکشنری دیکھی' پیاس نہ بجھی' احباب و آشنا سے دریافت کیا' تسلی نہ ہوی - مجبوراً اس خاص صنف کی کتابیں شروع کیں' وہاں اس کی تعریف یہ دیکھی کہ (Subjective mind) حصول معلومات کے لئے Objective mind کا محتاج نہیں ہے - اس کے ذرائع معلومات لاتعداد و لانحصی ہیں - اب کیا تھا' ایک نکتہ ہاتھ آگیا Subjective mind کا ترجمہ ' نفس باطن' اور Objective mind کا ' نفس ظاہر' کردیا اور کام چلا لیا - بالکل یہی کیفیت لفظ Suggestion کی ہوئی' اس کے لئے لفظ تحریک بنالیا ــ

جب گردش تقدیر سے حیدرآباد (دکن) جانا ہوا تو مولانا (سلیم) مرحوم سے ذکر آیا' آپ نے ویبسٹر اٹھائی' اشتقاق معلوم کیااور سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے Telepathy کے لئے ' دور پھٹک' دور پھٹکی' دوربیماری اور بالآخر دورتشخیصی' دور تعلقی فرمایا اور نفس باطن اور نفس ظاہر کی جگہ نفسی شعوری اور نفس زیرشعوری تجویز کئے' اس لئے کہ اس صورت میں انگریزی سے تعلق قائم رہتا ہے اور ' ظاہر و باطن' کی پیروی سے اس میں فرق آجاتا ہے - اور اسی اصول پر آپ نے 'وضع اصطلاحات' میں بہت زور دیا ہے - ہمارے نزدیک مولانا مرحوم کے 'سہقلادی' اصول کی تقلید اس وقت ہونی چاہئے جب روزمرہ کے معمولی اور سیدھے سادے لفظوں سے کام نہ چلے' اور غیرمعروف اور نا مانوس لفظ اس وقت برتے جائیں' جب معروف اور مانوس الفاظ نہ ملیں - دیرینہ تعلقات اور شب و روز کی صحبتوں کے باوجود بھی ' نزدیکنا' اور ' بعیدنا' کاٹے کھاتے ہیں --

---

* Suggestion کامعروضی اور Objective ، کاموضوعی ' Subjective ' اتیٹر
کا اثر آفرینی ترجمہ کیا گیا ہے ــ

اس امر میں سر مو شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ مولانا مرحوم علم کے پتلے اور ادب کے مجسمے تھے - ان کا دماغ معلومات کا خزانہ تھا - الفاظ تراشی اور اصطلاح سازی میں آپ کو خاص ملکہ تھا - اور یہی ملکہ تھا کہ بڑھتے بڑھتے ' مانئے ' کی حد تک پہنچ گیا تھا جس کا نتیجہ ' قریبنا ' اور ' اطفانا ' جیسے ثقیل اور غیر ضروری الفاظ میں نظر آتا تھا ' لیکن اس علم و کمال اس قدر معلومات کے باجود بھی آپ انسان تھے - آپ کا دماغ محدود تھا ' آپ کا دل محدود تھا ' آپ کے قوا محدود تھے ' غرض آپ کے قبضۂ قدرت میں جو کچھ تھا ' وہ سب محدود تھا - اندریں حالات ایک شخص واحد سے یہ کیوں کر توقع ہو سکتی ہے کہ دنیا کے تمام علوم و فنون پر اس کا احاطہ ہو - جو کچھ ہو ' اس کی نظر میں ہو ' کوئی بات اس سے پوشیدہ اور کوئی شے اس سے چھپی نہ ہو - وہ ہر علم کا مطالعہ بطور خود کرے اور ہر فن کی اصطلاحوں کو سمجھے اور ان کے لیے الفاظ تراشے - یہ تو نا ممکن ہے اور سرا سر نا ممکن' نہ آج تک کسی سے ہوسکا ہے نہ کبھی ہو سکے گا - اس لئے بہترین طریقہ وہی ہے جو مولانا مرحوم نے ایجاد فرمایا ہے - یعنی ڈکشنری کھول کے دیکھ لیں اور سبقلاحی اصطلاحیں گھڑ لیں - لیکن ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ہماری قوم میں ایک سلیم نہیں سیکڑوں سلیم ہوں ' بلکہ ہر شخص سلیم ہو کہ پہلے بطور خود غور و فکر کی داد دے ' پھر مولانا مرحوم کے اصول سے مدد لے —

(۳) اس کے بعد ان اسمائے نکرہ پر غور کرنا ہے جو اردو میں آ چکے ہیں - مثلاً بوٹ - کالر - ٹائی - اسٹشین - اسکول - کالج - سگریٹ - سگار - سوڈا وغیرہ - ان کے متعلق کسی قسم کی کد و کاوش کی ضرورت نہیں - جس طرح یہ الفاظ اردومیں بولے جاتے ہیں' اسی طرح استعمال ہونے چاہئیں - اس حالت میں انہیں اردو کے الفاظ سمجھنا چاہیے غیر نہ سمجھنا چاہیے - مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ موٹر کے لئے عربی میں سیارہ اور ہوائی

جہاز کے لئے طیارہ وضع کئے گئے ہیں - لفظ خرب ہیں مگر اردو میں رائج نہیں ہیں - اس لئے موٹر کے استعمال میں مضائقہ نہیں - ہوائی جہاز ہمارے گھر کا لفظ ہے، اس کا تو کیا کہنا! ان کو چھوڑنا اور سیارہ اور طیارہ استعمال کرنا اردو کو عربی کا جامہ پہنانا اور اپنی چیز چھوڑ کر اغیار کے آگے ہاتھ پھیلانا ہے - مگر اتنی بات ضرور ہے کہ اس قبیل کے الفاظ میں انگریزی تلفظ کی تقلید جائز نہیں، ان کو اسی صورت میں برتنا لازم ہے؛ جس صورت میں وہ اردو میں آئے ہیں —

مقام حیرت ہے کہ ایک طرف تو ہمارے انگریزی‌داں حضرات اس امر کے دلدادہ ہیں کہ انگریزی الفاظ کا صحیح تلفظ بے کم و کاست محفوظ رہنا چاہیے اور دوسری طرف صراط مستقیم سے اس قدر منحرف ہیں کہ 'رستوران' کو ریستورانت بناتے ہیں اور اس طرح اپنی لیاقت و قابلیت کی داد دیتے ہیں - اگر یہ بزرگوار ذرا بھی تحقیق و تدقیق سے کام لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ فرانسیسی لفظ ہے؛ جہاں 'ت' کا نام اور نقل کا نشان نہیں - اس لحاظ سے اس کا تلفظ 'رستورانت' ہونا چاہیے تھا - مگر حرف اخیر بھی ساقط الصوت ہے - اس لئے یہ لفظ 'رستوران' رہ گیا - اسی طرح یہ لفظ عربی، مصری وغیرہ میں لکھا جاتا ہے اور اسی طرح اہل زبان حضرات کی زبان سے سنا گیا ہے —

اب سوال یہ ہے کہ انگریزی میں (ن) اور (ت) کیوں قائم ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ انگریزی میں نہ 'ت' ہے نہ نون غنہ - انگریز کریں تو کیا کریں اور بولیں تو کس طرح بولیں - مجبوراً انہیں 'رستوران' کہنا پڑا -

ہمارے گلے سے یہ دونوں آوازیں ادا ہو سکتی ہیں - اس واسطے ہمارے لئے کونسی مجبوری ہے، ہم آسانی سے 'رستوراں' کہہ سکتے ہیں - کیا وجہ ہے کہ ہم انگریزی مجبوریوں کی بھی تقلید کریں اور اس پر اپنی طرف سے بھرنڈا اضافہ بھی فرمائیں - اسی طرح انگریزی میں ایک لفظ Seignior آتا ہے - یہ لاطینی

زبان کا لفظ ہے ، اس کا صحیح تلفظ سینڈیر ہے ' مگر اکثر اخباروں اور رسالوں میں سکندور دیکھا جاتا ہے ، خدا جانے ہمارے فاضل مترجموں اور بے بدل مؤلفوں کو یہ تلفظ کہاں سے معلوم ہو گیا ۔ خرافات یونانی میں (Atlas) کرہ بردار دیوتا کا نام ہے ۔ اسی مناسبت سے مجموعۂ خارطات کو بھی (Atlas) کہنے لگے ہیں – قدمائے عرب اس کو اطلس لکھتے چلے آئے ہیں ' مگر ہمارے علم و فضل نے اس کو بھی اٹلس بنا لیا ہے —

(۳) اسمائے نکرہ کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ بعض اوقات اسمائے معرفہ ' اسمائے نکرہ کے طور پر برتے جاتے ہیں اور ان سے وہی معنی مراد لئے جاتے ہیں جو اسمائے نکرہ کی ذات میں مضمر ہوتے ہیں۔ اس صورت میں اسمائے معرفہ نہیں ہوتے بلکہ حقیقت میں اسمائے صفات ہوتے ہیں مثلاً ملٹن انگلستان کا ہومر ہے ' یہاں ہومر سے اعلیٰ درجے کا رزم نگار شاعر مراد ہے ۔ یا مولانا حالی مرحوم ہندوستان کے سعدی ہیں ۔ اس میں سعدی کے معنی ہیں ۔ وہ تمام اوصاف و صفات جن میں مولانا موصوف سعدی سے مشابہ تھے —

اس کی دو صورتیں ہیں ۔ صورت اول تو یہ ہے کہ مشبہ بہ اس قدر مشہور و معروف ہو کہ اردو داں حضرات اس سے واقف ہو چکے ہوں اور اپنے زمانۂ حیات میں جو کچھ اس نے کیا ہے ، اس سے کم و بیش ہمارے کان آشنا ہوں۔ ایسے اسمائے معرفہ کو لینے اور مشبہ بہ کے طور پر برتنے میں کچھ مضائقہ نہیں ' اگر کم و بیش شرح کردی جائے تو بہتر ہے ۔ ورنہ کچھ ضرورت نہیں ' جاننے والے جان لیں گے اور پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر اس کا وہی اثر مرتب ہو جائے گا جو مترجم اور مؤلف حضرات کرنا چاہتے ہیں ۔ صورت ثانی یہ ہے کہ مشبہ بہ غیر معروف اور نامانوس ہے ۔ نہ ہم اس کی ذات و صفات سے واقف ہیں ، نہ ہمارے کان اس کے کار ناموں سے آشنا ہیں ، نہ ہم نے اس کے متعلق

کچھہ پڑھا ہے ' نہ کسی نے اس کے متعلق کچھہ لکھا ہے - اس صورت میں شرح اور تفصیل لازم ہے ' اس کے بغیر ترجمہ ترجمہ نہ رہے گا ' بلکہ مہمل اور بے معنی الفاظ کا گورکھہ دھندا بن جاے گا - مثلاً مولانا حالی ہندوستان کے کار دوشی تھے - یہاں کاردوشی محتاج تشریح ہے - اس کے علاوہ ایک اور صورت ہے ' وہ یہ ہے کہ بعض اوقات مشبہ بہ بالکل اجنبی اور غیر مانوس ہوتا ہے اس صورت میں تصرف کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے - مثلاً To out Zola Zola کے یہ معنی ہونگے ' زولائیت میں زولا کو مات کر دینا ' زولائیت میں زولا سے سبقت لے جانا ' وغیرہ - لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زولائیت اور زولا کے معنی کیا ہیں' اس لئے ان کی شرح کرنی چاہئے اور ذیلی نوٹ میں یہ بیان کرنا چاہئے کہ Zola (زولا) ایک فرانسیسی ناول نگارہے' جو سنہ ۱۸۴۰ ع میں پیدا ہوا تھا ' اس کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ جب لکھنے بیٹھتا ہے تو جائز و نا جائز کا خیال نہیں رکھتا ' جو چاہتا ہے لکھہ جاتا ہے اور جوکچھہ دماغ میں آتاہے' حوالۂ قرطاس کردیتاہے' اس کو اس امر سے کچھہ سروکار نہیں کہ پبلک کے دل ودماغ پر اس کا کیا اثر ہوگا اور پڑھنے والے اس سے کیا نتیجہ نکالیں گے - وہ واقعات زندگی کو لیتاہے اور ان کی عریاں اور پوست کندہ تصویر پبلک کے سامنے پیش کر دیتا ہے - اس کے نزدیک معیار صداقت یہی ہے کہ جو واقعہ پیش آے' بےکم وکاست بیان کردیا جاے اور گفتنی اور ناگفتنی باتوں میں کوئی امتیاز نہ کیا جاے - اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے ناول خلاف اخلاق اور حیاسوز مضامین کا مجموعہ ہو کر رہ گئے اور وہ مدعا فوت ہو گیا ' جس کے لئے یہ مفید اور کار آمد شے عالم وجود میں جلوہ گر ہوئی تھی -

اس قدر تشریح کرنے سے پڑھنے والوں کو معلوم ہوگا کہ زولا کے معنی ہیں "حیاسوز ناول نگار" اور زولائیت سے مراد ہے "خلاف اخلاق تصنیف و تالیف"- اب ان کی سمجھہ میں اس فقرے کے معنی بھی آجائیں گے کہ فلاں شخص نے زولائیت میں زولا کو مات کر دیا ہے' یعنی فلاں شخص فحش نویسی میں بڑے سے بڑے فحش نویس سے بڑھ گیا ہے ' یا اس نے

کو کائیت میں کو کا پنڈت کو نیچا دکھا دیا ہے -

Collectiv· Nouns اسمائے مجموعہ

خدا کا شکر ہے کہ آج تک ایسی کوئی لغزش نظر سے نہیں گذری' جو اس باب میں ہمارے مترجم حضرات سے ظہور میں آئی ہو. بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ اس باب میں انگریزی اور اردو دونوں ہم آہنگ ہیں' دونوں میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے' یہاں انگریزی کی عامیانہ تقلید بھی نبھہ جاتی ہے - مگر اسی کی ایک شق ہے جسے Noun of multitude کہتے ہیں - اس میں البتہ ہمارے مترجموں سے لغزش ہو جاتی ہے - مثلاً انگریزی میں لفظ کمیٹی مفرد بھی ہے اور جمع بھی - جب مفرد ہے تو Collective اسم مجموعہ کہلاتا ہے اور جب جمع ہے تو Noun of multitude نام پاتا ہے - مگر اردو میں یہ لفظ ہمیشہ مفرد بولا جاتا ہے' کبھی جمع کے طور پر نہیں برتا جاتا - یہی باعث ہے کہ ہماری گرامر میں کوئی اصطلاح ایسی نہیں ہے جو Noun of multitude کا مفہوم ادا کر سکے اور یہی باعث ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی - جب لفظ کمیٹی مفرد ہوتا ہے تو اس طرح برتا جاتا ہے کہ The Committee is sitting یعنی کمیٹی اجلاس کر رہی ہے' یا کمیٹی کا اجلاس ہو رہا ہے' وغیرہ —

اور جب جمع ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں: The Committee is divided in their opinion یعنی ارکان کمیٹی کی رائے میں اختلاف تھا' کمیٹی کے ممبر مختلف الرائے تھے — مگر یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ کمیٹی اپنی رائے میں مختلف تھے' یا پولیس میرے پیچھے پڑ گئے ہیں' یا پارلیمنٹ اجلاس کر رہے ہیں' وغیرہ وغیرہ — اس صورت میں ہم مجبور ہیں کہ ترجمے میں تصرف سے کام لیں اور لفظ 'ارکان' اپنی طرف سے بڑھائیں —

Material Nouns اسماے مادہ

اس باب میں کسی مبسوط بحث کی ضرورت نہیں، جو جو اصول اسماے نکرہ کے متعلق عرض کئے گئے ہیں، وہی یہاں بھی قابل اطلاق ہیں - ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ الفاظ کو اُردو میں اس انداز سے برتا جاے کہ ان کا وجود ہماری زبان کی نزاکت پر بار نہ ہو اور اس کا ثقل اس حد تک دور کیا جاے کہ خالص اُردو الفاظ معلوم ہوں، مثلاً انگریزی میں ایک لفظ Tin ہے، اُردو میں اسے ٹین بولنے لگے ہیں - اس لئے اسے ٹین ہی لکھنا چاہئے، ٹِن نہ لکھنا چاہئے - اسی طرح Canister (کین - اسٹر) کو اُردو میں کنستر بنا لیا ہے، اس صورت میں اسے خالص اُردو زبان کا لفظ سمجھنا چاہئے —

اسماے مادہ کا استعمال زیادہ‌تر علوم طبیعی، صنعت و حرفت اور تجارت میں ہوتا ہے - اس لئے ان علوم و فنون کے مترجم حضرات کا فرض ہے کہ اپنے گوشۂ عزلت سے باہر آنے کی تکلیف اٹھائیں، صنعتی کارخانوں اور تجارتی کوٹھیوں میں جائیں اور یہ معلوم کریں کہ ہمارے ہندوستانی صناع اور مزدور خالص عامی الفاظ کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور بڑے بڑے شاندار لفظوں کو روزمرہ کی سیدھی سادی اور بے تکلف زبان میں کیوں کر برتتے ہیں، ان حضرات کو چاہئے کہ اُن الفاظ کو لیں، اُن میں اپنے مذاق کے موافق کم و بیش تصرف کریں اور اُردو میں بے تکلف برتنے لگیں - یہ اُردو زبان کی ساخت اور ترکیب کے لحاظ سے بہترین الفاظ ثابت ہونگے —

اس باب میں یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اکثر چھوٹے چھوٹے اور خوبصورت الفاظ انھی صناعوں، مزدوروں اور تاجروں کے دماغ کا اختراع ہیں - اِس باب میں ہماری زبان ماہران علوم کی شرمندۂ احسان نہیں ہے - مثلاً 'فلے نل' کو فلالین اور 'لین ٹرن' کو لال ٹین بنانا انھی کے دماغوں کا کام ہے، جو غرور علم سے

عاری ہوں۔ انگریزی میں ایک کپڑے کا نام سیٹن ہے، عام لوگوں نے ساٹن اور دلی والوں نے نرمد بنا لیا۔ اسی طرح ہزاروں لفظ ہیں کہ بے علم اور ناخواندہ لوگوں نے زبان میں شامل کردیے ہیں اور اس انداز سے شامل کردئیے ہیں کہ کہیں حرف گیری اور نکتہ چینی کی گنجائش نہیں۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ کام ایسے ہی لوگوں کا ہے جن کے دل و دماغ قیود علمی سے آزاد ہوں، خواہ یہ آزادی جہالت اور نادانی کے باعث ہو، یا اس کا راز تبحر علمی میں مضمر ہو۔ یعنی یا تو انسان نوشت و خواند سے بالکل بے بہرہ ہو، یا اس کا علم و کمال اس حد تک ترقی کرگیا ہو، جہاں جہالت اور تعلیم دونوں ایک نقطے پر جمع ہوجاتی ہیں۔ جو لوگ ان دونوں حالتوں کے بین بین نظر آتے ہیں، وہ تعصب اور پاس داری کا شکار ہوتے ہیں، ان سے نہ آج تک کوئی جدت ظہور میں آئی ہے نہ آئندہ آنے کی توقع ہے —

اس مقام پر یہ عرض کرنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے زمانے کے لغت نویس اور فرہنگ نگار حضرات کا یہ فرض ہونا چاہئیے کہ صناعوں، تاجروں، پیشہ وروں اور مزدوروں تک رسائی حاصل کریں اور ان کے پیشوں اور صنعتوں کی جزئیات معلوم کریں۔ اگر یہ علم دوست حضرات یہ تکلیف گوارا فرمائیں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ کسی پیشے میں کوئی جز ایسا نہیں ہے جس کے لئے کوئی نہ کوئی نام موجود نہ ہو۔ مثلاً کسی بڑھئی کے پاس جائیے اور میز، کرسی یا کواڑ، کڑی کے اجزا دریافت فرمائیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سینکڑوں الفاظ ہیں جو وہ برتتا ہے اور جن سے روز مرہ کے کاروبار میں مدد لیتا ہے۔ اسی طرح درزی، لُہار اور سنار وغیرہ کی دربار داری کیجئے اور نوعمر اور نادار زبان کو سرمایہ دار بنائیے۔ اگر یہ جد و جہد آپ اپنے دوش ہمت پر لینگے اور اصلی و حقیقی معنی میں کد و کاوش کی داد دینگے تو کسی معترض کی یہ مجال نہ ہوگی کہ آپ کی زبان کو بے مایہ اور غیر علمی زبان کہہ سکے۔ امید ہے کہ انجمن ترقی اردو کے

ذی‌علم اور فرض شناس ارکان اس بارعظیم‌کو اپنے دوش همت پر لینگے زبان اور محبان زبان‌کو ممنون منت فرمائینگے - همارے نزدیک اس علم پرور اور اُردونوازانجمن کا سب سے زیادہ اهم فرض یہ ہے کہ وہ اُردو میں کوئی ایسی کتاب تصنیف فرمائے جیسی انگریزی میں H. W. Fowler کی Dictionary of Modern English Usage ہے -

اس لئے کہ یہ کام اس قدر اهم اور مهتم بالشان ہے کہ کسی شخص واحد کی مساعی جمیلہ سے اس کی انجام دهی ممکن نہیں - اس کے لئے لازم ہےکہ پرستاران اردو میں سے بہترین دل و دماغ اس طرف توجہ فرمائیں اور هر لفظ اور هر محاورے کی تحقیق و تدقیق میں سعی و کوشش کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کریں اور اس طرح اپنے نوجوان اور نومشق انشاپردازوں کی هدایت و رهنمائی کا سامان بهم پہنچائیں - اور اس تیرہ و تار رستے میں شمع هدایت روشن کریں' تاکہ عامی اور ادبی کام کرنے والے حضرات اندھیرے میں سر ٹکراتے نہ پھریں بلکہ اس شمع هدایت‌کی روشنی میں منزل مقصودتک پہنچ جائیں- اگر انجمن‌مذکور کی توجہ سے کوئی ایسی تصنیف عالم وجود میں آگئی تو هماری زبان رهتی دنیا تک اس کا احسان نہ بھولیگی' بلکہ قیامت تک اس کی‌توصیف و ثناکے راگ گائیگی-

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ انگریزی میں ایک لفظ ہے ' Any ' بچہ بچہ جانتا ہے کہ اردو میں اس کا مرادف ' کوئی ' ہے - مگر یہ دونوں لفظ ایک دوسرے پر بالکل منطبق نہیں هوتے - بلکہ ایک مقام ایسا بھی آجاتا ہے جہاں ان کی حدیں الگ هو جاتی هیں' یعنی انگریزی میں لفظ ' Any ' واحد اور جمع دونوں میں برتا جا سکتا ہے ' مگر اردو میں لفظ ' کوئی ' صرف واحد کے لئے مخصوص ہے جمع میں نہیں آ سکتا - مثلاً انگریزی میں آسانی سے کہہ سکتے هیں کہ Have you got any books on history مگر اردو میں هم‌یہ نہیں کہہ سکتےکہ"کیا آپ کے پاس تاریخ کی ' کوئی ' کتابیں هیں" - بلکہ یوں کہہ سکتے هیں کہ "کیاآپ‌کے

پاس تاریخ کی "کوئی" کتاب ہے "یا آپ کے پاس تاریخ کی کچھ کتابیں ہیں ؟"
اگر ہمارے نوجوان اردو نواز حضرات کو یہ نکتہ معلوم ہوتا تو ان کے قلم سے یہ فقرہ نہ نکلتا کہ " اس انتخاب میں قدیم طرز کے اشعار میں نے درج نہیں کئے ہیں اگر کوئی ملیں تو مجھے معاف کیجئے " - یہاں ہونا چاہئے " اگر کوئی ملے تو مجھے معاف کیجئے" -

اسی طرح حقدار اور مستحق میں ایک خاص فرق ہے ' جو نظر انداز نہ ہونا چاہئے۔ہم اپنے والدین کے ترکے کے حقدار اور بزرگان قوم کی ہمدردی کے مستحق ہیں۔

——(۲) نا خواندہ اور عوام النّاس کی عملی خدمت کے نمونے)——

اگر ہمارے اردو پرور ' حضرات اپنے کاشانۂ ' عزلت سے نکل کر باہر تشریف لائینگے اور کسی فوج کی بارکوں میں جانے کی تکلیف گوارا فرمائینگے تو ان کو معلوم ہوگا کہ معمولی اور ناخواندہ سپاہی Officer Commanding کو کپتان افسر اور Adjutant کو اجیٹن کہتے ہیں ' اسی طرح Barrack کو ' بارک ' اور Sappers & Miners کو ' سفرمینا ' بولتے ہیں - جن بزرگوں کی آنکھیں عربی اور فارسی سے روشن ہیں ' ان کو معلوم ہوگا کہ عربی اور فارسی اخباروں میں ' مانورہ ' اور ' موزہ جیسے خوبصورت اور لطیف الفاظ لکھے جاتے ہیں - ہمارے نزدیک یہ الفاظ اسی قدر سبک اور خوشگوار ہیں جس قدر Manouvre اور Museum ثقیل اور ناگوار ہیں —

تذکیر و تانیث

اردو میں صرف دو جنسیں ہیں ' ایک ' مذکر ' دوسری ' مؤنث ' - ہمارے یہاں ایسی کوئی جنس نہیں جسے ' مخنث ' کہا جائے اور جس سے مردہ اور بے جان چیزوں کے اظہار میں مدد لی جائے - اس کے نہ ہونے سے اردو میں اس قدر دقتیں اور دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں کہ ان سے عہدہ برا ہونا قوت بشری سے

بالا تر ہے - اس باب میں اس قدر اختلاف ہیں کہ اتحاد و اتفاق کسی طرح ممکن نہیں - ایک لفظ ہے کہ دلی میں مذکر اور لکھنؤ میں مؤنث بولا جا تا ہے - دوسرا ہے کہ لکھنؤ میں مذکر اور دلی میں مؤنث استعمال ہو تا ہے - یہ دونوں زبان کے مرکز ہیں ' دور افتادہ لوگ حیران ہیں کہ کس کی تقلید کریں اور کس کی نہ کریں - ہمارے نزدیک اس باب میں ان دونوں کا فرض ہے کہ وسیع النظری اور کشادہ دلی سے کام لیں اور ایک دوسرے کو حق بہ جانب سمجھیں - اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آ تا جس کا مذاق مسلمہ طور پر قابل تقلید ہو اور جس کے سامنے تمام ادیب اور انشا پرداز حضرات سر تسلیم خم کر دیں اور اس کے اجتہاد سے منحرف نہ ہوں - ایسے بزرگوں میں سب سے اخیر مولانا ' حالی ' مرحوم و مغفور تھے ' چنانچہ آپ کا ارادہ بھی تھا کہ اس صنف پر قلم اٹھائیں اور اپنے خیالات حوالۂ قرطاس فرمائیں ' مگر افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی ' ورنہ خدا جانے اس باب میں کیا کیا نکات و معارف عالم وجود میں جلوہ گر ہو تے ' جن کو مرحوم اپنے ساتھ قبر میں لے گئے - اندریں حالات مترجم اور مؤلف حضرات کا فرض ہے کہ وہ حتی الامکان دلی یا لکھنؤ میں سے کسی کی تقلید کریں اور اتنی احتیاط برتیں کہ جن الفاظ کی تذکیر و تانیث متفق علیہ ہے ' اُن میں انگریزی کی تقلید کرکے اپنی زبان میں غلطیوں کا اضافہ نہ فرمائیں - مثلاً انگریزی میں Ship مؤنث ہے ' اردو میں جہاز مذکر ہے - اس لئے ترجمے میں انگریزی کی تقلید نہ کرنی چاہئے بلکہ اردو کی پیروی روا رکھنی چاہئے - اس کے متعلق افعال و صفات جس قدر ہیں وہ سب مذکر ہوں ' کسی حالت میں بھی مؤنث نہ ہوں - بجنسہ کیفیت لفظ Moon کی ہے کہ انگریزی میں مؤنث اور اردو میں مذکر ہے - یہاں بھی اردو کی تقلید لازم ہے —

جانوروں میں تذکیر و تانیث اصلی ہوتی ہے اور نر کے مقابلے میں مادہ اور

مادہ کے مقابل نر موجود ہوتا ہے - مگر اردو میں کبھی صرف نر بولا جاتا ہے ' مادہ نہیں بولا جاتا اور کبھی مادہ بولا جاتا ہے نر حذف کردیا جاتا ہے - مثلاً چیل مؤنث ہے اور کوا مذکر ؛ چیلا اور کوی مستعمل نہیں ہیں - اسی طرح اردو میں لومڑی مؤنث ہے مگر انگریزی میں Fox مذکر ہے ' ایسے موقع پر اردو کی تقلید کرنی چاہئے خواہ مخواہ اور بے ضرورت لومڑ نہ تراشنا چاہئے —

بسا اوقات فصحاے انگلستان مردہ اور بے جان چیزوں سے اس طرح خطاب کرتے ہیں کہ گویا وہ زندہ اور صاحب حیات ہستیاں ہیں - اور اس حالت میں انہیں ' مخنث ' نہیں رہنے دیتے - بلکہ حسب موقع مذکر یا مؤنث بنا لیتے ہیں - مثلاً اے موت ! اے خواب ! یہ انداز بیان بعض اوقات اُردو کے خلاف ہوتا ہے - اس حالت میں بھی اُردو کی تقلید فرض ہے ' مثلاً انگریزی میں موت مذکر ہے ' اس کے افعال و صفات سب مذکر آئیں گے ' مگر اُردو میں موت مؤنث ہے ' اس کے متعلقات بھی مؤنث ہوں گے - اسی طرح ' خواب ' اور اس کے متعلقات مذکر اور ' نیند ' اور اس کے متعلقات مؤنث ہوں گے —

Number (واحد و جمع)

اُردو میں دو قسم کی جمعیں مستعمل ہیں (۱) فاعلی اور (۲) غیر فاعلی یا مغیری —

(۱) جمع فاعلی وہ ہے جس کے بعد حروف مغیرہ میں سے کوئی حرف نہیں ہوتا -

(۲) جمع غیر فاعلی یا جمع مغیری وہ ہے ' جس کے اخیر میں حروف مغیرہ میں سے کوئی حرف ہوتا ہے —

(نوٹ حروف مغیرہ ہیں : میں ' سے ' تک ' (تلک) پر ' پہ ' کا ' نے کی ' کو ' وغیرہ)

—— (جمع فاعلی بنانے کے طریقے) ——

جمع فاعلی بنانے سے پہلے (۱) یہ دیکھنا لازم ہے کہ وہ لفظ مذکر ہے یا مونث جس کی جمع بنانی مقصود ہے —

(۲) اگر وہ لفظ مذکر ہے تو یہ دیکھنا فرض ہے کہ اس کے اخیر میں الف ہے کہ نہیں۔

(۱) اگر الف ہے تو ساقط ہوجائے گا اور اس کی جگہ یائے مجہول (ے) کا اضافہ کردیا جائے گا۔ مثلاً لڑکا، لڑکے، بیٹا، بیٹے —

(۲) اگر اخیر میں الف نہیں ہے بلکہ کوئی اور حرف ہے تو وہ لفظ اپنی اصلی صورت پر قائم رہے گا، اس میں کوئی تصرف نہ کیا جائےگا۔ مثلاً: گھر، مکان، پتھر، درخت، آلو، صندوق وغیرہ وغیرہ۔

نوٹ: اس قبیل کے الفاظ واحد اور جمع میں یکساں رہتے ہیں، اُن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی - یہی باعث ہے کہ ان میں کم و بیش ابہام ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ ابہام صرف الفاظ تک محدود رہتا ہے، فقرات میں باقی نہیں رہتا - اس میں کچھ شک نہیں کہ مکان، کے لفظ سے بادی النظر میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ واحد ہے یا جمع، مگر اسی کو فقرے میں استعمال کیجئے پھر دیکھیے کہ ابہام باقی رہتا ہے کہ نہیں۔ مثلاً 'مکان بنا' اس فقرے میں 'مکان' واحد ہے - اور 'مکان بنے' اس میں جمع، اس ابہام کا ازالہ کبھی افعال و صفات کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی اعداد و ضمائر کے ذریعے - مثلاً ایک مکان واحد ہے، دو مکان جمع؛ اچھا گھر واحد اور اچھے مکان جمع، آپ کا مکان واحد اور آپ کے مکان جمع —

اس باب میں ہمارے نو مشق اور خام مذاق حضرات عربی اور فارسی کی کورانہ تقلید کیا کرتے ہیں اور اسموں کی جمع 'ان' یا 'ین' سے لاتے ہیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں: انتظامیہ کمیٹی کے دس ممبران موجود تھے، یا قدیم مورخین لکھتے ہیں - یہاں جمع کی قطعاً ضرورت نہیں - ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ انتظامیہ کمیٹی کے دس ممبر موجود تھے، اور قدیم مورخ لکھتے ہیں —

ہمارے نزدیک اب وقت آ گیا ہے کہ اس قسم کی ترکیبوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے اور اردو کو اس انداز کے فضول اور غیر ضروری تصرف سے آزاد کیا جائے۔ ایک دفعہ ایک نو عمر صاحبزادے نے ایک فقرہ لکھا کہ اسٹشین پر پندرہ ' صنادیق ' پڑے تھے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ ' صنادیق ' کی کیا ضرورت ہے کیا ' صندوق ' کافی نہیں ہے۔ فرمانے لگے کہ انگریزی میں Boxes جمع ہے ' اس کے مقابلے میں اردو میں بھی ' صنادیق ' چاہیے ' صندوق نہ چاہیے اس لئے کہ جمع کے مقابلے میں واحد لانا دیانت اور امانت کا منہ کالا کرنا ہے؛

(ب) اگر وہ لفظ مؤنث ہے (جس کی جمع بنانی مقصود ہے) تو (ا) یہ دیکھنا لازم ہے کہ اس کے اخیر میں یائے معروف (ی) ہے کہ نہیں ' اگر (ی) ہے تو جمع ' اں ' سے بنیگی مثلاً بیٹی سے بیٹیاں ' لڑکی سے لڑکیاں—

اس صنف میں بھی قدرے حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض حضرات ایسے الفاظ کی جمع اکثر ' یں ' سے اڑا جاتے ہیں- مثلاً (ا) کر-ہیں لا ؤ ' اور ' جو تہتں ' پہنو —

اس مقام پر یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ صورت میں مؤنث اور حقیقت میں مذکر ہیں- یعنی ان کے اخیر میں یائے معروف موجود ہے مگر وہ مؤنث نہیں ہیں مذکر ہیں۔ مثلاً موتی ' پانی ' گھی ' دہی ' ہاتھی ' جی ' منشی ' آدمی ' قاضی وغیرہ وغیرہ۔ ان الفاظ کی جمع (اں) نہ آنی چاہیے۔ بلکہ جمع کی صورت میں بھی ان کو ان کی اصلی حالت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ مثلاً ہاتھی آ یا ' ہاتھی آئے وغیرہ۔ موتی کی جگہہ ' موتیاں ' لکھنا سرا سر غلط ہے —

(۲) اگر اُس لفظ کے اخیر میں ' ی ' نہیں ہے (جس کی جمع بنانی مقصود ہے) تو ' یں ' کا اضافہ کیا جائے گا۔ مثلاً میز کی جمع میزیں اور عورت کی جمع ' عورتیں ' ہو گی —

جمع غیر فاعلی

جمع کی دوسری صورت جمع غیر فاعلی یا جمع مغیری ہے - اس کی علامت ہمیشہ (وں) ہوتی ہے - مثلاً گھر کی جمع 'گھروں' مکان کی 'مکانوں' دکان کی 'دکانوں' لڑکی کی 'لڑکیوں' اور میز کی میزوں آے گی - اتنی بات ضرور ہے کہ جب واحد مذکر کے اخیر میں الف ہو گا تو گر جاے گا - مثلاً 'لڑکا' سے 'لڑکوں' بیٹا' سے 'بیٹوں' وغیرہ —

اس قسم کے الفاظ کی جمع اکثر 'حضرات' 'ان' سے لاتے ہیں' مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ یہ مقدمہ تین 'ججان' کے اجلاس میں پیش ہو گا - ہمارے نزدیک وہ بزرگ بھی حق بہ جانب نہیں ہیں جو 'وں' کی جگہہ 'ین' سے جمع مغیرہ بنا جاتے ہیں - مثلاً مورخین نے لکھا ہے اور مدبرین کا قول ہے - اگر مورخین' اور مدبرین' کی جگہہ مورخوں' اور مدبروں' کہا جاے تو زیادہ وضع اور زیادہ فصیح ہو گا - ہمارے نزدیک یہ امر نہایت اہم اور ضروری ہے کہ جمع بنانے کے عربی اور فارسی انداز صرف عربی اور فارسی ترکیبوں تک محدود رکھے جائیں - خالص اردو ترکیبوں میں نہ برتے جائیں - مثلاً شعران ہند اور شعراے فارس' نہایت عمدہ ترکیبیں ہیں - مگر ہندوستان کے شاعران' اور فارس کے شعراء' ثقیل اور ناگوار ہیں —

ان کے علاوہ جمع بنانے کے اور بھی اکثر قاعدے ہیں کہ عربی میں رائج ہیں مگر ہمارے موضوع سے خارج ہیں' اس لئے نظر انداز کئے جاتے ہیں - لیکن مترجم اور مؤلف حضرات سے اس قدر التجا کی جاتی ہے کہ یہ دیکھہ لیں کہ عربی کی جو جمع اردو میں استعمال کرنی مقصود ہے' وہ اردو میں رائج ہے کہ نہیں - اگر رائج ہے تو اس کے استعمال میں کچھہ مضائقہ نہیں' اگر رائج نہیں تو یہ دیکھنا فرض ہے کہ وہ اردو میں رائج ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے

کہ نہیں - اگر اس کی ذات میں یہ صلاحیت مضمر پائیں تو بے تکلف لے آئیں ورنہ پرہیز فرمائیں - مثلاً تام کی جمع 'تیجان' اور نار کی جمع 'نیران' ہے - مگر یہ نہ اردو میں آئی ہیں نہ آنے کی صلاحیت رکھتی ہیں' ان سے حذر لازم ہے —

انگریزی میں اکثر الفاظ ہیں کہ جمع میں برتے جاتے ہیں لیکن اردو میں ان کے مرادف الفاظ واحد کے طور پر مستعمل ہیں' اس صورت میں بھی اردو کی پابندی لازم ہے - انگریزی کی تقلید ضروری نہیں ہے - مثلاً Siessors جمع ہے اور قینچی واحد' اسی طرح Trousers جمع ہے اور پاجامہ واحد -

بعض اوقات انگریزی الفاظ واحد اور جمع مختلف معنوں میں استعمال ہوتے ہیں' یعنی کسی لفظ کے واحد میں جو معنی ہوتے ہیں وہ جمع میں باقی نہیں رہتے' بلکہ اس سے بالکل مختلف ہوجاتے ہیں - ایسی صورت میں مترجم حضرات کا فرض ہے کہ سیاق و سباق سے بصیرت حاصل کریں اور جمع کے وہی معنی لیں جو انگریزی میں لئے جاتے ہیں - واحد پر قیاس کر کے سہو و خطا کا ارتکاب نہ فرمائیں - مثلاً .Good کے معنی ہیں : اچھا اور عمدہ وغیرہ - مگر Goods میں کہیں عمدگی کا شائبہ تک نہیں' اس کے معنی ہیں : مال و اسباب - اسی طرح Return کے معنی ہیں : 'واپسی' اور Returns کے معنی : اعداد و شمار - اس لئے Returning Officer کا ترجمہ ہونا چاہیے: افسر انتخاب - مگر ہمارے اخباری مترجم حضرات کرتے ہیں : افسر واپسی -

مزید الفاظ کی فہرست

جمع			واحد		
اطلاع	"	Advices	نصیحت	"	Adivce
فوج	"	Forces	قوت	"	Force
خیال دماغ	"	Vapours	بخار	"	Vapour

Vesper	"	شام	Vespers	"	مناجات شام
Arm	"	بازو	Arms	"	اسلحہ

اس سے زیادہ حزم و احتیاط کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے، جہاں واحد کے صرف ایک معنی ہوتے ہیں اور جمع کے ایک سے زیادہ-ان میں سے پہلے معنی واحد سے مشتق ہوتے ہیں، مگر دوسرے مشتق نہیں ہوتے ۔ فہرست ملاحظہ ہو :

واحد	معنی	جمع	(۱) معنی قریب	معنی بعید
Effect	اثر	Effects	اثرات (۱)	(۲) اثاثہ
Pain	تکلیف	Pains	تکالیف (۱)	(۲) مصائب یعنی حزم و احتیاط
Custom	رسم و رواج	Customs	رسم و رواج (۱)	(۲) محصول درآمد
Number	عدد	Numbers	اعداد (۱)	(۲) نظم
Part	حصہ	Parts	حصے (۱)	(۲) قابلیت
Manner	طریقہ	Manners	طریقے (۱)	(۲) اوضاع و اطوار
Premise	قضیہ	Premises	قضایا قضیے (۱)	(۲) عمارات
Spectacle	نظارہ	Spectacles	نظارے (۱)	(۲) چشمہ، عینک

بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے معنی واحد میں بھی ایک سے زیادہ ہوتے ہیں اور جمع میں بھی - مثلاً :

1. Letter خط (۲) حرف (۱) | Letters (۱) حروف (۲) خطوط (۳) ادب
2. Ground سبب (۲) زمین (۱) | Grounds (۱) باغ (۲) سبب (۳) تلچھٹ

انگریزی میں بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے واحد میں دو معنی ہوتے ہیں مگر جمع میں صرف ایک رہ جاتے ہیں، مثلاً واحد میں Horse کے معنی ہیں (۱) گھوڑا (۲) سوار - جمع میں سوار گر جاتے ہیں ' گھوڑے رہ جاتے ہیں - فہرست ملاحظہ ہو :

واحد		جمع	
1. Horse	(۱) گھوڑا (۲) رسالہ	Horses	(۱) گھوڑے
2. Foot	(۱) پاؤں (۲) پیدل فوج	Feet	(۱) پاؤں
3. Practice	(۱) مشق (۲) کام، پیشہ	Practices	(۱) مشقیں
4. People	(۱) قوم (۲) لوگ	Peoples	(۱) اقوام - قومیں
5. Powder	(۱) سفوف (۲) بارود	Powders	(۱) سفوف
6. Light	(۱) روشنی (۲) چراغ	Lights	(۱) چراغ
7. Wood	(۱) لکڑی (۲) جنگل	Woods	(۱) جنگل

نوٹ، لفظ Compass کے واحد میں دو معنی ہیں (۱) حلقہ (۲) قطب نما اور جمع میں صرف ایک معنی پر کار۔ انگریزی میں بعض الفاظ صورتاً جمع ہوتے ہیں مگر معناً واحد۔ ایسے الفاظ میں معنی کی تقلید لازم ہوتی ہے، صورت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مثلاً Summons کا ترجمہ سمن یا طلبی نامہ ہونا چاہئے۔ یہی حال Riches اور Alms کا ہے۔ ان کا ترجمہ دولت اور خیرات ہونا چاہئے اسی قبیل کا ایک لفظ ہے ' Eaves ' اس کا ترجمہ انگریزی انداز بیان کا متحمل ہو سکتا ہے، اس لئے اس کا ترجمہ ' اولتیاں ' کرنا محاورے اور روز مرہ کے خلاف نہ ہوگا —

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کا تعلق محض لفظوں بلکہ چند اسموں سے ہے۔ اگر کوئی صاحب ذوق و فرصت بزرگ اس طرف توجہ فرمائیں تو دیگر اصناف کلام پر بھی اسی طرح نظر ڈال سکتے ہیں۔ اور اپنے اولوالعزم نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے شمع ہدایت روشن کر سکتے ہیں ہم تو صرف نحو کے متعلق ایک اصول بیان کر کے اس کو ختم کرتے ہیں —

اتنی بات ہر تعلیم یافتہ شخص جانتا ہے کہ انگریزی انداز بیان کی دو صورتیں ہیں۔ ایک Direct اور دوسری Indirect مگر ہمارے اکثر تعلیم یافتہ

حضرات اس نکتے سے بے خبر ہیں کہ اردو میں صرف ایک انداز بیان ہے اور وہ Direct ہے Indirect کا کہیں نام نہیں۔ اس لئے مترجم اور مؤلف حضرات سے درخواست کی جاتی ہے کہ جب کہیں Indirect انداز بیان پائیں اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہ فرمائیں بلکہ پہلے اس میں تبدیلی کرلیں پھر قلم اٹھائیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

Indirect	Direct	ترجمہ
Akber says that he is ill	Akber says "I am ill".	اکبر کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں
Akber said that he was ill.	Akber said "I am ill"	اکبر نے کہا کہ میں بیمار ہوں
Hamid told me that I was ill.	Hamid said to me "I am ill"	حامد نے مجھ سے کہا کہ میں بیمار ہوں
Hamid said that he was ill.	Hamid said "I am ill"	حامد نے کہا کہ میں بیمار ہوں۔
Hamid told him that he (zahid) was ill.	Hamid said to him (zahid) "you are ill"	حامد نے زاہد سے کہا کہ تم بیمار ہو۔
Hamid told me that I was ill.	Hamid said to me "you are ill"	حامد نے مجھ سے کہا کہ تم بیمار ہو
Abid said that he did not know that man.	Abid said "I do not know this man"	عابد نے کہا کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا
Abid said that there was no need to go just then	Abid said "There is no need to go just now"	عابد نے کہا کہ ابھی جانے کی ضرورت نہیں ہے
Abid said that this book was his.	Abid said "This book is mine".	عابد نے کہا کہ یہ کتاب میری ہے
Abid asked me why I did not go home	Abid asked me why do you not go home"	عابد نے مجھ سے پوچھا کہ تم گھر کیوں نہیں گئے
Abid asked him whether the mangoes were ripe	Abid said to him "are the mongoes ripe"	عابد نے اس سے پوچھا کہ آم پکے ہیں (کہ نہیں)
The master demanded of the boys what they meant by such conduct"	The master said to the boys "what do you mean by such conduct"	ماسٹر نے لڑکوں سے پوچھا کہ اس رویے تمہارا مدعا کیا ہے۔
He enquired of him where he was going	He said to him "where are you going"	اس نے اس سے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو
He told him not to talk nonsense.	He said to him "Do not talk nonsense".	اس نے اس سے کہا کہ بیہودہ نہ بکو۔

Indirect	Direct	ترجمہ
He requested me to lend him my pen	He said to me " Lend your pen please "	اس نے مجھ سے کہا کہ مہربانی سے ذرا اپنا قلم دیدیجئے
He cried out what a disaster it was	He said " Good heavens! what a disaster "	اس نے کہا توبہ کیا مصیبت ہے -
Struck with awe he cried out what a disaster it was	"	"
He exclaimed that he wished he could see them	He said "O that I could see them"	اس نے کہا کہ کاش میں اُن کو دیکھ سکتا
The captive prayed that Heaven might hear his cry	The captive said " May Heaven hear my cry"	قیدی نے کہا کہ کاش خدا میری فریاد سن لے
The captive prayed Heaven to hear his cry.	"	"

:A G:

حافظ عبدالرحمٰن خاں 'احسان'

صمصام الدولہ شہامت جنگ دہلوی

[تاریخ پیدائش : سنہ ۱۱۸۳ ہجری تاریخ انتقال : سنہ ۱۲۶۷ ہجری]

از

(جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی - اے دہلوی)

بیس یا بائیس برس ہوئے جب شیکسپیر کی کسی کتاب میں پڑھا تھا :

for affection

Master of passion; sways it to the mood,

Of what it likes or loathes.

یعنی "جذبات انسانی وجدان طبیعت کے تابع ہیں - طبیعت اپنے منسب دلخواہ ان جذبات کو نفرت یا رغبت جدھر چاہے پھیر دیتی ہے" - "اس مقولے کا عملی ثبوت حافظ عبدالرحمٰن خاں 'احسان' کے حالات لکھنے میں مجھے اچھی طرح مل گیا - مدتوں سے ان کے دیوان دیکھنے کا شوق تھا - ذوق سے پہلے یہی لال قلعہ میں استاد تھے اور استاد بھی کیسے کہ جگت استاد۔ بادشاہ ان کے شاگرد، ولی عہد ان کے شاگرد، سارے شہزادے اور سلاطین زادے ان کے شاگرد - شاہ نصیر سے ان کے مقابلے ہوئے، ذوق سے ان کے مقابلے ہوئے، لیکن یہ ایک سے بھی نہ دبے - مرتے دم تک اسی دم خم سے مقابلے پر تلے رہے - خیر سنئے، مجھے ان کے دیوان کی تلاش تھی - دیوان کمیاب کیا نایاب ہے - لالہ سریرام صاحب دہلوی کے پاس ایک نسخہ تھا - اس تک پہنچ مشکل تھی - ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے معلوم ہوا کہ ایک

قلمی دیوان نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں ہے - کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچا - دیوان مانگا - یہ کسی کو کوئی قلمی کتاب نہیں دیتے' اور دینی بھی نہ چاہئے - کیونکہ ان کے ہاں کی ہزاروں کتابیں نصیب دشمناں ہوچکی ہیں - خدا معلوم مجھ پر کیا عنایت تھی کہ مانگتے ہی دیوان دے دیا - گھر پر لایا - نقل کر ڈالی - مگر بجائے بڑھنے کے جوش ٹھنڈا ہوکر رہ گیا - ہر قسم کے صنائع لفظی اور خاص کر رعایت لفظی سے مجھے کچھ للہی بغض ہے - ان کا سارے کا سارا دیوان اسی سے بھرا پڑا ہے - نقل تو کرلی مگر دل چھوٹ گیا یہ نقل یوں ہی ایک سال تک پڑی رہی - اب ایک دفعہ ہی خیال آیا کہ جب نقل کرنے کی محنت اٹھائی ہے تو لاؤ اس پر ایک مضمون ہی لکھ ڈالو - محرم کی چھٹیاں ہیں - لکھنے بیٹھ گیا ہوں - اگر خدا نے پورا کردیا تو شاید چھپ جائے - نہیں تو جہاں دیوان کی نقل کھتے میں پڑی ہے وہیں یہ ادھورا مضمون بھی پڑا رہے گا —

حالات لکھنے سے پہلے میں ان دیوانوں کا کچھ ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جن کو میں نے خود دیکھا ہے یا جن کا 'احسان' کے حالات کی تلاش میں مجھے پتہ چلا ہے - ایک نسخہ تو وہ ہے جو نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں ہے اور دوسرا نسخہ 'احسان' کے نواسے آغا حیدر حسن پروفیسر اردو نظام کالج حیدرآباد کے پاس ہے - یہ دونوں نسخے تو میرے دیکھے ہوئے اور اچھی طرح دیکھے ہوئے ہیں - تیسرا نسخہ لالہ سریرام صاحب دہلوی کے پاس اور چوتھا لندن کے انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے - تیسرے نسخے کا حال خمخانۂ جاوید میں لالہ صاحب نے لکھا ہے اور چوتھے نسخے کا ذکر جیمس فلر بلوم ہارٹ نے اپنی فہرست کتب لندن میں کیا ہے - میری رائے یہ ہے کہ شہزادہ معزالدین 'ثابت' نے جو دیوان مرتب کیا تھا یا تو وہی نواب سالار جنگ بہادر کے ہاں ہے یا اس کی نقل ہے - کیونکہ جو دیباچہ ثابت نے دیوان کے شروع میں لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب عالم نے صرف انہی غزلوں کو ایک جگہ جمع کیا تھا جو ان کی فرمائشی تھیں یا جو 'احسان' نے

مشاعروں میں پڑھی ہوں اور اس طرح اس دیوان کی شکل کلیات کی نہ ہوئی بلکہ یہ صرف غزلوں کا مجموعہ تھا - نواب سالار جنگ بہادر کے ہاں جو دیوان ہے' اس میں صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں۔ دیوان کی ظاہری حالت بتا رہی ہے کہ کسی شاہی کتب خانے کا ہے - نہایت نفیس کشمیری کاغذ ہے' کل ۱۰۱ ورق ہیں اور ہر صفحے میں ۱۱ سطریں - صفحوں پر سنہری اور شنگرفی جدول ہے - خط نستعلیق ہے' پختہ ضرور ہے مگر کچھ زیادہ خوب صورت نہیں - البتہ غلطیاں بہت کم ہیں - قلم اوسط درجے کا ہے' نہ بہت موٹا نہ بہت باریک - اگر کسی سطر میں کوئی مصرع پورا نہیں آیا ہے تو بقیہ حصہ حاشیے پر لکھدیا ہے - کاٹ چھانٹ بالکل نہیں ہے - ورق کے نمبر قطعہ کے لئے "ق" اور تخلص سرخی سے دیے ہیں - بہر حال خط ایسا ہے کہ پڑھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ البتہ بعض جگہ لفظوں کو ملا کر لکھنے کی وجہ سے ذرا نکالنے میں دقت ہوتی ہے - یہ دیوان 'احسان' کی زندگی میں مرتب ہوا تھا - اس لئے ہر ردیف کے بعد خالی صفحے چھوڑ دیے گئے ہیں تاکہ اگر کوئی اور غزل مل جائے تو بڑھانے میں دقت نہ ہو —

بقیہ جو تین نسخے ہیں وہ دیوان نہیں کلیات ہیں - ان میں اردو غزلوں کے علاوہ فارسی غزلیں بھی ہیں' تاریخیں ہیں' قصیدے ہیں' مخمس ہیں' مسدس ہیں' مثنویاں ہیں' قطعے ہیں' ہجویں ہیں' غرض سب کچھ ہے۔ آغا حیدر حسن صاحب والے کلیات میں شروع کے پہلے کچھ صفحے غائب ہیں' باقی ساری کتاب مکمل ہے - یہ نسخہ بڑی تقطیع پر ہے اور اس کے ۲۳' ۲۴ سطروں کے ۱۰۲ ورق ہیں - اس کا خط بھی معمولی ہے اور کاغذ بھی معمولی' مگر صحت کا بہت خیال رکھا گیا ہے - ہر غزل وغیرہ کے شروع میں اس کی بحر سرخی سے دے دی ہے - اس مضمون کی ترتیب میں مجھے اس نسخے سے بہت مدد ملی —

آغاصاحب نے بڑی خوشی سے مجھے یہ نسخہ دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ جب تک چاہو اپنے پاس رکھو - اس کے علاوہ 'احسان' کے حالات زیادہ تر مجھے ان

ہی سے معلوم ہوے۔ ان کے بستے جاکر دیکھو بالکل عمر و عیار کی زنبیل یا مداری کا تھیلا معلوم ہوتے ہیں۔ جو چیز مانگو انھی بستوں میں سے نکل آتی ہے۔ آغاصاحب نے اپنے نانا نواب احمد حسن خاں سے پوچھ پوچھ کر 'احسان' کے حالات لکھ لئے ہیں۔ وہ کاغذات بھی انھوں نے مجھے دیدئے اور کیوں نہ دیتے۔ مفت میں ان کے پڑ نانا کا حال ایک بھلا مانس لکھ رہا تھا۔ خیر میں ان کا شکریہ ادا کروں، یہ میرا ادا کریں۔ اور آپ سب پڑھنے والے ان کا اور میرا دونوں کا شکریہ ادا کریں۔ چلو عوض معاوض گلہ ندارد —

میرا جہاں تک خیال ہے، اسی کلیات کی ایک نقل لالہ سریرام صاحب کے پاس ہے اور دوسری لندن میں۔ کیوں کہ لالہ صاحب نے جو حال کلیات 'احسان' کے متعلق خمخانۂ جاوید میں اور جیمس فلوبلوم ہارٹ نے اپنی فہرست کتب میں دیا ہے، وہ حرف بحرف آغا صاحب والے نسخے سے ملتا ہے۔ لندن والے نسخے کی تاریخ تحریر یکم جمادی الثانی ۱۲۵۷ ہجری ہے۔ لالہ صاحب نے اپنے نسخے کی تاریخ درج نہیں کی اور آغا صاحب والے نسخے میں یہ حصہ جھینگر چاٹ گئے ہیں۔ لیکن حالات کے لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں نسخے بھی اسی تاریخ یا اس کے زمانۂ قریب میں مرتب ہوے ہیں۔ جیمس فلوبلوم ہارٹ نے لکھا ہے کہ لندن والے دیوان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں ایک قصیدہ کسی دوسرے شخص کا بھی ہے۔ لیکن تخلص چھوٹ گیا ہے، اس لئے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ قصیدہ کس کا ہے۔ آغاصاحب والے دیوان سے یہ چیستان حل ہوجاتی ہے —

اس قصیدے کا ابتدائی حصہ نقل کئے دیتا ہوں —

مسدس منقبت حضرت سرور کائنات محمد مصطفی صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم شاگرد مصنف دیوان ہذا محمد قادر بخش 'موزوں' —

السلام اے پیشواے اولین و آخریں　　السلام اے بادشاہ اتقیاو مرسلیں
الصلوٰۃ والسلام اے ہادی راہ یقیں　　تم کو کہتے ہیں یہی سب حامل عرش بریں

الصلوٰۃ والسلام یا شفیع المذنبین

الصلوٰۃ والسلام اے رحمۃ للعالمین

یہ مرزا قادر بخش 'موزوں' دہلی کے سلاطین زادے اور مرزا قادر بخش 'صابر' کے سالے تھے۔ 'احسان' کے شاگرد تھے اور اُستاد کی ان کے حال پر خاص نظر تھی۔ ان واقعات کو میں آئندہ درج کرونگا۔ یہاں صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مرزا معزالدین 'ثابت' نے اُستاد کا دیوان مرتب کیا، اسی طرح مرزا قادر بخش 'موزوں' نے ان کا کلیات ترتیب دیا۔ ورنہ اس قصیدے کو اس کلیات میں آنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ چونکہ اُستاد کا حال دیباچے کی شکل میں مرزا معزالدین 'ثابت' لکھ چکے تھے اس لئے 'موزوں' نے یہ دیباچہ بھی اس کلیات میں شریک کردیا (واللہ اعلم بالصواب) اور آخر میں مولوی امام علی المتخلص بہ 'مقتول' کی تقریظ لگادی —

'ثابت' کا مرتب کیا ہوا جو دیوان ہے، اس میں غزلیں اس حمد سے شروع ہوتی ہیں:

یہ دو جوہر ہیں یہاں کون ناخدا میرا خدا ہی دونوں جہاں میں ہے ناخدا میرا

لالہ سریرام صاحب والے نسخے کا حال معلوم نہیں۔ آغا صاحب والے نسخے کے پہلے چند صفحے غائب ہیں۔ البتہ لندن والے نسخے میں اس حمد سے پہلے تین شعر اور دیے ہیں —

یہی وظیفۂ مجنون‌دشمت (بدشت؟) عشق رہا فدا ہوں اس پہ کہ اسیری بعہدہ لیلا

گرا جو شام کو دست فلک سے ساغر بھر (سے؟) نشے میں عشق کے ہے چور گنبد مینا

جبین عرش معلی ہے سجدہ ساز (کاہ؟) نیاز اس آستان پہ سبحان ربی الاعلیٰ

تینوں نسخوں کے شروع میں شہزادہ معزالدین 'ثابت' کا لکھا ہوا دیباچہ ہے۔ جس میں پہلے لوگوں کی طرح صرف لفاظی ہی نہیں کی بلکہ اُستاد 'احسان' کا بہت کچھ حال بھی لکھا ہے۔ دیباچے کی زبان فارسی ہے، مگر ایسی فارسی ہے کہ

اس کو ایرانی شاید فارسی کہنے میں تامل کریں۔ کیا اچھا ہوتا کہ صاحب عالم یہ دیباچہ اُردو میں لکھ دیتے۔ کم سے کم یہ تو فائدہ ہوتا کہ مجھے ترجمہ کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔ خیر۔ جب پڑی ہے تو اُٹھائیں گے۔ لیجئے دیباچہ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

---

* (دیباچے کا ترجمہ) اس رحمن کا احسان ہے جسنے ہر ایک عبد مؤمن کو اپنی رحمت خاص سے ایمان کی دولت عطا فرمائی اور زبان کو جو صرف ایک گوشت کا ٹکڑا ہے گویائی کی قوت دیکر سخن سنج بنایا۔ مصرعہ: "حکیمے سخن بر زبان آفرین"۔ اپنی قدرت کاملہ سے دونوں عالم کی ہستی کی بنیاد رکھی اور شعرا کی زبان کی شیرینی کو شہد کے ساتھ ملایا۔ دونوں جہان کی ابتدا کا مطلع، انتہا کا مقطع اور وسعت کا قصیدہ اس کی صنعت مختصر ہے —

انسان کی پانچوں انگلیوں کا مخمس، آنکھ اور کان کی رباعی، اعضا کے قطعات اور کل مخلوقات (یعنی جن وانس) کی مثنوی اسی سے منسوب ہے —

اے ساختۂ تو پیکر ما احسان تو ہست بر سر ما
رحمے کہ زرہ بروں نباشم از حکم تو کہ بروں نباشم
ثابت حمدت چہ سازد انشا ہستی تو معزدین و دنیا
صد شکر کہ ذات مصطفیٰ را آن سرور جملہ انبیا را
پیغمبر ما بداں نمودی رحمے برعا صیاں نمودی

ایسا پیغمبر جس نے ہم عاصیوں کو شفاعت کا مژدہ سنایا اور اپنی عنایت کا دستر خوان ہر طرف بچھایا، شفیع، مطاع نبی، کریم —

ایسا صادق کہ جناب فیض مآب حضرت صدیق کو یارغار بنایا۔ ایسا عادل کہ حضرت عمر کو ایک مدت تک اپنی تربیت سے نوازا۔ ایسا جامع (کمالات) کہ حضرت عثمان کی ذات بابرکات کو جامع قرآن کیا۔ ایسا امیر کہ امیرالمومنین حضرت علی کو ولی کا رتبہ بخشا —

ایسا محسن کہ اس کے طفیل سے حضرت حسنین کے ابر رحمت کا سایہ ہمارے سروں پر ہے، ایسا قادر کہ اس کی عنایت سے شیخ الارض و السموات شیخ عبدالقادر جیلانی

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

احسان آن رحمن که هر یک عبد مومن خود را از رحمت خاص خود دولت ایمان بخشیده - وزبان را که پارهٔ گوشت است قوت نطق داده وسخن سنج گردانیده مصرعه: 'حکیمی سخن بر زبان آفرین' - از قدرت کاملهٔ خود بنائے هستی دوعالم ریخته- و شیرینی لسان شعرا را باشهد آمیخته - مطلع بدایت ومقطع نهایت وقصیدهٔ طول

(بقیه بر صفحه گذشته)

رنج و تکلیف میں همارے دستگیر هوے - ایسا آقا کہ عبدالرحمن کے نام کو پسند فرمایا اور یہی نام رکھنے کا حکم دیا - اللهم صل علیٰ محمد و آل محمد و اصحابه و اتباعه و بارک و سلم —

امابعد یه عاصی عزلت گزین مرزا معزالدین ابن شاه عالم بادشاه غازی انارالله برهانه که 'ثابت' تخلص رکھتا هے اور محبت کے رستے میں ثابت قدم هے' عرض کرتا هے که مجھ ناکارہ کو بچپن سے فارسی اور اردو شعر کہنے کا شوق تھا۔ چاهتا تھا که کسی ایسے استاد سے اصلاح لوں جسکی استعداد مسلم هو - اسی تلاش میں والد ماجد مغفور کی مجلس خاص میں جایا کرتا تھا - مجلس خاص سے مراد یه هے که سلامی دیوان خاص میں حاضر هو کر مجرا بجا لاتے اور چلے جاتے اور حضرت ظل سبحانی خاصه تناول فرمانے کے بعد سونے کے لئے پھر دیوان خاص میں تشریف لاتے - چونکه اعلیٰ حضرت ممدوح کو شعر کہنے کا بڑا شوق تھا اس لئے اس وقت هر روز کوئی مطلع یا رباعی یا غزل فی البدیه فرماتے چنانچه حضرت صاحب عالم و عالمیان برادر صاحب قبله یعنی مرزا محمد ایزد بخش بهادر عرف مرزا نیلی صاحب دام اقباله کے استاد حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان' همیشه حاضر رهتے - اعلیٰ حضرت بھی اُن کو استاد کہتے اور ان کے حال پر بهت عنایت رکھتے تھے - استاد مذکور فارسی اور اردو غزلیں فی البدیه کہتے اور اپنی شیریں کلامی سے بادشاه جم جاہ کو خوش کرتے تھے —

ایک دن بادشاه سلامت نے میرے سامنے فرمایا که حافظ جیو میں نے ریخته کا ایک مصرعه کہا هے دوسرا مصرعه فی البدیه لگایئے - خود میرے خیال میں نہیں آتا - کہا جو حکم - فرمایا - مصرعه: "صبح بھی بوسه تو دیتا مجھے اے ماه نہیں" خاں مذکور نے دوسرا مصرعه فوراً عرض کیا - مصرعه "نا مناسب هے میاں وقت سحر گاه نہیں"

(بقیه بر صفحه آئنده)

دو جہاں صنعت مختصر اوست - مخمس پنج انگشت انسان و رباعی چشم و گوش و قطعہائے اعضا و مثنوی کل مخلوقات منسوب بدوست -

اے ساختۂ تو پیکر ما　　احسان تو ہست بر سر ما
رحمے کہ زرہ بروں نباشم　　از حکم تو کہ بروں نباشم

(بقیۂ صفحہ گذشتہ)

بادشاہ سلامت نے ہنسکر فرمایا: اب غزل پوری کردو - استاد مذکور نے وہیں بیٹھ کر غزل اتنی جلدی پوری کردی گویا اپنی کہی ہوئی غزل یاد تھی - مجلس میں ابو محمد خاں داروغۂ خاصہ اور نور علی خاں داروغۂ توشک خانہ وغیرہ موجود تھے ' سب نے تعریف کی - لیکن میں نے استاد کے کہے ہوئے مصرعہ پر اعتراض کیا اور کہا کہ یا تو وقت سحر ہونا چاہئیے یا سحر گاہ - وقت اور سحر گاہ دونوں کے یہاں ایک ہی معنی ہیں اس لئیے "وقت سحر گاہ" بے معنی ہے - استاد نے ہنسکر فرمایا : شاید حضرت علم شعر سے ناواقف ہیں - اور یہ بات شعرائے کامل کی صحبت کے بغیر حاصل ہونا مشکل ہے - یہاں تک کہ یہ گفتگو بادشاہ سلامت نے بھی سماعت فرمائی اور مجھ عاصی سے کہا کہ حافظ جیو اپنے وقت کے استاد ہیں' انہوں نے یہ لفظ بغیر سند نہ کہا ہوگا - میں نے عرض کی کہ یہ فارسی لفظ ہے ' جب تک کسی ایرانی مسلم الثبوت استاد نے نہ کہا ہو اس پر بھروسا نہیں ہوسکتا - حافظ جیو نے کسی قدر تامل کے بعد مرزا محمد علی 'صائب' تبریزی کا یہ شعر سند میں پڑھا :

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد　　خواب در وقت سحر گاہ گراں می گردد

بادشاہ سلامت نے فرمایا : ہم نہ کہتے تھے کہ انہوں نے غلط نہ کہا ہوگا - میں نے کہا قبلۂ عالم! یہ خود شاعر ہیں' خود ہی کہہ کر شعر پڑھ دیا ہوگا' صائب کا دیوان دیکھ لوں تو یقین آئے - بادشاہ سلامت اس پر کسی قدر خفا ہوے اور فرمایا : جوب جاہلاں باشد خموشی - قصہ مختصر دوسرے دن استاد نے اساتذہ کے یہ شعر "وقت سحر گاہ" کی سند میں لاکر پڑھے :

حواتی گیلانی کا شعر : فغان بلبل و وقت سحر گاہ　　حواتی و دل نالاں و شب ہا
علی نقی کمرہ کا شعر : وقت سحر گاہ ز خول دعا　　بر سپہ غصہ شبی خون زنم
اشرف قزوینی کا شعر : دلبرم وقت سحر گاہ بدرخانہ رسید　　ہمچو صبح شفق آلودہ رخش سرخ و سفید

ایک روز اعلیٰ حضرت نے فارسی کا ایک مصرعہ فرمایا تھا ' استادنے فی البدیہہ

(بقیۂ بر صفحہ آئندہ)

ذات حمدت چه سازد انشا — هستی تو معز دین و دنیا

صد شکر که ذات مصطفی را — آن سرور جمله انبیا را

پیغمبرے عابداں نمودی — رحمے بر عاصیاں نمودی

پیغمبرے که ما عاصیاں را صلاے شفاعت دادہ و خوان عنایت بر هر کراں نهادہ -

مصرعه : شفیع مطاع نبی کریم -

(بقیه صفحهٔ گذشته)

دوسرا مصرعه لگاکر اس کو مطلع کردیا (مصرعه) :

نکردم عشق کس هرگز چو من عاشق سخن گفتم

میں اس وقت موجود تھا، چپکے سے ان کے کان میں کہا کہ عاشق کی اضافت کو کیوں حذف کردیا - فرمایا : میں نے صحیح کہا ہے اور مرزا صائب کے یہ تین شعر پڑھے :

۱ - سر نمی پیچد بترک سر ز تیغ آبدار — این قدر کس چون قلم عاشق سخن باشد چرا

۲ - چوں سبوتا دست نم از زندگی در پیکرست — دستگیری کن مے آشامان عاشق بادہ را

۳ - عالمے روشن بچشمش زود می گردد سیاہ — هر که چون پروانہ بیدرد عاشق صحبت است

میں نے بہت تعریف کی اور کہا کہ شاعری اسی کو سزاوار ہے جو اساتذہ کے کلام کا اس قدر پیرو ہو - سن کر فرمایا " اگرچہ میں نے خود کہا ہے اور 'صائب' جیسے زبردست شاعر کی سند موجود ہے لیکن میرے نزدیک بغیر اضافت کے اس طرح کے اشعار فصاحت کے رتبے سے گر جاتے ہیں"- ایک روز بادشاہ سلامت نے یہ مصرعہ کہا " خدایا ندارم سوا تو کسے را " اور استاد سے پوچھا کہ " سوا تو" کا لفظ یہاں صحیح ہے یا نہیں - دوسروں نے کہا " سواے تو" چاہئے - بادشاہ سلامت نے کہا : میں ان سے پوچھتا ہوں - سن کر عرض کی کہ پیر و مرشد صحیح ہے اور شانی تکلو کا یہ شعر پڑھا :

من جان ندهم بکس سوا تو — تو دل ندهی بکس سوا من

اور مجھ سے کہا : یہ بھی اگرچہ صحیح ہے لیکن میرے خیال میں فصاحت سے دور ہے - اور یہ بھی ظاہر کیا کہ جہاں "ها" مختفی ہوتی ہے وہاں شعرا اکثر فک اضافت کرتے ہیں، چنانچہ محسن تاثیر نے کہا ہے (بیت) :

مسکن شوخے بود هر جا رہ دل در سینه ام — خانه ام چون کهفدان ماواے چندیں خانه است

الغرض استاد مذکور حضور پر نور کے سامنے ایسے مضبوط اور مربوط شعر فی البدیه

(بقیه بر صفحهٔ آئنده)

صادقے کہ جناب فیض مآب صدیق را یارِ غار ساختہ، عادلے کہ حضرت عمر را
عمرے بہ تربیت خود بنواختہ - جامعے کہ ذات بابرکات عثمان را جامع قرآن کردہ،
امیرے کہ امیرالمؤمنین حضرت علی را رتبۂ ولی بخشیدہ —
حسنے کہ از طفیلش ابر رحمت حسنین بر فرق ما سایہ فگن - قادرے کہ

(بقیہ حاشیہ گذشتہ)

کہتے تھے کہ سخن فہموں کا دل خوش ہو جاتا تھا - یہاں تک کہ ان کے حسن صحبت سے خوشہ چینی کر کے میں نے ظاہر کیا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہوں - فرمایا: فارسی اشعار سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے - ریختہ میں شعر کہا کیجئے - کیونکہ ریختہ کی اچھی غزل فارسی سے بہتر ہے - میں نے کہا: صحیح ارشاد ہوا جب ہی تو ہدایت نے کہا ہے:

ہدایت کہا ریختہ جب سے ہم نے　　رواج اٹھ گیا ہند سے فارسی کا

یہ سن کر کہا کہ ریختہ گو کے لئے فارسی جاننا بہت ضروری ہے، بغیر فارسی جانے غلطی ہو جاتی ہے اور غلطی کا علم نہیں ہوتا. القصہ اس مسلم الثبوت استاد کی صحبت کی برکت سے ریختہ گوئی میں میرا یہ رتبہ ہو گیا ہے کہ اس فن شریف کے استاد بھی میرے شعر پسند کرتے ہیں اور میرے اکثر شاگرد جو میرے بھائی اور بھتیجے بھی ہیں، ایسے شعر کہنے لگے ہیں کہ ان کی تعریف ہوتی ہے - اس گفتگو سے میری یہ غرض ہے کہ اس ناچیز بندے کے استاد حافظ عبدالرحمن خاں احسان نے ریختہ کی بنیاد اس طرح ڈالی ہے کہ ان کے ریختہ کے سامنے کسی ریختہ گو کا کلام مجھے پسند نہیں آتا اگر میں اس شیریں سخن کو خسرو اقلیم فصاحت و بلاغت کہوں تو درست ہے اور چونکہ سخن سنجی کا ملک ان کے زیر نگیں ہے اس لئے اگر ان کو ملک الشعرا کہوں تو بجا ہے - اول تو ان کی عادت ہی ایسی واقع ہوئی ہے، دوسرے یہ حضور والا کے یہاں حاضر رہتے اور برادر صاحب قبلہ ممدوح کی سرکار فیض آثار کے کاروبار میں لگے رہتے ہیں، اس لئے بغیر کسی کی فرمایش کے غزل نہیں کہتے - میں نے ہر چند دیوان ریختہ کی تدوین کا سلسلہ چھیڑا لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا - (لاچار) اکثر اپنی فرمایش اور استاد موصوف کی مشاعروں میں پڑھی

(حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

از عنایتش شیخ السموات والارض شیخ عبدالقادر جیلانی دستگیر رنج و محن - سرور ے که نام عبدالرحمن را پسند فرموده و باین اسم نهادن امر نموده - اللهم صل علی محمد و علی آل محمد و اصحابه و اتباعه و بارک و سلم —

اما بعد عاصی عزلت گزین مرزا معزالدین ابن شاه عالم بادشاه غازی انارالله برهانه که تخلص «ثابت» دارد و در راه اخلاص ثابت است' میگوید که این هیچمدان را از صغر سنی شوق شعر فارسی و ریختہ کمال بود' و طالب اهل کمال بودم - میخواستم که اصلاح شعر از استادے بگیرم که استاد مسلم الثبوت باشد - چنانچه در همین تلاش در مجلس خاص والد ماجد مغفور خود حاضر میشدم و محفل خاص عبارت از آنست که مجرائیان از دیوان خاص شرف مجرا در یافته میر فتند و حضرت ظل سبحانی خاصه تناول فرموده بدیوان خاص باز براے استراحت تشریف ارزانی میفرمودند — و چون اعلی حضرت ممدوح راشوق اشعار فرمودن بسیار بود' آنوقت هر روز یا مطلع یا غزل یارباعی فی البدیه میفرمودند - چنانچه حافظ عبدالرحمن خاں «احسان» استاد حضرت صاحب عالم و عالمیان برادر صاحب قبله مرزا محمد ایزد بخش بهادر عرف مرزا نیلی صاحب دام اقباله مدام حاضر بودند و اعلی حضرت ایشان را استاد می فرمودند و بغایت عنایت بحال ایشان مصروف می داشتند - استاد ممطور فی البدیه

(بقیه حاشیه بر صفحه گذشته)

ہوئی غزلوں کو اکٹھا کر کے یہ دیوان مرتب کیا ' تا کہ ہندوستان کے اس باغ سے جو فہرست بہشت ہے - سخن سنجوں کی طبیعت کی بلبلیں گل مراد حاصل کریں —

بھر کے لئے جا سی خوش کلام — کہ مدام احسان ہے وہ نیکنام
بکیفیت جام پیر مغاں — با مفوت سلک عشق بتاں
معطر ہوا اس سے ہندوستاں — یہ ہے بوستاں لائق دوستاں
جہاں دیکھو واں یاسمن سمن — خیاباں خیاباں چمن در چمن

اے خدا اس گلزار رشک ارم کو حوادث زمانہ کی باد سموم سے مصئون و محفوظ رکھیو - بحرمت النبی و آلہ الامجاد —

غزلهاے فارسی و ریختہ سرانجام می نمود و بادشاہ جم‌جاہ را از شیرینی زبانی خود مسرور می‌ساخت - روزے بادشاہ روبروے می‌فرمودند کہ حافظ جیو مصرعۂ ریختہ می‌گویم' مصرع دیگر فی‌البدیہہ باید گفت کہ بخاطر ما بدولت نمی آید - عرض کرد کہ ہر چہ حکم ارشاد فرمودند (مصرعہ) :

' صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں '

خاں مذکور بے تامل مصرع ثانی بہم رسانید' و آں این است (مصرعہ) :

' ذا مناسب ہے میاں وقت سحر کاہ نہیں '

بادشاہ تبسم نمودہ فرمودند ہمہ غزل باتمام رسانید - ہماں جا اُستاد مذکور غزل آنچناں زود تر سرانجام نمودند کہ گویا کہ غزل گفتۂ خود یاد بود - حاضران مجلس ابو محمد خاں داروغۂ خاصہ و نور علی خاں داروغۂ توشکخانہ وغیرہ تحسین کردند - مگر این ہیچمدان بر مصرعۂ بہم رسانیدہ مومی الیہ اعتراض نمود - گفتم یا " وقت سحر " باید گفت یا " سحر کاہ " باید داشت ' لفظ کاہ و وقت کہ ہر دو دریں جا یک معنی دارند بے معنی است " - مشارالیہ خندیدہ گفت : حضرت از علم شعر خبر ندارند و آں بدون صحبت شاعر کامل بہم رسیدن بسیار دشوار است - تا آنکہ ایں گفتگو بادشاہ مسموع فرمودند و ایں عاصی را ارشاد ساختند کہ حافظ جیو اُستاد وقت خود اند' بدون سند ایں لفظ نگفتہ باشند - بندہ عرض کرد کہ ایں لفظ فارسی است تا آنکہ کسے اُستاد علم‌الثبوت ولایت زانگفتہ باشد اعتبار ندارد -

حافظ جیو بعد تامل ایں شعر مرزا محمد علی ' صائب ' تبریزی در سند خواندند :

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد خواب در وقت سحر کاہ گراں می گردد

بادشاہ تبسم فرمودہ فرمودند " ما نمی فرمودیم کہ از ایشاں خطا نخواہد شد - " عرض کردم کہ " قبلۂ عالم ایشاں شاعر اند خود تصنیف نمودہ خواندہ باشند' اگر در دیوان صائب بہنم غلام را اعتبار آید - " بادشاہ قدرے برہم شدہ فرمودند - " مصرعہ : جواب جاہلاں باشد خموشی - " القصہ اُستاد مذکور روز دیگر ایں

سه شعراساتذه در سند "وقت سحرگاه" آورده خواندند۔ حیاتی گیلانی (شعر):

فغان بلبل و وقت سحر گاه حیاتی و دل نالان و شبها

علی نقی کمره: وقت سحرگاه زخیل دعا بر سپه قصه شبیخون زنم

اشرف قزوینی: دلبرم وقت سحرگاه بدرخانه رسید همچوصبح شفق آلود رخش سرخ وسفید

روزے اعلی حضرت مغفوریک مصرعۂ غزل فارسی طرح فرموده بودند۔ استاد مسطور این مصرع فی البدیه در مطلع بهم رسانیده بود، مصرعه:

"نکردم عشق کس هر گز چو من عاشق سخن گشتم"

آن وقت حاضر بودم، آهسته بگوش گفتم: " اضافت لفظ عاشق چرا محذوف نمودند"، گفته " درست گفته ام " و این سه شعر میرزا صائب خواندند:

سرنمی پیچد بترک سر ز تیغ آبدار این قدرکس چون قلم عاشق سخن باشدچرا

چون سبو تاهستم از زندگی در پیکرت دستگیری کن می آشامان عاشق باده را

عالمے روشن بچشمش زود می گردد سیاه هرکه چون پروانۂ بیدردعاشق صحبت است

بسیار تحسین نمودم و گفتم: شاعری کسے راسزاوار است که این قدر متتبع کلام اساتذه باشد شنیده گفتند اگرچه من هم گفته ام و سند همچو صائب شاعر زبردست موجود است۔ لیکن نزدیک من بدون اضافت این چنین اشعار از رتبه فصاحت می افتند۔ یکروز پادشاه این مصرعه فرمودند (مصرعه) " خدا یا ندارم سوا تو کسے را " و از استاد پرسیدند که لفظ "سوا تو" هم درست است یا نے دیگران گفتند که لفظ " سوائے تو" است۔ بادشاه فرمود ند "من ازایشان می پرسم۔ شنیده عرض کردند که پیر و مرشد درست است و این شعر شافی تکو خواندند:

"من جان ندهم بکس سوا تو " " تو دل ندهی بکس سوا من و"ازمن گفتند، این نیز اگرچه درست است امابخیال من بعید ازفصاحت است و ظاهر ساختند، جائیکه "ها" مختفی باشد شعرا اکثر فک اضافت نموده اند، چنانچه محسن تاثیر بیت

مسکن شوخے بزدهرپار ه دل درسینه ام خانه ام چون کیفدان ماوائے چندین خانه است

الغرض استاد مذکور اشعار فی البدیه بدون خطا بحضور پرنور حضور والا مضبوط و مربوط سر انجام میساختند که دل سخن فہم محظوظ می شد - تا آنکه خوشه چین خرمن صحبت ایشان شده ظاهر نمودم که دل من می خواهد که شعر فارسی و ریخته هر دو گفته باشم - گفتند که از عهدهٔ شعر فارسی بر آمدن خیلے دشوار است، اشعار ریخته فرموده باشند که غزل ریخته اگر خوب باشد بهتر از فارسی است - گفتم: بجا است - هدایت شاعر می گوید - (شعر) :

'هدایت' کہا ریختہ جب سے ہم نے — رواج اٹھہ گیا ہند سے فارسی کا

شنیده ظاهر نمودند که شاعر ریخته گو را علم فارسی پر ضرور است، بدون علم فارسی خطا می سازد و از خطاے خود مطلع نمی شود - آخرالامر از برکت صحبت آن استاد مسلم الثبوت در ریخته گوئی پایهٔ بهم رسانیدم که اساتذهٔ این فن شریف شعر من پسند می نمایند و اکثر شاگردان من که برادر و برادر زادها اند آن چنان ریخته می گویند که قابل تحسین و آفرین اند - غرض این گفتگو آنکه حافظ عبدالرحمن خان 'احسان' استاد این اضعف العباد بناے ریخته آن چنان ریخته اند که روبروے ریختهٔ ایشان ریخته کسے ریختهٔ گو پسند خاطر من نمی آید - این شیرین سخن را اگر خسرو اقالیم فصاحت و بلاغت بگویم رواست - چون مملکت سخن سنجی زیر نگین دارد اگر ملک الشعراء بگویم بجاست - چون خوے ایشان چنان واقع شده که بدون تحریک معرکے غزل نمی گویند و نیز حاضر باشی در حضور والا و کاروبار سرکار فیض آثار برادر صاحب قبله ممدوح دارند - بران هر چند که سلسله جنبان تدوین دیوان ریخته شدم صورت نه بست - اکثر غزل هاے فرمایشی طبع زاد استاد موصوف بهم رسانیده، تدوین آن نمودم که تا عندلیب طبع سخن سنجان از این بوستان هندوستان که غیرت ریاض رضوان است گل مراد چنیده —

بشیرینی جامی خوش کلام — که همنام 'احسان' هے وه نیک نام

بکیفیت جام پیر مغان — با ملیت ملک عشق بتان

معطر ہوا اس سے ہندوستاں　　یہ ہے بوستاں لائق دوستاں

جدھر دیکھو واں یاسمین سمن　　خیاباں خیاباں چمن در چمن

الٰہی این گلزار رشک ارم از صرصر حوادث روزگار مصئون و محفوظ باد بحرمت النبی و آلہ الا مجاد —

حالات | حافظ عبدالرحمن خاں کے آبا و اجداد کسی زمانے میں بخارا کے حاکم تھے. جب مغلوں نے ترکستان کو تاراج کرنا شروع کیا، اس وقت یہ خاندان ہٹ کر ہرات آگیا - مگر وہاں بھی اس کو چین نصیب نہ ہوا - آخر دو بھائیوں نے اپنے گھر بار کو خیر باد کہہ ہندوستان کا رخ کیا - اس زمانے میں خاندان تغلق دھلی میں حکمراں تھا - ان دونوں بھائیوں کی دربار دھلی میں بڑی قدر و منزلت ہوئی - بڑے بھائی کو موسیٰ خاں اور چھوٹے کو عیسیٰ خاں خطاب ملا اور شاہی نوازشوں نے تھوڑے ہی دنوں میں وطن کی مصیبتوں کو ان کے دل سے بھلادیا - خدا معلوم کس نیک ساعت میں یہ خطاب ان بھائیوں کو ملے تھے کہ دھلی میں بیسوں خاندانوں میں بادشاہت بدل گئی - لیکن یہ خطاب اسی طرح باپ سے بیٹوں پر اُترتے چلے آئے اور غدر کے بعد جب دھلی کی سلطنت ہی ختم ہوگئی اس وقت ان کا بھی سلسلہ ٹوٹا —

یہ خاندان ثروت و اقتدار کے ساتھہ علم و فضل میں بھی ہمیشہ مفتخر و ممتاز رہا ہے - اگر ایک طرف یہ لوگ دربار میں امرا کے طبقے میں کھڑے ہوتے تھے تو دوسری طرف خلوت خاص میں علما کے ساتھہ بیٹھے نظر آتے تھے - سلطنت مغلیہ کے زمانے میں شاہزادوں اور شاہزادیوں کو کلام مجید پڑھانے کی خدمت اسی خاندان میں تھی - اور غدر تک قایم رہی' یہی وجہ ہے کہ اس خاندان میں اُس سرے سے اس سرے تک حافظ ہی حافظ نظر آتے ہیں' محمد شاہ اور احمد شاہ کے زمانے میں یہ خدمت 'احسان' کے والد حافظ غلام رسول خاں کے سپرد تھی - ان کا خطاب موسیٰ خاں محب الدولہ بہادر تھا - ان کی شادی قمرالدین خاں وزیر محمد

شاہ بادشاہ کے فرزند بدرالدین خاں کی بیٹی سے ہوئی اور ان کے بطن سے سنہ ۱۱۸۳ ھ میں حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان' پیدا ہوے۔ نادر گردی میں بدرالدین خاں اپنے قاضی کے حوض والے مکان میں شہید ہوے۔ یہ مکان اس کے بعد ان کی بیٹی کے قبضے میں آیا اور ان سے حافظ 'احسان' کو ترکے میں ملا۔ اس وقت سے اب تک اس مکان پر اسی خاندان کا قبضہ ہے —

بچپن ہی میں عبدالرحمن خاں 'احسان' نے کلام مجید حفظ کر لیا اور اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کی خدمت پر مقرر ہوے موسیٰ خاں صمصام الدولہ خطاب ملا اور شہزادوں کی تعلیم ان کے سپرد ہوئی۔ شاہ عالم ثانی اکبر شاہ اور بہادر شاہ ثانی کے زمانے میں جتنے شاہزادے اور شاہزادیاں حافظ قرآن تھیں' ان سب کو 'احسان' ہی نے کلام مجید حفظ کرایا تھا —

تمول کے لحاظ سے یہ خاندان دہلی بھر میں سب سے زیادہ امیر سمجھا جاتا تھا۔ اگر ایک طرف خان پور' سنگیڑہ اور اوکھلے کی جاگیر کی آمدنی تھی تو دوسری طرف سکنی جائداد کا کرایہ۔ اگر ایک جانب باغات تھے تو دوسری جانب حویلیاں۔ غرض بڑے اچھے امیروں کی طرح گذرتی تھی۔ سکنی جائداد دو چار دوکانیں یا ۵ - ۶ مکانات نہیں تھے' اجمیری دروازے سے لگا کر رجنا بیگم کی حویلی تک' اور پیپل مہادیو سے میر جملہ کے مدرسے تک سارے کا سارا بازار ان کا تھا۔

کھاری باؤلی کے بازار کا کوئی چوتھائی حصہ' سرکی والوں کی محلسرا' میر جملہ کا مدرسہ' حبش خاں کے پھاٹک کا شیش محل' باغ بدیع یارخاں' قاری کی کوئیاں کی باغیچی' قلعے کے فیچے کا انگریزی باغ اور میر کڑوڑا کی حویلی انھی کے قبضے میں تھیں۔ اس آمدنی کے ساتھ اگر قلعے کی تنخواہ کو ملا لیا جاے تو اس خاندان کی ثروت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کی محلسرا کا برنجی پھاٹک ہندوستان کی صنعت کا ایک بہترین نمونہ تھا۔ افسوس ہے کہ وہ غدر میں تباہ ہو گیا۔ جائداد بھی غدر کے بعد ایک ایک کر کے ٹھکانے لگ گئی۔ انگوری باغ

کٹ کر میدان ہو گیا - باغ بدیع یار خاں بک کر پنجابیوں کا کٹرہ بنا اور ٹوٹ کر دہلی کا ریلوے اسٹیشن ہو گیا - کچھ تو جائداد غدر کے بعد ضبط ہو گئی اور کچھ ان کے ایک پوتے نے جوے میں ہار دی - اس خاندان میں اگر کوئی سب سے زیادہ قابل قدر چیز تھی تو وہ ان کا کتب خانہ تھا - وہ بھی غدر میں تباہ ہو گیا - پندرہ ہزار قلمی کتابوں میں سے صرف دو تین باقی رہ گئیں اور وہ بھی اس طرح کہ کسی نے لاپرواہی سے ان کتابوں کو دو چھتی میں ڈال دیا تھا - غدر کے بعد جب امن امان ہو گیا اور لوگ پھر آ کر دہلی میں بس گئے تو کسی ضرورت سے دو چھتی دیکھی گئی اور یہ کتابیں وہاں سے نکلیں - قاعدہ تھا کہ بادشاہ کی سواری جب شہر میں سے گزرتی تو امرا اپنے دروازوں پر نذریں لے کر کھڑے ہو جاتے اور وہیں بادشاہ سلامت کو نذریں دکھاتے-سارے شہر میں صرف حافظ عبدالرحمن خاں ہی تھے،جن کو یہ نذر معاف تھی - ہاں ان کو نذر کی بجائے کوئی قلمی کتاب پیش کرنی پڑتی تھی—

حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان' کے دو بیٹے تھے - سیف الرحمن خاں اور عبدالحکیم خاں - سیف الرحمن خاں کو پہلے رشید الدولہ کا اور باپ کے انتقال کے بعد موسیٰ خاں کا خطاب ملا - اور عبدالحکیم خاں کو عیسیٰ خاں کا- یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اردو نظام کالج ' سیف الرحمن خاں کے اور محمد عظمت اللہ خاں مرحوم ' عبدالحکیم خاں کے نواسے ہیں - سیف الرحمن خاں کی شادی ذوالفقار الدولہ نجف خاں وزیر شاہ عالم ثانی سے ہوئی - نجف خاں کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنے سسرے کی جائداد یعنی حویلی میر کڑوڑا اور مدرسۂ میر جملہ پر قبضہ کر لیا اور یہ جائداد اس خاندان میں غدر کے زمانے تک رہی —

سیف الرحمن خاں کے تین لڑکے ہوے-نواب احمد حسن خاں' مولوی عنایت الرحمن خاں' (منجھلے آغا) اور مولوی احسان الرحمن خاں (چھوٹے آغا) نواب شمشیر الدولہ بہادر کی ایک لڑکی کی شادی نواب احمد حسن خاں سے اور دوسری لڑکی زینت محل

کی شادی بہادر شاہ ثانی سے ہوئی تھی - اس طرح نواب احمد حسن خاں اور بہادر شاہ ہمزلف تھے - حبش خاں کے پھاٹک میں جو شیش محل ہے' وہ بیوی ہی سے نواب احمد حسن خاں کو پہنچا تھا - مگر وہ انھوں نے جوے میں مرزا اسفندیار بیگ کے ہاتھ ہار دیا- غدر میں اس خاندان پر بڑی تباہی آئی- احمد حسن خاں قلعے کے تعلقات کی وجہ سے باغیوں سے مل گئے - ہر سرو کی گڑھی میں جو خزانہ تھا اس پر قبضہ کرکے دھلی لاے اور نصیرالدولہ خطاب پایا - لیکن جب باغیوں کوشکست ہوئی تو یہ اور ان کے والد سیف الرحمن خاں الور چلےگئے' مگر وہاں سے اپنے نوسو ساتھیوں کے ساتھ پکڑے ہوے دھلی آے ۹۰۰ کو تو فورڈ صاحب نے گڑگاؤں ہی میں ختم کردیا' بقیہ کو دھلی میں پھانسیاں ہوئیں ' مگر معلوم نہیں کہ یہ دونوں باپ بیٹے کیوں کر بچ گئے - نواب موسی خاں (سیف الرحمن خاں) کے انتقال کے بعد نواب احمد حسن خاں نے تمام خاندانی جائداد جوے میں پھونک دی - آخر آخر میں ان کا ہاتھ بہت تنگ ہوگیا تھا' پھر بھی کسی نہ کسی طرح اپنی گزار گئے - ان کے سوتیلے دونوں بھائیوں نے نہ صرف اپنے حصے کی جائدادکومحفوظ کیا' بلکہ اپنی کمائی سے اس میں بہت کچھ اضافہ کر کے اپنی حیثیت ایسی بنالی کہ دھلی میں اب بھی ان کے بیٹے اور پوتے رئیس مانے جاتے ہیں —

حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان' شاہ عالم ثانی کے منجھلے بیٹے شاہزادہ مرزا فرخندہ بخت ایزد بخش عرف مرزا نیلی کی سرکارمیں مختار کل تھے - اپنے دیوان میں انھوں نے صاحب عالم کی جا بجا تعریف کی ہے - چنانچہ لکھتے ہیں :

ورۃ التاج شہاں فخر زماں ایزد بخش فخر ہے فخر تری مدح سرائی مجھکو
اس گھڑی ہووے گہر ریز ترا ابر کرم ہاتھ پھیلا کے کہے حاتم طائی ' مجھکو
یہی دولت عظمیٰ کہ سدا ہووے نصیب در دولت کی ترے ناصیہ سائی مجھکو

ایک جگہ مرزا نیلی کے نام کی وجہ یوں بتاتے ہیں :

میرزا نیلی ہے مقصود سپہر نیلی ۔ تجھکو سر سبز رکھے خالق علام مدام
وجہ اس نام کے رکھنے کا یہ ہے تاکہ شہا نیل چشم بد اعدا رہے یہ نام مدام

ایک اور غزل میں بھی ان کی تعریف کی ہے، ذرا ردیف کو ملاحظہ فرمائیے بالکل نئی ہے اور آخری شعر کا قافیہ تو داد دینے کے قابل ہے:

کہا جو میں نے نہ اہل زمیں کو دے گردش یہ سن کے مجھکو لگا کہنے آسماں تم کون
کہا یہ میں نے کہ ہوں اس جناب کا استاد غلام جس کا یہ کہوے شہاں کو ہاں تم کون
طفیل صاحب عالم محمد ایزد بخش نہ کہہ سکے مجھے ہرگز فرشتہ خاں تم کون

اس قطعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نیلی کے ہاں نوکر ہی نہیں تھے بلکہ صاحب عالم کے استاد بھی تھے ۔

مرزا نیلی عمر میں اکبر شاہ ثانی سے صرف تین مہینے چھوٹے تھے۔ 'احسان' کا ایک طرف تو صاحب عالم سے تعلق تھا اور دوسری طرف برکت علی خاں 'برکت' خیرآبادی سے دوستی - ہوا یہ کہ ۱۸۲۰ء میں جنرل 'اختر لونی' دہلی کے رزیڈنٹ ہوکر آئے۔ برکت علی خاں ان کے پیشکار ہوئے۔ ان دونوں کی کچھ ایسی بنی کہ رزیڈنسی میں میاں 'برکت' کا طوطی بولنے لگا۔ بھلا ایسا اچھا موقعہ کہاں ملتا تھا۔ احسان نے مرزا نیلی کو ولی عہد بنانے کے لئے اپنی پوری قوت صرف کردی، لیکن کچھ ایسا بل آکر پڑا کہ کامیابی نہ ہوئی اور ولیعہد بہادر کے دل میں فرق آگیا - پھر بھی جب اکبر شاہ دہلی کے تخت پر بیٹھے تو انہوں نے ظاہرداری برتنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی - اور جب ۱۲۴۹ ھجری میں مرزا نیلی کا انتقال ہوگیا تو یہ 'احسان' سے بالکل صاف ہوگئے ۔

مرزا نیلی کے مرنے کا 'احسان' کو بڑا قلق ہوا، ان کی وفات کی تاریخیں کہی ہیں، مگر افسوس ہے کہ ایک میں بھی درد نہیں ہے، لکھتے ہیں:

شاہزادہ محمد ایزد بخش در جہاں بود ہمچو آب حیات

چوں سخاوت شعار بد گفتم "ہی اجر عظیم" سال وفات

جناب صاحب عالم محمد ایزد بخش کہ نقش خاطر آفاق شہ کمال وفات

ز فوت گشتی واحسان حیات داد ترا " بیاب بخشش ایزد" بگفت سال وفات

۱۲۴۹ ھجری

احسان کا انتقال ۱۲۶۷ھ میں ہوا۔ گویا انھوں نے تین بادشاہوں یعنی شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی اور بہادرشاہ ثانی کا زمانہ دیکھا۔ ان تینوں بادشاہوں استاد رھے اور مرتے دم تک ان کی قدر و منزلت میں فرق نہیں آیا اور آخر وقت تک بادشاہ اور شہزادے ان کی تعظیم و توقیر کرتے رھے۔ قلعے میں جو واقعات ان پر گذرے ھیں ان کا پتہ کچھ کچھ ان کے اشعار سے ملتا ھے۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ان کی اچھی گزری۔ عید کی خوشی میں ایک قطعہ پیش کرتے ھیں:

درگاہ تری ھے عیدگاہ عالم عالم یہ کہے ھے اے پناہ عالم

عالم میں ھے رسم عید جب تک تب تک شاہ عالم ھی رھوے شاہ عالم

دلی والے شاہ عالم کی سلطنت کا حال ان چند الفاظ میں ظاھر کرتے ھیں:

" بادشاھی شاہ عالم، از دلی تا پالم "۔ پالم دلی سے ۵، ۶ میل پر ایک موضع ھے۔ اس فاصلے اور شاہ عالم کے لفظ کو ملا کر دیکھئے کیا لطف دیتا ھے، واقعی یہ فقرہ کسی بڑے خوش مذاق شخص کے دماغ سے نکلا ھے۔

باز جسدم سے درعدل شہ عالم ھے بچۂ قاز بھی کرتا ھے یہاں باز سے رمز

نادرشاہ تخت طاؤس لے گیا تھا۔ کچھ دنوں تو یونھی کام چلا۔ آخر شاہ عالم ثانی نے دوسرا تخت بنوایا۔ لکڑی کا تھا اس پر سنہری پتر جڑے ھوے تھے۔ تخت طاؤس سے شکل ملانے کی کچھ کوشش بھی کی گئی تھی۔ جواھرات کی جگہ مینا کاری سے کام نکالا تھا۔ بہر حال تخت تیار ھوا اور تخت طاؤس نام رکھا گیا۔ غدر تک یہ تخت قلعے میں تھا۔ احسان نے اس تخت کی تاریخ کہی ھے:

چه خوش ساختہ گشت تخت عجیب ‌‌ ‌‌ بامر تو اے شاہ فرخ نہاد
چه تختے که گشته فلک گرد او ‌‌ ‌‌ برو چشم از چشم انجم کشاد
مزین چو طاؤس خلد برین ‌‌ ‌‌ مرصع چو تخت کے و کیقباد
بجز تخت جدّ تو شاہ جہاں ‌‌ ‌‌ جہاں ثانیِ این ندارد بیاد
تو باشی و این تاکه باشد اثر ‌‌ ‌‌ ز آب و ز آتش زخاک و ز باد
خبر داد 'احسان' ز تاریخ او ‌‌ ‌‌ سریر شہنشاہ با دین و داد

۱۲۱۳ هجری

شاہ عالم بادشاہ سے جو ان کے تعلقات تھے وہ آپ دیباچے میں پڑھ چکے ہیں۔ بھلا ایسے قدر شناس بادشاہ کے مرنے کا کیا کچھ غم ان کو نہ ہوا ہوگا، ان کی وفات پر کیا ہی درد بھرا قطعہ لکھتے ہیں:

آفتاب فلک سلطنت عز و علا ‌‌ ‌‌ شاہ عالم که وہ تھا مخزن احسان میرا
میں جو دربار معلیٰ میں نہ ہوتا کہتے ‌‌ ‌‌ کیا سبب ہے کہ نہیں آج جو احسان میرا
اے فلک تو تو رہے اور نہ رہوے افسوس ‌‌ ‌‌ وہ سخن سنج، سخن فہم، سخنداں میرا
مثل شب، گر ہوں سیہ پوش مجھے لائق ہے ‌‌ ‌‌ کہ جدا مجھ سے ہے وہ مہر درخشاں میرا

وفات کی کیا اچھی تاریخ لکھی ہے:

هزار و دو صد وبست و دو بود آہ ‌‌ ‌‌ که بر زد کوس رحلت شاہ عالم
چو در فردوس منزل کرد آن شاہ ‌‌ ‌‌ غمین شد خلق و جانش گشت خرم
بکش آہ و بگو تاریخ احساں ‌‌ ‌‌ که شد فردوس منزل شاہ عالم

۱۲۲۱ هجری

اُن کی شاہ عالم کے زمانے میں کسی نہ کسی طرح گزرے گئی۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں کسی چغلخور نے چغلی کھائی، احسان قلعے سے نکالے گئے، عرضی بھیجی، منظور ہوئی اور پھر ان کا قلعے میں وہی زور ہوگیا —

ہوں شہ ہند کا استاد یہ ہے فخر مجھے ‌‌ ‌‌ شہرہ میرا تو شہا تا شہِ ایران گیا

عرض غماز پذیرا ہوئی حق میں میرے — کیا گیا میرا مگر اس کا ہی ایمان گیا
حکم والایہ ہوا قلعے میں 'احسان' نہو — سن کے اس بات کو اک شہر کا اوسان گیا
اے شہنشاہ جہاں قدر شناس احساں! — خلق کیا کہویگی، گو حکم کو میں مان گیا
شہر وہ کیا ہے کہ جس شہر میں 'احسان' نہو — قلعہ وہ کیا ہے کہ جس قلعے سے احسان گیا

اس کے بعد بہادر شاہ کا زمانہ آیا، انھوں نے تخت نشینی کی تاریخ کہی:

خسرو خسرواں بہادر شاہ — گشت چوں بادشاہ ہندوستاں
سال تاریخ سلطنت گفتم — خسرو عہد، والی دوراں
۱۲۵۳ھجری

بادشاہ کو باری کا بخار آیا، اچھے ہوے تو انھوں نے تہنیت کا قطعہ پیش کیا:

وہ خورشید چرخ شہی تو ہے شاہا — کہ تیرے سبب سے ہے گھر گھر اوجالا
بہت بار 'احساں' نے شاہا دعا کی — کہ باری کی تپ کھوئے باری تعالا
تو بارے درخت دعا میں لگا بار — کہ اک بار اس بار غم سے نکالا
سوا سو برس تک تو جیوے الٰہی — ترا حکم جاری، ترا بول بالا

کسی وجہ سے دربار بند ہوگیا تھا، تھوڑے ہی دنوں بعد مجرے کی اجازت ہوئی، اس واقعے کو یوں لکھتے ہیں:

'احساں' کو راہ قطب تو مکے کی راہ تھی — ایک آرزو تو تھوڑی ہی مدت میں مل گئی
صد شکر بادشاہ کا مجرا ہوا نصیب — دولت جو لکھی تھی مری قسمت میں مل گئی

دعا دیتے ہیں اور پر دادا تک نام گنوا جاتے ہیں کہ کہیں کسی دوسرے ابو ظفر کو نہ پہنچ جاے:

ابو ظفر بن اکبر بن شہ عالم! — عروس عیش ہمیشہ ترے کنار میں ہو

ایک قصیدہ مدح میں لکھا ہے - اس کا ایک شعر نقل کرتا ہوں - داد دیجئے کا کیا نیا مضمون ہے اور کس خوب صورتی سے باندھا ہے :

محراب کا عالم ہے یہ اے قبلۂ عالم　　منھ تیری طرف اور ہے کعبے کی طرف پشت

سب کچھ تھا، مگر یہ زمانہ ان کے لئے بڑا سخت تھا - استاد ذوق کے قدم قلعے میں آ چکے تھے - خود بادشاہ اور شہزادوں کا گروہ کا گروہ اِدھر سے ٹوٹ اُدھر جا ملا تھا - ظاہرا ان کی تعظیم و توقیر میں تو فرق نہ آیا - ہاں تنخواہ ملنے میں اوپر سوپر ہوجاتی تھی - بھلا یہ کب چوکنے والے تھے - ذرا تنخواہ ملنے میں دیر ہوئی اور انھوں نے تڑ سے عرضی دی - جب اس سے کام نہ چلا تو غزلوں میں اس کا رونا رویا، ایک دفعہ کیا ہوا کہ بادشاہ مچھلی کے شکار کو گئے ہوے تھے، یہ ساتھ تھے، تنخواہ بند تھی، وہیں فی البدیہ ایک قطعہ کہا اور تنخواہ رکھوالی -

صید ماہی و صید دل شاہا　　خوب ہے اور کچھ نہیں معیوب

جاں ہو اور شکار مچھلی کا　　یعنی تڑپے کا ہے نکالنا خوب

قطب صاحب تھے جب حضور گئے　　وہ دو ماہا گیا ہے میرا توب

اس کو بھی حکم ہو نکل آے　　صبر کب تک دو میں نہیں ایوب

ایک مرتبہ یہ ہوا کہ تنخواہ کٹ گئی، انھوں نے قطعہ پیش کیا اور رقم اٹھائی -

اگر جنگل میں لٹ جائے جو کوئی کیا تعجب ہے　　مگر تحقیق ہو تو چور کی شکل دکھائی ہے

مری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں　　دوھائی ہے بہادر شاہ غازی کی دوھائی ہے

بہر حال سب کچھ کرتے، مگر تنخواہ نہ وقت پر ملتی تھی اور نہ ملی - اس کا رونا اس طرح روتے ہیں :

بندہ وقیں کیوں ہیں چھوڑتے ہر چاند رات کو　　اس کا سبب جو پوچھو عیاں ہے نہاں نہیں

یعنی نہ اس طرح کا ہو جب تک کہ شور و شر　　تنخواہ اور وضع سے ملتی یہاں نہیں

ایک جگه شاعرانه رنگ میں اسی مضمون کو ادا کرتے هیں :

وضع یه کیاهےکه نوکر رکھو' تنخواه نه دو
دوبھی‌پورےمجھےایک‌ماه‌میں‌اےماه‌نه‌دو

تنخواہ نه ملنے کی مصیبت کا جتنا انھوں نے رونا رویا ہے' شاید هي کسی نے رویا هوگا - بادشاہ کو عرضیاں دیں ' شاهزادوں کو‌عرضیاں دیں' اُمرا کو عرضیاں دیں' غرض پیروی کا کوئی دقیقه اٹھا نه رکھا' خدا معلوم اس عرضیوں کی بھر مار سے کوئی نتیجه نکلتا بھی تھا یا نهیں- اس زمانے میں تنخواہ کی تقسیم نواب ظفرالدوله اصغر علی خاں بہادر کے هاتھه میں تھی' ان کو لکھتے هیں :

صبا یه کہه ظفرالدوله سے بصداعزاز
که امر خیر میں تیری رهے قلم‌جاری

خلاف‌وعدۂاحساں زبوں‌هے اےمشفق
زباں سے اپنے کہا تھا مجھے کئی باری

کہ‌جب‌کہ‌آئیگی‌تنخواہ‌حسب‌حکم‌حضور
دوماهه وہ بھی' یہ‌تنخواہ‌لیجئیے‌ساری

وہ شکر هو نه مبدل‌شکایتوں سے کہیں
بدل نہووے وہ دلداری‌یا دل آزاری

بسان آئینه آئین اپنا رکھتا هوں
میں‌صاف‌گوهوں‌نهیں‌آتی مجھکو‌مکاری

تو گل هےگلشن دربار بادشاهی میں
ولے چو غنچه زباں درته زبان‌داری

اس کے بعد بہادر شاہ کے بیٹے مرزا شاهرخ کو کچھه دنوں کے لئے وزارت کا کام ملا - یه تو احسان کے شاگرد هی تھے ' بھلا تنخواہ لینے میں ان سے مدد کیوں نه مانگتے-اِدھر تنخواہ‌رکی اور اُدھر انھوں‌نے عرضی‌دی - ایک عرضی‌بڑے‌مزے کی هے' وہ نقل کرتا هوں :

صاحب عالم و حاجی و وزیر شه هند
اس سے بھی تجھکو زیادہ حشم و جاہ ملے

جس‌طرح‌مجھه‌سےتوملتاهے‌به‌لطف‌واکرام
دین میں تجھه سے اسی طرح سے الله ملے

حق‌تعالیٰ‌کی عنایت سے تجھے‌دنیا میں
صحت و عیش ملے' مقصد دل خواہ ملے

چوبدارآپ نے بھیجا‌ تھا دلانے تنخواہ
که حویلی سے مهینه مجھے هرماہ ملے

چوبداروں کی چھڑي سےنهیں‌ڈرتامختار
کیا کریں وہ بھی که جب ایساهی گمراہ ملے

اب دو فراش ہوں، دو بانس ہوں، دو رسّے ہوں — حکم ایسا ہو تو شاید مجھے تنخواہ ملے
اس پہ بھی جو وہ نہ دیوے اسے لونڈی کی طرح — آج کل اس کی سزا اے مرے اللہ ملے

ان سب عرضیوں میں سب سے زیادہ زور کی عرضی وہ ہے، جو انھوں نے بہادر شاہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ یہ عرضی اس سبب سے بھی دلچسپ ہے کہ یہ اسد اللہ خاں 'غالب' کی عرضی کا نقش اول ہے، وہی زمین ہے، اور وہی طرز سوال۔ ہے تو بڑی ساری مگر پرلطف ہونے کی وجہ سے پوری کی پوری لکھے دیتا ہوں :

اے ملک اے پناہ جملہ ملوک — اے فلک مرتبت، ملک کردار
تجھ سے آباد ہے جہاں آباد — اے جہان کرم جہان وقار
گر تو مہر فلک سے منہ موڑے — تیرے پاؤں پہ وہ رکھے دستار
جو تخلص کو تیرے ورد کرے — نہ شکست اس کو ہو کبھو زنہار
میری طبع غیور کچھ مطلب — نہ کسی سے کہے کم و بسیار
عرض احوال بادشاہوں سے — بادشاہا نہیں ہے لیکن عار
قطب صاحب تھے قبل ازیں جو حضور — بزیارت، برائے سیر و شکار
یہاں شکار اپنی ہو گئی تنخواہ — سیر ہی میں یہ گل کھلا یکبار
کہا جس لالہ سے کہ لا تنخواہ — وہی لالہ ہوا گلے کا ہار
لالہ جی ایسے ہو گئے لے لوٹ — پوست کھینچو تو وہ نہ دیں زنہار
بلکہ دھمکائیں اُلٹا وہ مجھ کو — کہ روہیلہ ہے یہاں کا اب مختار
سردیٔ اہل علم ہے یکسر — لوٹ کی اب ہے گرمیٔ بازار
اور مختار کا تھا یہ احوال — نہ تو اقرار تھا نہ کچھ انکار
اب تو اس کا پتہ نہیں ملتا — اب کی تنخواہ کا کیا تھا قول و قرار
میری تنخواہ کم بہت ہے مجھے — آج دس بیس اور کل ہیں ہزار

جب دو ماہ ہی لٹ گیا میرا (ق) میرے نوکر ہوئے مجھ سے ہیں بیزار

صبح کو میں کہوں کہ آنا تم   شام کو آوے گھر سے خدمت گار

آتے ہی کہوے کچھ تو دلواؤ   بھوک کے مارے نکلے ہے آچار

جب کہ پینس کو لے کے چلتے ہیں (ق) ہیں جو زر غل سے چار پانچ کہار

ان کا معمول ہے کہ دوڑتے وقت   منہ سے بھرتے ہیں اپنے کچھ ہنکار

اپنی ہوں ہوں تو ساری بھول گئے   یہی کہتے ہیں وہ پکار پکار

وقنا ربنا عذاب الجوع   وقنا ربنا عذاب النار

جب یہ صورت بنی تو بنیے سے   قرض کے واسطے کہا ناچار

کہ غریبوں کی بانٹ دوں تنخواہ   بنیا راضی ہوا بصد تکرار

اتنے میں بول اٹھی بنین یہ   کیوں گنواتا ہے اپنا تو گھر بار

مکھیا سور کو دے ہے تیری عقل گئی   قرض دینے کو تو ہوا تیار

اس کی تنخواہ ہے حویلی میں   اے اپونے اسے نہ دے تو ادھار

میرے شاہا ہیں تجھ سے دو مطلب (ق) بار مجرا و دولت دیدار

یہ کہاروں بغیر ہے مشکل   وہ کہاروں بغیر ہے دشوار

ان کو تنخواہ دوں کہاں سے میں   آپ جب اس طرح کا ہوں ناچار

دل سے احساں سے ہے تجھے رغبت   دل احساں ہے تیرا شکر گزار

تیرے احساں کو جو نہ دیکھ سکیں   اُن بخیلوں پہ ہو خدا کی مار

نام احساں رہے نہ دفتر میں   چاہتے ہیں کئی یہ بد اطوار

اور میں کیا کہوں غریب نواز   میں غریب اور یہ غریب آزار

بحر یہ اور ردیف و قافیہ اور   اب غزل کے پڑھوں کئی اشعار

——— (غزل) ———

آتے ہی بس سنائی جانے کی   تجھ کو خو ہے مجھے کڑھانے کی

یہاں ہماری تو جاں سوکھے ہے　　وہاں پڑی اسکو پان کھانے کی
شرق سے مجھ سے یوں بگڑ بیٹھو　　ایک تھیرے نہ منہ بنانے کی
قیس صحرائی اور دعوے عشق　　بات ہی توی جدا بن آنے کی
وہ نہو میں جیوں جگہ نہ رہی　　آئینہ رو کو منہ دکھانے کی
نام رکھوا نہ اپنا ہرجائی　　نہ قبا پہن چار خانے کی
زلف کو چھیڑتے ہی کہنے لگے　　ہے یہی بات مار کھانے کی
زندگی میں بایں تپاک اخلاص　ق　روز دہشت ہے روٹھ جانے کی
بعد مرگ آہ تجھ سے کسکو امید　　جان من فاتحہ دلانے کی
بیٹھ اے آہ بس خدا نہ کرے　　تجکو فرصت ہو سر اٹھانے کی
مستعد بدی ہوا وہ ہی　ق　جس سے کی ہم نے بارہا نیکی
نیکیاں کرکے ہو بدی حاصل　　ہت تری آخری زمانے کی
یاد مسجد میں آئیگی احسان　　کیفیت اُس شراب خانے کی

کھولوں دروازۂ دعا کو میں　　قافیے پہلے پور ہوے درکار
جب تلک مہر و ماہ چرخ پہ ہوں　　جبتلک ہوں جہاں میں لیل و نہار
دھوپ اور چھاؤں جب تلک رہوے　　جب تلک چاندنی ہو اور شب تار
جب تلک ہیں یہ آسمان و زمیں　　جب تلک دشت ہووین اور کہسار
جب تلک فصل گل ہے سال بسال　　جب تلک ہے جہاں میں نام بہار
گل مقصد بہار پر ہو ترا　　اور نخل مراد لاوے بار
ابر نیساں کی طرح دنیا میں　　تیرا دربار ہو سدا دُربار
یعنی دنیا ہو اور بہادر شاہ　　بطفیل محمد مختار

آپ نے ملاحظہ کیاکہ اس قصیدے میں بھی کہیں کہیں رعایت لفظی کو برتا ہے -
ایکی جو روانی اس غرضی میں ہے اور جس طرح واقعات کو بیان کیا ہے وہ احسان

دلوں میں جو فرق پڑ گئے تھے ' ان کا خیال کر کے بادشاہ اگر ذراسی بھی عنایت فرماتے تو یہ خوش ہو جاتے اور چند قطعہ یا قصیدہ لکھ گزران دیتے - چنانچہ شاید بادشاہ نے کبھی یہ کہہ دیا ہوگا کہ " ہم تمہیں جانتے ہیں ' تم ہمیں کیا جانتے ہو " یہ اسی پر خوش ہو گئے —

فرطِ الفت سے یہ فرمایا ظفر نے ' احسان '	ہم تمہیں جانتے ہیں تم ہمیں کیا جانتے ہو
عرض کی میں نے کہ میں ذرہ ہوں اور تم خورشید	فخر ذرہ ہے کہ ذرے کو ذرا جانتے ہو
اور یہ اور عنایت ہے گدا پر اپنے	گرچہ استاد ہو ' شاگرد شہا جانتے ہو

یہی وہ زمانہ تھا کہ اس غریب پر عرصہ تنگ ہو گیا تھا - بچارا (۸۰) برس کا بوڑھا مقابلے کے لئے کھڑا ہوتا ' سخت سے سخت زمینوں میں دو دو اور تین تین غزلیں لکھ جاتا ' مگر یار لوگ مشاعرے میں رنگ نہ جمنے دیتے ' آخر کہاں تک ' بڈھے کو بھی جوش آگیا اور تو کچھ بن نہ پڑی ' غزلوں ہی میں سب کو خوب لتاڑ ڈالا —

میں نے کہا مشاعرے میں چلئے گاہ گاہ	کہنے لگے کہ چاہیے ؟ ہماری بلا چلے
مضمون اپنے باندھ کہ گاہک ہو ایک خلق	چوری کی جنس ہو تو وہ دوکاں کیا چلے

کچھ شعر پہ میرے ہی نہ چشمک ہیں ہزاروں	طعن اس پہ ہے گو بلبل آمل نے کہا ہو
دنیا میں نہ کس طرح سے مغرور ہوں احمق	ہاں ان کی ہی جب شان میں لولا الحمقا ہو
ہے تو بہت بیہودہ گو یاں مجھے منظور	واللہ اگر مجکو کبھی عزم ہجا ہوا
گر میری غزل میں ہو خطا ' کہدو عدو سے	جو منہ پر نہ کہوے تو وہ مادربخطا ہو

بس جیلنے سے جی اپنا ہوا سیر کہ ' احسان '	ہم بزم یہاں تھوڑے ہمارے سفہا ہم

یہ مجلس میں جاتے، لوگ تعظیم نہ دیتے، یہ شعر پڑھتے، لوگ تعریف نہ کرتے، آخر جل کر کہا :

یاد ہے اس رخ کی مجکو مجھ سے ناصح تو نہ بحث   ہٹنا ترک ادب ہے حافظ قرآں کے ساتھ
کب اُٹھے تعظیم کو منعم، اسے تم سو کہو   سی دیے اُس کے سرین ہیں مسند ایواں کے ساتھ

اپنی غزل جو پڑھتے ہیں، کہتے ہیں دوستاں   حضرت بغور سنئے کہ بسیار گرم ہے
جب میں پڑھوں ہوں شعر تو بیچے ہیں کچریاں   کیا ان دنوں میں پھوٹ کا بازار گرم ہے

سخن حضرت احساں پہ، عدو سے کہدو   پھر اگر ناک چڑھائی تو بچا کان نہیں

زمانے کی بے قدری کا یوں رونا روتے ہیں :

جو پوچھا مینے یہ 'صائب' سے میرزا صاحب   کہ میں ہوں بے ہودہ گو یا نہیں یہاں انصاف
کہا کہ تو ہے مدار سخن ولے 'احساں'   "مدار چشم ازیں کور باطناں انصاف"

یقینی تو نہیں کہہ سکتا، مگر بظاہر اس قصیدے میں استاد ذوق کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ قلعے میں ان کو یا تو استاد کہا جاتا یا شیخ صاحب، یہ میں مانتا ہوں کہ استاد ذوق بڑے خلیق تھے، مگر بعض وقت وہ اپنے خیال میں ایسے محو ہو جاتے تھے کہ دنیا و مافیہا کی ان کو کچھہ خبر نہیں رہتی تھی - چنانچہ ایک دن چلم ہاتھہ میں لئے اپنے کابلی دروازے کے مکان سے نکل قلعے چلے آے - ممکن ہے کہ 'احساں' کے ساتھہ بے رخی کی ہو اور انہوں نے یہ واقعہ لکھہ مارا ہو، یہ ماننا پڑیگا کہ قطعے کے الفاظ کسی واقعے کی طرف ضرور اشارہ کر رہے ہیں —

کل شیخ کے گھر میں ہی ملا دختر رز سے (ق)   کچھہ منہ سے نہ بولا مجھے مہماں سمجھکر
تعظیم نہ کی اس خر مغرور نے میری   ہم شاعر و ہم حافظ قرآں سمجھکر

تقصیر نہیں اس کی یہ ہے اپنی حماقت   کیوں آیا گدھے پاس میں انسان سمجھ

بڑھتے بڑھتے قصہ یہاں تک بڑھا کہ اپنے شاگردوں سے بھی بگڑ بیٹھے۔ کہتے ہیں
بیٹا نواب! بن کر شاعری نہیں آتی، "حلوا خوردن را روے باید" کچھ محنت بھ
کرنی پڑتی ہے :

میں نے احساں سے کہا خسرو شیریں سخناں   دل سے تم رکھتے نہیں مجھ پہ عنایت شا
میں تو اصلاح کو لیتا ہوں بامید کہ ہو   بزم شیریں سخناں میں مجھے ثروت شا
سن کے فرمانے لگے "میں تو ہوں حاضر لیکن   عشق شیریں دہنی باید و محنت شاید

اس زمانے میں جو کشمکش مرہٹوں اور سلطنت مغلیہ کے درمیان ہو رہ
تھی، اس کا بھی پتا ان کے اشعار سے چلتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شہر مردم
گردی سے بالکل تباہ ہوگیا تھا، آسودگی نام کو نہیں رہی تھی، نفسانفسی کا عالم تھ

اے اہل دل خدائی دل نے یہاں دکھائی   دلی میں تھا جو دیکھا کوے بتاں میں دیک

میں تو اس شعر کے یہی معنی سمجھتا ہوں کہ اہل دل! آج کل دلی کا یہ حال
کہ یہاں بتوں کی طرح ہر شخص دعوے خدائی کرتا ہے اور تباہی و بربادی کے اع
سے دلی کو اگر کسی سے مشابہ کہا جاسکتا ہے تو وہ "کوے بتاں" ہے۔ ایک اور غزل

بصد کرشمہ وہ اکدم جو انجمن میں رہے   نہ تاب نالہ ہو دل کو، نہ دم دہن میں ر
وہ زلف دیکھ کے زاہد تو ماؤمن میں رہے   جو کاٹ جائے یہ ناگن تو من کی سن میں ر

اس میں دہلی کا حال لکھتے ہیں :

یہ دلی مردم قابل کا بن تھا، اب لیکن   یہ بن کٹی ہے کہ بن مانس ایسے بن میں ر

اور دہلی کی اشراف گردی کا رونا اس طرح روتے ہیں :

یہ دور آیا کہ مختاری کو دوڑے   شہ دوراں کی، ہم بقال و بنوا
نہ ہر فرقہ کو ہیں فرقہ میں حایک   بنے ہر سلخ کو قصاب نوا
بس اب توبہ گناہوں کی کہ تو ہے   الہ العالمین غفار و توا

قلعے کی تباہی کو پردے ھی پردے میں یوں ظاہر کرتے ہیں :

دکھایا زلف کا عالم تو اس میرا یہ عالم ہے　　اساس صبر برہم ہے، بنائے عقل درہم ہے
نہیں ہے خرمی زیر نگیں تاجداراں بھی　　اگر شاہ جہاں یوں ہے براے نام خرم ہے

اس شعر میں لطف یہ ہے کہ شاہجہاں بادشاہ کا نام خرم تھا۔

شاہ عالم ثانی کا زمانہ عجیب مصیبت کا زمانہ تھا۔ سکھوں کا زور ہوا، پٹھانوں کا زور ہوا، مرہٹوں کا زور ہوا، انگریزوں کا زور ہوا۔ غرض آئے دن کے حملوں سے دھلی کے انجر پنجر ڈھیلے ہوگئے، امیر لٹ لٹاکر فقیر ہوگئے، حویلیاں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہوگئیں، شہر پناہ سے باہر جانا گویا دنیا سے جانا تھا۔ اس زمانے میں امیرالامرا ذوالفقارالدولہ مرزا نجف خاں بہادر غالب جنگ وزیر تھے۔ یہ ایران کے شاہزادے تھے، مگر زمانے کی گردش سے دھلی آگئے تھے، وہ گردش یہاں بھی ان کے ساتھ آئی، بادشاہ نے ضابطہ خاں کو علحدہ کرکے ان کو وزیر بنایا تھا۔ ضابطہ خاں نمکحرام مرہٹوں سے جا ملا۔ تکوجی ھلکر نے دلی پر حملہ کیا اور سنہ ۱۱۸۶ ھ میں نجف خاں کو شکست دے کر دھلی پر قبضہ کر لیا۔ اب کیا تھا، ضابطہ خاں امیرالامرا بنے، نجف خاں اِدھر اُدھر چھپتے پھرے۔ اسی زمانے میں 'احسان' نے یہ شعر کہے ہیں :

گر تیغ کھینچئے کا، کھنچے جائے کا میاں　　ہے گنپتی کا زور، نجف خاں کا ہوچکا

فوج غم ھلاکر کردل پر مرے، اے جان من　　کیا ستم ہے آپ اب ھلکر کے لشکر جائیں گے

نجف خاں کی لڑکی کی شادی 'احسان' کے بڑے لڑکے سیف الرحمن خاں سے ہوئی تھی۔ اس طرح 'احسان' اور نجف خاں سمدھی تھے۔ لڑائی میں نجف خاں کی بہادری دیکھکر ھلکر نے اُن کو اپنے لشکر میں رکھ لیا اور بڑی قدر و منزلت کی۔ شاید اسی واقعے کو 'احسان' نے دوسرے شعر میں ظاہر کیا ہے۔

پنجاب میں سکھوں کا زور ہوا، اس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں :

چشم و دل، جان و جگر، میں، بحر الفت، ہیں یہ پانچ
ان پہ زلف و خال و خط ہر اک تسلط یاب ہو
صد ہزار افسوس ہے یا پنجتن، آٹھوں پہر
پنجۂ کفار میں یوں کشور پنجاب ہو

آخر لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر مرہٹوں کا زور توڑا، بادشاہ کو کمپنی کے زیر حمایت لیا، جب کہیں جا کر چین چان امن آمان ہوا ۔ اس کا ذکر اس طرح اپنے اشعار میں کرتے ہیں :

ابرو کے بھی اشارے میاں بھول تم گئے   ہاں کمپنی کا دور ہے تلوار کیا چلے

مذہب | اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عقیدے کے لحاظ سے سنی اور ارادت کے لحاظ سے قادری تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی نعت میں ایک قطعہ کہا ہے اور خوب کہا ہے :

عید کے دن فلک نے مجھکو کہا   آؤ ہم تم بھی ہوویں ہم آغوش
میں نے غصے سے یہ کہا اس سے   کیا تو بکتا ہے بے ادب خاموش
میں غـــلام محـــمـــد عربی   مجھ سے تو ہو سکیگا دوش بدوش؟
سن کے سن ہوگیا فلک یہ سخن   اور جاتے رہے یکایک ہوش
بعد اس کے سمجھ کے کچھ دل میں   بولا بیجا ہے تیرا جوش و خروش
وہیں دکھلا کے پور ہلال عید   یہ لگا کہنے چرخ اطلس پوش
تو فقط ہی نہیں غلام 'احسان'   میں بھی اس کا ہوں دیکھ حلقہ بگوش

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

غلام کمتریں کس کا ہوں دیکھو اے ملائک تم   گنہ میرے نہ دیکھو، جانب خیر البشر دیکھو

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں لکھتے ہیں :

فکر شراب دل میں ذکر بتاں ہے لب پر   میری دعا الٰہی ہو مستجاب کیونکر
وقت مدد ہے شاہا! کوہ گنہ ہے سر پر   سر خاک سے اٹھاؤں یا بو تراب کیونکر

رتبہ اعلیٰ ہے اس کا صلّ علیٰ   ذات مولیٰ علی عجب شے ہے

میں کون ہوں، کیا چیز ہوں، یا شاہ تمہارا   جبریل سزاوار ہے گر مدح سرا ہو
ہے حکم خدا سے وہ ترا حکم کہ وہ ہیں   پھر جائے ترے حکم سے گر حکم خدا ہو
حل کیجے مرے عقدے عنایات سے اپنی   شاہ دوسرا، شیر خدا، عقدہ کشا ہو

دیکھنا کس خوبصورتی سے خلیفۂ چہارم کی تعریف کی ہے اور کس خوبی سے آپ کی فضیلت بیان کی ہے :

پنچہ بو تاب خوارج ہے وہ یار چار میں   ہو زماں، ہفت آسماں ہوں جسکو ششدر دیکھکر
پربھا ہوتا ہے 'احساں' میوۂ فصل اخیر   میں یہ سمجھا رتبۂ والائے حیدر دیکھکر

اسی طرح خلفائے اول و دوم کی فضیلت کا ایک نیا پہلو نکالا ہے :

مدفن مومن اگر ہو شاہ مرداں میں تو پھر   اور ہی رتبہ ہے اس کا خالق اکبر کے پاس
قدر بو بکر و عمر وہ ہے کہ بعد مرگ بھی   منکرو دیکھو کہ آسودہ ہیں پیغمبر کے پاس

دلی میں صفدر جنگ کے مقبرے کے سامنے ایک احاطہ ہے، جس میں تعزیے دفن ہوتے ہیں، اس جگہ کو "شاہ مرداں" کہتے ہیں - لوگوں کا خیال ہے کہ جو یہاں دفن ہوا وہ یقیناً جنتی ہے - اسی خیال پر مضمون بالا لیا گیا ہے -

حضرت شہید کربلا کی شان میں کہتے ہیں :

'احساں' خدا کہ دل سے 'احساں'   قربان شہید کربلا ہے

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو خاص عقیدت تھی - اور اسی لئے میرا خیال ہے کہ یہ سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے - آپ کی شان میں کہتے ہیں :

سو بار گر مسیح جلائے تو یوں کہوں بندہ غلام عیسیٰ جیلاں کا ہو چکا

شہ جیلاں کے مرقد کو نہ دیکھوں اک دن اور فرقت کی ہمیشہ شب تار آئے نظر
جسکے دیکھے سے مرے بخت سیہ ہوویں سپید یا الٰہی مجھے وہ سبز مزار آئے نظر

کیا کروں سلطنت جم کو کہ جم جم ہو نصیب آستاں شہ جیلاں کی گدائی مجکو
نثار خاک پاک شاہ جیلاں کیوں نہ ہو احساں نواسہ وہ نبی کا اور پوتا وہ علی کا ہے

ایک مشہور رباعی ہے :

اے خالق ہر بلند و پستی شش چیز عطا بکن زہستی
علم و عمل و فراخ دستی ایمان و امان و تندرستی

اس رباعی پر ان کی بھی ایک رباعی ہے :

شاہ جیلاں مدد بہ حق حیدر حاصل ہوں یہ سات مجکو ، قصہ یکسر
ایمان و اماں و جنت و حور و قصور دیدار خدا ، شفاعت پیغمبر

یہ تو میں نے چند اشعار نقل کردیے ہیں، ورنہ دیوان میں جا بجا یہ مضموں آیا ہے —

معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ سے ان کو خاص عقیدت تھی - کرنال میں سید علی المتخلص بہ حسینی کوئی فقیر کامل تھے، ان کو لکھتے ہیں :

صبا گزر ہو اگر تیرا جانب کرنال یہ عرض کیجو حسینی سے تو پس از آداب
کہ میں ہوں تشنہ، تو فرزند ساقی کوثر شراب کو ہوں ترستا جہاں تہاں ہے سراب
تو گر شراب حقیقت ہزار خم داری سبک بیا و منے خاکسار را در یاب

یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ دھلی میں مرجع خلائق بنے ہوے تھے - حافظ "احساں" کو بھی ان سے خاص تعلق تھا ، ان کی تعریف

میں لکھتے ہیں :

اے خامۂ پختہ کار احساں — اے کلک گہر نگار احساں
آں بہ کہ گہر نگار سازی — بر مالک ملک دل نوازی
اسمش عبدالعزیز خوانند — در مصر وفا عزیز دانند
آنانکہ کنند عزم عزت — خوانند عزیز در عزیمت
ابن ولی و ولی مولا — تاج عرفا، عزیز دہلا
سر دفتر اصفیاے افضل — سر کردۂ اتقیاے اکمل
شمس العلماو بدر اسلام — فخر الفضلا و صدر ایام
صدرش ز علوم دیں لبالب — جامش ز مئے یقیں لبالب
حسان عرب ز تر زبانی — سحبان عجم بہ خوش بیانی
دہلی کہ بود ما چو دہقاں — زاں گل گشتہ ہمہ گلستاں
زاں ماہ منور است ایں شہر — در دہر ندیدہ کس چنیں شہر
چوں او شدہ تکیہ گاہ دہلی — ہمسنگ بکوہ، کاہ دہلی
ز آوازۂ اوست کام بردہ — دہلی کہ دہل بہام بردہ
علمش ہمہ داں نمودہ ما را — ہم راہ خدا نمودہ ما را
زاں باغ صفا کسے کہ بر خورد — از نخل حیات خویش بر خورد
خوردہ است کسیکہ بوسہ زاں پا — آداب خضر نہ خوردہ اصلا
خوردنہ شہاں جہان فانی — او خوردہ بہشت جاودانی
حرفیکہ از آں دہن بر آید — کج باز براستی در آید
تیغ آختہ از زبان کفار — ما اعظم شانک اے نکوکار
پیشش چہ بود کمال طوسی — چوں مور بطاس، حال طوسی
از منطق خوش بخوش عیانی — ذات تو نتیجۂ معانی
یک غنچہ ز باغ تو ریاضی — اے گل تو بہار ابن رازی

آنانکہ عقول عشرہ خوانند   پس یازدہم ترا بدانند
اے وارث انبیاے اصدق   اے نائب اولیاے برحق
دارم ز عنایتت رجائے   للہ بہ حق من دعائے

اس مدح کو تقریباً پورے کا پورا میں نے اس لئے لکھ دیا ہے کہ 'احساں' کے فارسی کلام کا بھی اندازہ ہو سکے —

پیران طریقت کی محبت میں ان کو یہاں تک غلو تھا کہ وہ سجدۂ تعظیمی کو جایز سمجھتے تھے ۔ ذرا دیکھیے کا کیا خوبصورت وجہ قائم کرتے ہیں اور اس سجدے کے منکروں کو کس خوبی سے شیطاں بناتے ہیں :

تعظیم جناب اولیا ایماں ہے   ہے مظہر حق وہیں جہاں انساں ہے
کر سجدۂ تعظیم بزرگوں کو ضرور   آدم کو جو سجدہ نہ کرے شیطاں ہے

قادریہ سلسلے میں تھے ' اس لئے حال قال کی مجلسوں سے ذرا پرہیز کرتے تھے' چنانچہ ایسی مجلسوں پر یوں چوٹ کرتے ہیں :

راگ سنتا ہے دل سے اے مرغے   نہ سنا دھیاں سے اذاں کو حیف

مجلس کا حال ہم کو ہے معلوم شیخ جی   اب ناچ ہے زمانۂ ماضی میں حال تھا

دیوان دیکھنے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ شاہ 'ابوسعید' کوئی بزرگ تھے' اُن کے مرید تھے ' چنانچہ اپنے پیر کے انتقال کی تاریخ یوں لکھتے ہیں :

از حج فراغ یافتہ در رہ وفات یافت   در روز عید مرشد من شاہ بو سعید
احساں چو ذات بابرکاتش سعید بود   تاریخ گفت در عربی " ذاتہ سعید "

۱۲۵۰ ھجری

یہ وہ زمانہ تھا کہ غیر مقلدین کا دلی میں زور تھا ادھر حضرت سید احمد

شہید ۱۲۴۶ھ میں سکھوں کے خلاف جہاد پر کھڑے ہوے، اُدھر ان کے خلیفہ حضرت شاہ اسمعیل نے دلی میں مقلدین کے لباس، طرز و روش اور خیالات پر حملے شروع کئے، کچھ لوگ ادھر ہوگئے، کچھ لوگ اُدھر - حکیم مؤمن خاں 'مؤمن' نے جہاد کی تاریخ کہی :

وہ شاہ مملکت ایماں کہ جس کا سال خروج | امام بر حق مہدی نشاں علی فرهے
۱۲۴۷ھ

ان مجاہدین نے پشاور فتح کرلیا، پنجاب کی طرف بڑھے، سکھوں نے ان سے سرحدیوں کو توڑ لیا، سید صاحب کو شکست ہوئی اور وهیں شہید ہوے - مخالفین تو موجود هی تھے، انہوں نے تاریخیں کہیں، مذاق اُڑایا، چنانچہ شاہ نصیر دهلوی کا قطعہ ہے :

کلام اللہ کی صورت ہوا دل اُن کا سیپارہ | نہ یاد آئی حدیث اُن کو، نہ کوئی نص قرآنی
هرن کی طرح میدان وغا میں چوکڑی بھولے | اگرچہ تھے دُم شملہ سے وہ شیر نیستانی

عبدالرحمن خاں 'احسان' بڈھے ہوچکے تھے، انھوں نے جہاد یا شکست پر تو کچھ نہیں لکھا، هاں ان کو مجاهدین کی ظاهر پرستی بری معلوم ہوئی، اسی پر ایک چھوٹا سا حملہ کردیا :

واعظا میرا تکفر بہ تعصب مت کر | کہ تشہد کا بدل کرتا ہوں اقرار مدام
نخوت و جبۂ و عمامہ سے کیا کام مجھے | مجھے ان کاروں سے البتہ ہے انکار مدام

مخالفت کی انتہا تو اس شعر میں کردی ہے، شاہ محمد اسمعیل (رح) نماز پر بہت زور دیتے تھے، مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر مسجد میں لے جاتے، کسی کی لبیں بڑھی ہوئیں تو زبر دستی سر بازار قینچی سے کتر دیں، پیجامہ ٹخنے سے نیچا ہوا تو وهیں پھاڑ کر برابر کردیا - ایسی حرکتوں پر 'احسان' نے جل کر کہا ہے :

همیں تو روزہ اس ایام نحس میں ہے ضرور | نماز پڑھتے هیں جب هم کہ بےنماز ہو تم

ذرا اس قطعے کو سنیے - غیر مقلدوں کو کیسی کھری کھری سنائی ہے اور حکیم مؤمن خاں مؤمن پر کیا صاف هاتھ مارا ہے :

جو اہل تسنن پر آوازے کسے، نا کس　　شاگرد ہے شیطاں کا ابلیس مقرر ہے
مردود ہے، ملعوں ہے، مطعون خلائق ہے　　مسلم نہیں، مشرک ہے، مؤمن نہیں، کافر ہے

تلمذ | یہ پتہ نہیں چلا کہ یہ کس کے شاگرد تھے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی غالب کی طرح کسی کے شاگرد نہیں ہوئے، صرف مطالعے کے بل پر شاعری کی اور استاد ہوگئے۔ غالب نے ایک خیالی شخص عبدالصمد کو اپنا استاد بنایا اور انہوں نے حضرت امیر خسرو (رح) کی روح سے مدد لی، چنانچہ فرماتے ہیں :

طوطی ہند کی وہ روح سے ہم فیض تھے　　تھے "احساں" نہ کبھی بلبل آمل پہنچے

میں نے سلسلۂ تلمذ معلوم کرنے کے لئے بہت سی کتابیں دیکھیں، لیکن ان کے استاد کا کہیں نام نہ ملا، ہاں اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ ریاضی، جو دہلی کے مشہور ریاضی داں مولوی مرتضیٰ کے شاگرد تھے۔ ان کی وفات کی تاریخ لکھی ہے اور خوب لکھی ہے، مادۂ تاریخ تو ایسا ہے کہ سبحان اللہ۔ قطعۂ تاریخ رحلت استاد خود گوید :

اے چرخ فتنہ گر یہ ستم تو نے کیا کیا　　رنج و غم و الم کا مجھے مبتلا کیا
دل کا مرے چراغ ستمگر بجھا دیا　　داغ فراق مولوی مرتضیٰ دیا
وہ یادگار دورۂ ماضی کہاں گیا　　طاؤس باغ علم ریاضی کہاں گیا
وہ عالم و محدث و حافظ کدھر ہے آہ　　کس طرح کھینچوں آہ کہ بیٹھا جگر ہے آہ
تھو خدا میں تو ہو گرفتار اے اجل　　اٹھ جائے یوں جہان سے وہ فاضل اجل
اے تم ہمارے درد کے درماں کدھر گئے　　"احساں" کو چھوڑ قبلۂ "احساں" کدھر گئے
ماہ صفر میں گرچہ سفر سے حذر کیا　　آخر سفر ہوا تو پھر آخر سفر کیا
جس ماہ میں گئے تھے* محمد خدا کے پاس　　پہنچے اسی مہینے میں وہ مصطفیٰ کے پاس
تاریخ میں نے یہ کہی "احساں" وفات کی　　یوم الوفات ان کا ہے پہلی وفات کی

---

* مادۂ تاریخ میں رعایت لفظی ضرور ہے مگر ایسی ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ دہلی میں ربیع الاول کو وفات یا وفاتوں کا مہینہ کہتے ہیں —

احسان کا لکھنؤ جانا

خمخانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان' بزمانۂ وزارت نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خاں دہلوی لکھنؤ بھی گئے تھے' مگر وہاں ان کے کمال کی قدر نہیں ہوئی' اس لئے نا کام واپس آے - مجھے بڑا تعجب تھا کہ ایسا بڑا امیر دہلی چھوڑ کر نوکری کی تلاش میں لکھنؤ کیوں گیا - کوئی شاعری پر تو اس کا گزارہ تھا ہی نہیں' پھر بلا وجہ وطن سے آوارہ ہونے کی اس کے دل میں کیوں سمائی' آخر ڈھونڈ تے ڈھونڈ تے پتہ لگ ہی گیا - اس واقعے کو میں ذرا وضاحت سے لکھتا ہوں اور یہ بھی اچھی طرح بتا دیتا ہوں کہ یہ سید فضل علی خاں کون تھے' ان سے کیا توقعات تھیں اور انھوں نے کیا کیا —

جب غازی الدین حیدر کو بادشاہ بننے کا شوق ہوا تو انھوں نے رزیڈنٹ کے ذریعے سے کمپنی کو گانٹھنا شروع کیا - کمپنی تو خدا سے چاہتی تھی کہ کسی طرح اودھ کا دہلی سے رشتہ ٹوٹے - وہ فوراً ان کو بادشاہ بنانے پر راضی ہو گئی' ساتھ ہی اکبر شاہ ثانی کو لکھا کہ آپ شاہنشاہ ہیں' اگر آپ کا ایک وزیر بادشاہ ہوجاے تو کیا حرج ہے - بھلا بچارے اکبر شاہ کیا اور ان کی راے کیا' جو کمپنی بہادر نے کہا وہ انھوں نے قبول کیا - غرض ۱۸ ذیحجہ ۱۲۳۵ ھ مطابق ۱۸۱۸ ع کو غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ بن گئے - انھوں نے اکبر شاہ کو بہت کچھ تحفے تحائف بھیجے اور اسی نامۂ و پیام میں سید فضل علی خاں لکھنؤ پہنچ گئے —

فضل علی خاں سید اور پکے سید تھے - جب شاہ جہاں نے شاہ جہاں آباد بسایا تو چار خدمتوں کے لئے مکہ معظمہ سے چار نجیب الطرفین سید بلواے - ایک کو جامع مسجد دہلی کا امام کیا' دوسرے کو امام عیدگاہ بنایا' تیسرے کو فیلبانی کا پیشہ اور چوتھے کو حجامت بنانے کا کام سکھایا - پہلی تین خدمتوں کے لئے تو سیدوں کی یوں ضرورت پڑی کہ بادشاہ کو ان کے پیچھے کھڑے ہونا یا بیٹھنا

چڑ تا تھا - اور چو تھی خدمت کے لئے سید کی اس لئے حاجت ہوئی کہ بادشاہ کو اس کے سامنے سر جھکانا ہوتا تھا —

جن سید صاحب کو فیلبان کیا گیا تھا ' ان کی اولاد میں سید فضل علی خاں تھے - بھلا یہ بادشاہ سلامت کی سفارش لے کر جائیں اور لکھنؤ میں ان کی آؤ بھگت نہ ہو ' جاتے ہی وہاں داروغہ ہو گئے اور تھوڑے ہی دنوں میں انھوں نے معتمد الدولہ وزیر کو کچھ اس طرح ہاتھ میں لیا کہ سب جزو کل کے مالک بس یہ ہی تھے - یہ اس بلا کے سخت تھے کہ خدا کی پناہ ' اور ساتھ ہی جوڑ توڑ کا وہ مادہ ان میں بھرا تھا کہ توبہ ہی بھلی - ایک دن ولیعہد بہادر نے سات روپے میں ایک کبوتر کا جوڑا خریدا اور ان کو لکھ بھیجا کہ روپیہ ادا کردو - انھوں نے روپیہ دینا تو کیسا رقعے کا جواب تک نہیں دیا - ایسی ہی باتوں سے محل والوں نے ان کی اکھاڑ پچھاڑ شروع کی - آخر ۱۹ - محرم ۱۲۳۸ ھ کو لکھنؤ سے بھاگ سیدھے دھلی آے اور کچھ دنوں یہاں رہ کر بنارس چلے گئے - نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ان کی قسمت نے پھر پلٹا کھایا ' بلاے گئے ' اعتماد الدولہ خطاب ملا اور وزیر کردیے گئے - 'ناسخ' نے ان کی وزارت کی تاریخ ''دھت دھت بری بری'' (۱۲۴۲ھ) سے نکالی - (ہاتھی کو چلانے کے لئے مہاوت ' دھت دھت ' اور روکنے کو ' بری بری' کہتے ہیں) - ان کے تعلقات رزیڈنسی سے بہت اچھے تھے ' ہر بات میں بادشاہ کو دبا تے اور جو کاغذ رزیڈنٹ ان کو دیتا اس پر بادشاہ کے دستخط لے آتے - نتیجہ یہ ہوا کہ تمام شاہزادے اور امرا ان کے خلاف ہو گئے اور سوچتے سوچتے یہ ترکیب نکالی گئی کہ اکبر شاہ کے ذریعے سے سید صاحب کو کچھ افہام وتفہیم کی جاے - چپکے چپکے کاغذی گھوڑے دوڑاے گئے اور حافظ عبدالرحمن خاں ' احسان ' جواب کی شکل میں لکھنؤ آے - چونکہ رزیڈنٹ کے خاص الخاص آدمی کے خلاف یہ کارروائی ہو رہی تھی ' اس لئے حافظ صاحب نے اپنی اصل غرض کو چھپا کر یہ مشہور کیا کہ میں نوکری کی تلاش میں آیا ہوں ' مگر سید فضل علی خاں بھی دلی والے

تھے ، وہ ان ہتکنڈوں کو خوب سمجھتے تھے - ان کی صرف ایک لڑکی تو ان کے ساتھ لکھنؤ میں تھی ، باقی دو بیٹیاں اور سارے کا سارا خاندان دہلی میں تھا - اگر اکبر شاہ کا کہا نہیں مانتے تو مشکل اور مانتے تو مشکل - انھوں نے ترکیب یہ کی کہ حافظ عبدالرحمن خاں سے ملاقات کرنے ہی سے انکار کر دیا - حافظ جی بھی بڑی چلتی رقم تھے ، انھوں نے سید صاحب کے والد سید غلام حسین کو گانٹھنا شروع کیا ، اسی زمانے میں سید غلام حسین نے ایک مسجد مفتی گنج میں بنوائی تھی ، انھوں نے اس کی تاریخ کہی ، وہ تاریخ میر صاحب کو ایسی پسند آئی کہ کندہ کرا کے مسجد کی رو کار میں لگوادی ، تاریخ یہ ہے :

جناب سید عالی نسب غلام حسین — خدا ز فضل علی مقصدش قبول کند
بساخت مسجد و تاریخ آں بگفت 'احساں' — نماز بندہ در یں جا خدا قبول کند
۱۲۴۳ ھ

یہ سب کچھ ہوا، مگر سید فضل علی خاں سے ملنا نصیب نہ ہوا - جب اس طرح کام نہ چلا تو سید صاحب کے خسر نواب صادق علی خاں پر ڈورے ڈالنے شروع کئے - وہ بھی اپنے داماد سے کم نہ تھے ، وہاں بھی دال نہ گلی اور انھوں نے بھی ملنے سے انکار کر دیا - حافظ جی ان کو ایک رقعے میں لکھتے ہیں :

کہیو نواب سے اے مخلص صادق میرے — شہر میں تیرے عجب طرح کا دیکھا ہے رواج
نام احساں سے یہاں ننگ ہے آنا سب کو — تنگ ہوں، میری ملاقات نہ کل تھی نہ آج
غرض کردم کہ بیاد تو دلم خرسنداست — لیکن ایں دیدۂ دیدار طلب راچہ علاج

آخر جب ملنے کی کوشش کرتے کرتے تھک گئے تو صلواتوں پر اتر آئے - ذرا دیکھنا کس طرح اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں اور کس طرح ان کی فیلبانی پر چوٹ کی ہے :

صبا یہ کہیو تو فضل علی سے اے نواب — کہ قدر نعمت احساں نہ تم نے سمجھی حیف
جو اپنی فیل سواری کا آپ کو ہے گھمنڈ — شروع کرتا ہے بندہ بھی پھر الم ترکیف

سید فضل علی خاں نے اِس پر بھی ان کو نہ بلایا ، اب کیا تھا، انھوں نے واقعی

"الم ترکیف" پڑھنی شروع کی ' یعنی یہ کیا کہ نصیرالدین حیدر سے مل سید صاحب کے کرتوتوں کا کچا چٹھا جا سنایا' اب کیا تھا' نواب آگ بگولا ہوگئے۔ ادھر انھوں نے کان بھرے ادھر محل والوں نے شکایتوں کے دفتر کھولے' نتیجہ یہ ہوا کہ بچارے سید فضل علیخاں عتاب شاہی میں آگئے اور چند ہی روز میں اسی صدمے سے ۱۹ شوال ۱۲۴۵ ھ مطابق ۱۸۲۹ ع کو دنیا سے رخصت ہوے اور حافظ عبدالرحمن خاں 'احسان' اس طرح ایک "صاحب فیل" کو ٹھکانے لگا دھلی آگئے - اس واقعے سے نہ صرف ان کے لکھنؤ جانے کا حال معلوم ہوتا ہے' بلکہ مسجد کی تاریخ اور سید فضل علی خاں کے انتقال کی تاریخ ملا کر دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہاں ان کا قیام کوئی سال بھر کے قریب رہا اور یہی وجہ تھی کہ لکھنؤ کے بعض الفاظ ان کی زبان پر چڑھ گئے تھے اور بلا ارادہ ان کی قلم سے نکل جاتے تھے - ان کا ایک شعر ہے :

بوسہ مانگا ہم نے دھمکا کر تو یوں کہنے لگا   اے تو دھمکی سے تمھاری کیوں نہ ہم ڈر جائیں گے

ایسے موقعے پر "اے تو" کا لفظ صرف وہی لوگ استعمال کرسکتے ہیں جو کچھ دنوں لکھنؤ میں رہے ہوں - لفظ تو لفظ دوسرے مصرع کی پوری بندش اور ترکیب خاص لکھنؤ والوں کی ہے —

شاگرد یوں تو سارا قلعہ ہی ان کا شاگرد تھا' مگر ان کے دو شاگردوں نے استادی کا درجہ حاصل کیا - ایک شاہزادہ معزالدین ' ثابت' اور دوسرے صاحب عالم مرزا قادر بخش 'صابر' - ' ثابت' تو وہی ہیں جنھوں نے ان کے دیوان کا دیباچہ لکھا ہے اور ان کے متعلق خود 'احسان' کے بعض شعر دیوان میں موجود ہیں - مثلاً :

غزل نہ کیونکہ پڑھوں دوسری کہ اے 'احسان'   معرکے آج ہے ' ثابت ' سا میرزا میرا

اور صابر وہ ہیں ' جنھوں نے ان کے مرنے کی تاریخ کہی ہے اور اپنے تذکرہ "گلستان سخن" میں استاد کی سچی تعریف کرکے حق شاگردی ادا کیا ہے -

صابر کو ایک خط کا جواب اور عیدالضحی کی تہنیت اس طرح دیتے ہیں:

صبابہ صابر رشک صبوری و صبری | یہ کہیو میری طرف سے کہ اے بالمد مقام
وہ قطعہ قاطع صفر اے غم جو بھیجا تھا | پڑھا ہے اس ترے مداح نے حرف حرف تمام
پسند خاطر 'احساں' نہ کیوں ہوں تیرے سخن | کہ تو سلیم طبیعت ہے اور کلیم کلام
یقین ہے، تو وہ تیرے سخن کا درد آلود | بسان 'قدری' و 'تاباں' ہیں تیرے چند غلام
اگر چہ کام دو صد ہوویں ملحق یک تن | جو کام کا ہے وہ اک دل کو کب رکھے قا کام
حقیقتاً ہے کہ اصلاح رو برو ہے خوب | یہ خوب سمجھو کہ ہے خوب کا تو خوب انجام
نہیں ہے شبہہ کہ استاد بھی ہے مثل پدر | شفیق و خیر طالب، باعث نکوئی نام
نصیب تجھکو ہو یارب سعادت ابدی | سعید تجھکو یہ عیدالضحیٰ علیک سلام

عبدالرحمن خاں 'احسان' واقعی اپنے شاگردوں کو اپنے بچوں کی طرح چاہتے تھے اور بعض خاص خاص شاگردوں سے تو یہاں تک یگانگت تھی کہ ان کے گھر میں ان سے پردہ تک نہ رہا تھا - ان کے چار شاگرد مرزا معزالدین 'ثابت' مرزا قادر بخش 'موزوں' مرزا پیارے 'رفعت' اور مرزا قادر بخش 'صابر' ان کے گھر میں بلا تکلف آتے جاتے تھے - استاد نے بھی شاگردوں کی تربیت میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی اور ان چاروں کو صاحب دیوان ہی نہیں، استاد کردیا -

اپنے بیٹوں کو نصیحت

ان کو جس طرح اپنے شاگردوں کا خیال تھا، اسی طرح اپنے گھر والوں اور خاص کر اپنے بیٹوں کا بھی تھا - اپنے دونوں بیٹوں سیف الرحمن خاں اور عبدالحکیم خاں کو نصیحت کرتے ہیں :

اے نور دو چشم و جان، احساں | اے عبد حکیم و سیف رحمن
چوں حفظ کلام حق نمودید | از خلد درے برخ کشودید
هر هفته کنید ختم قرآں | هر هفت چنیں کنند مرداں
سیپارۂ اوست چارۂ دل | چوں هشت بهشت هفت منزل
باشید نه در جهاں ملوث | گردید مفسر و محدث

اپنے اعمال کی شکایت اور شعر گوئی کی مذمت کرتے ہیں:

بر خود کردم ز جہل بیداد　　جدے بکنید ہم چو اجداد
در علم و عمل چو من مباشید　　محو شعر و سخن مباشید
خاطر نہ کنید زیں پریشاں　　دیوانگی است جمع دیواں
کو قدر شناس آں نماند ند　　عیسیٰ رفت و خراں بماند ند
ہر طور سخن منم کلیمے　　بخشند نہ ایں خساں گلیمے
کو شاہ جہاں بزر کہ سنجد　　عیب است ہنر، ہنر کہ سنجد
سنجیدہ سخن بگفتم اے وا　　مداح شہے شوم کہ حقا
در خلد بیک نفس رساند　　صد قصر ز مردم دہاند
بر تخت بہشت جا گزینم　　صد تاج شرف بسر ببینم
ایں مژدہ دگر ولا شنیدی　　فرمودہ کہ لا تخف مریدی

یہاں سے حضرت غوث پاک کی مدح شروع ہو جاتی ہے —

احسان کی شکل و صورت و دیگر حالات

'احسان' کی شکل و صورت کے متعلق اب تک بڑی غلط فہمی رہی ہے - شاہ 'نصیر' کے اس شعر کو ان سے متعلق کر کے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بڑے کالے کلوتے تھے:

اے خال رخ یار تجھے ٹھیک بناتا　　جا چھوڑ دیا حافظ قرآں سمجھ کر

مگر اب جو ان کی تصویر دیکھی اور آغا حیدر حسن صاحب کی یادداشتوں سے اس کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ 'احسان' نہایت خوبصورت آدمی تھے - بہت سرخ و سفید رنگ تھا - نیچی سفید داڑھی تھی مگر چھدری - گھر میں سفید نیچا کرتا، ایک بر کا سفید پیجامہ اور سفید چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے - جب دربار میں جاتے تو کھڑکی دار پگڑی اور چپکن پہن کر اور کمر سے پٹکا لپیٹ کر جاتے —

آغا صاحب کی یادداشتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کچھ دنوں یہ دہلی کے

وزیر بھی رہے ھیں - دی‌تاسی کے تذکرۂ شعرا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ھے کہ سنہ ۱۸۴۷ ء میں ان کو دھلی کے دربار میں ایک بہت بڑی انتظامی خدمت سپرد ہوئی تھی - شاید یہی زمانہ ان کی وزارت کا ہو - جس کو دی تاسی نے ' بہت بڑی انتظامی خدمت کہا ھے ' لیکن یہ وزارت تھوڑے ھی دن رھی اور اس کے بعد حکیم احسن‌الله خاں وزیر ہو گئے —

انتقال | عبدالرحمن خاں 'احسان' صمصام الدولہ شہامت جنگ نے ۸۵ برس کی عمر پاکر سنہ ۱۲۶۷ ھجری مطابق سنہ ۱۸۵۱ ع میں دنیا سے کوچ کیا ۔ اور درگاہ خواجہ باقی باللہ کے اندرونی احاطے میں دفن ہوے - ان کے ایک لڑکے سیف الرحمن خاں اور پوتے احمد حسن خاں بھی ان کے پہلو میں آسودہ ھیں —

عبدالرحمن خاں اور سیف الرحمن خاں کی قبروں پر کوئی کتبہ نہیں ھے ' البتہ سنگ سرخ کے تعویزوں سے بآسانی پہنچانی جا سکتی ھیں —

مرزا قادر بخش 'صابر' نے 'احسان' کے انتقال کی تاریخ کہی ھے اور خوب کہی ھے :

تنگ نالے دھر فانی سے ھوں دل برداشتہ ھے جنوں انگیز و حسرت خیزیہ‌وحشت‌سرا رفتہ رفتہ ساکنان خاک ھیں گرم سفر راہ چلنے میں نہ دن کا فکر' نے تر رات کا حضرت احساں کہ وہ تھے گلستان دھر میں طوطی شکر مقال و عندلیب خوش نوا قدوۂ ارباب فضل و اسوۂ اھل کمال قبلۂ اصحاب علم و کعبۂ اھل صفا معدن فرزانگی ' استاد شاھنشاہ عصر عمدۂ ارکان: دولت پیشوائے اصفیا نسخۂ ارشاد و عرفاں' آیۂ لطف و کرم معنی تلمیذ رحمن' صورت جود و سخا ھائے اس مصباح ظلمت سوزا بزم دھر کو صرصر جور اجل نے کس طرح گل کردیا اس کے مرنے سے جدھر دیکھو ادھر کس کس طرح حسرت و اندوہ کا ھنگامہ برپا ھو گیا میں ھنگام الم میں ' صابر ' دلگیر نے اپنے دل کو تھام کر باصد غم و باصد بکا

دل گیا بیٹھ آہ جب عالم سے احسان اٹھ گیا
کی رقم اس معدن 'احسان' کی تاریخ وفات

کلام

ان کے کلام کے کیا کہنے، استادانہ کلام ہے، روانی غضب کی ہے، الفاظ ایسے بیٹھتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ استادوں کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں اور خوب کہی ہیں۔ عمر ایسی بڑی پائی تھی کہ میر سے لگا کر ذوق تک کے اہل کمال سے صحبت رہی۔ مرتے دم تک کوئی مشاعرہ نہ تھا جو ان سے ناغہ ہوا ہو۔ اس زمانے کے منہ پھٹ لوگ، ذرا غلطی ہوئی اور انھوں نے ٹوکا، ایسوں کے مقابلے میں غزل پڑھنا آسان کام نہ تھا، پورے طرح تیار ہو کر جانا ہوتا تھا۔ اسی لئے اساتذہ کے کلام پر پورا عبور حاصل کرنا پڑا۔ ادھر اعتراض ہوا اور ادھر سند دی۔ ذرا چپکے ہوے اور کٹے گزرے ہوے۔ بہر حال اس زمانے کا جو رنگ تھا اس میں استاد کامل تھے۔ ان کا قلعے سے واسطہ تھا۔ قلعے کا یہ حال تھا کہ وہاں دو رنگ ہوگئے تھے۔ ایک وہ لوگ تھے جنھوں نے دلی کبھی نہیں چھوڑی تھی۔ دوسرے وہ تھے جو لکھنؤ کا چکر لگا کر آے تھے۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے سے دلی کے شاہزادوں کا لکھنؤ آنا جانا شروع ہوا۔ کچھ تو وہیں رہ گئے، کچھ ایسے تھے کہ کبھی یہاں رہتے کبھی وہاں۔ آپس کے شادی بیاہ سے آمد و رفت کا یہ سلسلہ اور بڑھ گیا۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں رعایت لفظی کا بڑا زور تھا۔ اس کا اثر انھی شاہزادوں کی وجہ سے قلعے کی زبان پر ہوا۔ احسان کا تعلق قلعے سے تھا۔ شاہزادے ان کے شاگرد تھے، یہ خود بھی لکھنؤ میں سال بھر رہ کر آے تھے۔ نئی چیز سب کو پسند آتی ہے۔ انھوں نے بھی صنائع لفظی کو اختیار کیا، یا یوں کہو کہ اختیار کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے کا سارا دیوان لفظی صنعتوں کا مینا بازار ہو گیا۔ استاد ذوق پر بھی اس صحبت کا اثر ہوا ہے، لیکن ان سے کم۔ مؤمن بھی اس چکر میں آے ہیں۔ غالب کی زبان سے بھی ایسے مصرعے نکل ہی گئے:

ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیر زن کے پاؤں

میں تو میں خود ان کے شاگرد بھی اس لفظی الجھاؤ کو اچھا نہیں سمجھتے
چنانچہ مرزا قادر بخش صابر اپنی کتاب گلستان سخن میں لکھتے ہیں :
" کلام قدما کی مزاولت سے صنائع لفظی کی طرف اکثر عنان توجہ معطوف
ابیعت فیض طویت ایسے امور غرابت دستور کی جانب نہایت مالوف تھی -
رباب ذوق جانتے ہیں کہ اس طرح کے قیود صفائی کلام اور آمد سخن سے مانع
بانی سیاق اور روانی عبارت سے عائق ہوتے ہیں " -

مرزا صاحب یہ سب کچھ کہہ گئے مگر آخر تھے شاگرد ، اس قدر کہنے کے بعد
استاد کا پایہ گرنے نہ دیا ، آگے چل کر فرماتے ہیں :

" لیکن اہل انصاف کہ طبیعت کو چوں آئینہ صاف اور ضمیر آفتاب تنویر
ہ اعتساف رکھتے ہیں ، بے شائبہ تکلف فرمائیں گے کہ اتنے تکلف پر سخن
بے تکلف ہے " —

نواب مصطفی خاں شیفتہ نے بھی اپنے گلشن بیخار میں ان کی صنائع لفظی
رورت سے زیادہ بتایا ہے ، چنانچہ لکھتے ہیں —

" اشعار عاشقانہ اش ناخن بدل زن است - در صنائع لفظی مانند جناس
نقاق و طباق وغیرہ آں از حد فزوں دارد " —

ان کے کلام کے متعلق لالہ سریرام صاحب کی وہی رائے ہے جو مرزا قادر بخش
کی ہے - یعنی " الفاظ کی شستگی اور بر جستگی میں بڑی کوشش کرتے اور
ر الفاظ ، پیچیدہ ترکیبوں اور تکرار اضافت سے پرهیز کرتے تھے - رعایت لفظی
ے شائق تھے ، تاہم طرز بیان نہایت صاف ، سہل اور بے تکلف ہے " —

ت لفظی

آگے کلام دیکھنے سے اس رائے کی پوری تصدیق ہو جائے گی - یہاں
صرف نمونے کے طور پر چند اشعار دیتا ہوں ، تاکہ معلوم ہوسکے کہ
رد رعایت لفظی کے ان کے اشعار نہ پیچیدہ ہوتے ہیں اور نہ روانی میں فرق
ہے - ہاں پھسپھسے ضرور ہو جاتے ہیں —

لب بلب - لب سے ترے جب لب پیمانہ ہوا　　جاں بہ لب تو ہی مجھے کہہ میں ہوا یا نہ ہوا

دیکھئے کیا غم کا زور ہے :

بے غم ہیں ہر ایک غم سے نہیں غم کا ہمیں غم　　کیا غم ہو کہ غم تیرا ہے غم خوار ہمارا

اور اس شعر میں پھیر کو کیا چکر دیا ہے :

در اپنے پھیر سے ' بے پھیر! پھر پھیر نہ کر　　کہ تیرے پھیر کے وعدے نے مجھکو پھیر کیا

اور اس شعر میں دیکھئے بار کتنی بار آیا ہے :

بار غم بتاں سے نجات اب کی بار ہو　　بار دگر نہ ہوگا یہ بار خدا گناہ

اور اس رعایت لفظی میں جوے کی بازی کو ملاحظہ کیجئے :

بازی عشق وہ جیتا نہ جیا جو کہ یہاں　　جو کہ جیتا ہے مری جان وہی ہار میں ہے

اس شعر کو دیکھئے کیا ہنگامہ مچایا ہے :

محتسب ہنگامہ آرائی یہ بے ہنگام ہے　　ہے یہ ہنگام قدح نوشی و ہنگام شراب

تجنیس خطی کی مثال بھی ملاحظہ ہو .

تجھکو خبر نہیں یہ نتیجہ ہے جاہ کا　　تیجہ بھی تیرے عاشق بیجاں کا ہو چکا

پس فاقہ آتا ہے اک شخص گریاں　　یہ مجمل سا کہہ دیجو محمل نشیں کو

سخت زمینیں

ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ سخت زمینوں میں غزلیں کہنا استادی کی شان سمجھا جاتا تھا ' شاہ نصیر اس رنگ کے بادشاہ تھے' وہ ٹھیرے ان کے مد مقابل - یہ کیا چپکے رہنے والے تھے - ایسی ایسی سخت زمینیں لی ہیں کہ خدا کی پناہ - لطف یہ ہے کہ باوجود اس دقت کے نہ کبھی ان کا شعر مغلق ہوا اور نہ کبھی تعقید کی ایسی الجھنوں میں پھنسا کہ ان کا سلجھانا مشکل ہو - اب رہا ان کا اصلی رنگ یعنی صنائع لفظی تو وہ یہاں بھی موجود ہے - پوری کی پوری غزل لکھے دیتا ہوں ؛ انصاف شرط ہے ' بھلا ایسے کو استاد نہ کہیے تو کس کو کہیے—

۱- سنگ بیدادی سے دل کو مرے یکسر توڑا مول اس لعل کا تو نے بت کافر توڑا
۲- تیری دیوار سے سر اپنا سراسر توڑا نخل الفت سے ثمر ہم نے یہ دل بر توڑا
۳- دل صد چاک کی پوچھی جو خبر ہم نے وہیں گل صد برگ مرے سامنے لاکر توڑا
۴- نالۂ وآہ بھی اب تو ہیں نکلنے سے رہے خانۂ دل پہ لگا تیرا ستم گر توڑا
۵- سادگی ہی نے تری قتل کیا تھا کافر تیرے زیور نے ستم اور ہی دلبر توڑا
۶- مرکیاں تیری غضب اور یہ بالا ہے بلا قہر زنجیر، ستم جگنی ہے کافر توڑا
۷- جب سنا مرہی گیا آج مرا حلقہ بگوش گوہر حلقۂ بیندی وہیں رو کر توڑا
۸- تیری دولت سے مرے کشور دل میں اب تو مشک و عنبر کا نہیں زلف معنبر توڑا
۹- تجھکو توڑا دے طلائی وہ کہاں ہے مفلس زور کا جس کو نہیں یار میسر توڑا
۱۰- یاد مژگاں میں دم فصد ترے عاشق نے دم ہی نشتر کے نکلنے کے برابر توڑا
۱۱- ہاتھ پہنچے نہ ترے پاؤں تلک میرے کبھو حیف یوں لپٹے ترے سر سے ستم گر توڑا
۱۲- ہاتھ افسوس سے ملکر وہیں فصاد نے آہ پائے تدبیر جو ٹوٹا، سر نشتر توڑا
۱۳- گوے گل میں نے جو پھینکی کہیں پہنچے کو لگی ق اس ادا نے تو پھر ایک قہر ہی مجھ پر توڑا
۱۴- پہنچے کو ہاتھ پہ رکھ کر بہ نزاکت بولے ہاتھ ٹوٹے نے مرے ہاتھ کو آکر توڑا

۱۵- گریۂ وآہ جگر سوز سے پھوڑا دل کو
آتش و آب سے 'احساں' نے یہ پتھر توڑا

غرض ۱۵ شعروں میں توڑے کے جتنے مختلف معنی ہیں سب لکھدیے ہیں۔
غزل کیا ہے، فرہنگ آصفیہ کا خاصہ ایک ٹکڑا ہے —
اس سے زیادہ سخت زمین ملاحظہ ہو:

استخواں سے تو عبث رکھتا ہے چڑا ے برہمن دانت اپنے دیکھ ہیں تیرے دہن میں استخواں
گل ہزاروں عندلیبیں باغ میں تھیں نغمہ سنج آہ صد افسوس انکے ہیں چمن میں استخواں
یہ تمنا ہے کہ رہوے شمع فانوسی کی طرح آتش الفت سے روشن پیرہن میں استخواں

آخری شعر میں غضب کی تشبیہ ہے —

ایک گرما گرم غزل اور سن لیجئے ' اس میں بھی وہ گرم گرم شعر نکلے ھیں کہ معترض انگلی رکھے تو جل جاے —

اس شعلہ روکی ایک تو رفتار گرم ھے — اس پر کڑوں کی اور بھی جھنکار گرم ھے
زلفیں دھواں ھیں' حسن بھبوکا پری ھے چال — کیا سر سے پاؤں تک وہ طرحدار گرم ھے
اس سوختہ جگر کے ابھی تن پہ ھے لگی — اس دم تو رکھ دے ھاتھ میں تلوار گرم ھے
اپنی غزل جو پڑھتے ھیں کہتے ھیں دوستاں (ق) حضرت بغور سنئے کہ بسیار گرم ھے
جب میں پڑھوں ھوں شعر تو بیچے ھیں کچریاں — کیا ان دنوں میں پھوٹ کا بازار گرم ھے
کاھک ھے تیرے سرکی یہاں شمع اے پتنگ — ھے بیچنا صلاح خریدار گرم ھے
بیٹھا تھا کون سوختہ تکیہ لگا کے یہاں — اب تک جو تیرے کوچے کی دیوار گرم ھے
قربان ایسی تپ کے جو تو آن کر کہے — کیوں تیرا جسم عاشق بیمار گرم ھے

یہ رنگ بالکل شاہ نصیر کا ھے ' مقابلے کی غزل کہی ھے اور خوب کہی ' ۲۰ شعر ھیں ' دوچار سن لیجئے :

خاک میں ملتے ھیں تجھ سے روز گوردوچار کے — نذر ھو رھتے ھیں تیرے در پہ سر دو چار کے
مجھ کو مت چھیڑو معاذ اللہ میرے اب تلک — نالے گر آئیں تو پھٹ جائیں جگر دوچار کے
چارہ سازو اس سے جاکر حال دل میرا کہو — کہنے میں البتہ ھوتا ھے اثر دو چار کے
ھر طرف کوچے میں تیرے شور ھے ھنگامہ ھے — خون ھو رھتے ھیں وھاں اے بیخبر دوچار کے

ذرا دیکھئے کیا سخت اُڑان ھے ' کیا روانی ھے ' اور کیا عمدہ مضمون ھیں :

ایک پرواز کی طاقت نہیں اس جا سے مجھے — اور جو حکم ھو صیاد سواے پرواز
دیکھیو نامہ نہ لایا ھو کبوتر اس کا — کچھ مرے کان میں آتی ھے صداے پرواز
اپنے نزدیک تو اس دام سے پھنس کر صیاد — کسی کمبخت کو ھوویگی ھواے پرواز
بے پروبالی پہ خوش ھوں کہ یہ ھر دم ھیں رفیق — تھی پروبالی ھی تک ھم سے وفاے پرواز

ایسی هی سخت زمینوں کے کچھ اور شعر لکھ کر 'احسان' کی شاعری کے اس پہلو کو ختم کرتا هوں ' ورنه دیکھا جاے تو ان کا دیوان سخت ردیف اور قافیوں سے بھرا پڑا هے -

زاهدو سے یه نهیں هیں یه بهم آتش و آب   یعنی یه هم هیں که پیتے هیں بہم آتش و آب

آب دریا میں نهیں پاے حنا بستہ ترے   شعله رو چومنے آئے هیں قدم آتش و آب

اسی غزل میں ایک قطعه هے ' اس میں ظاهر کیا هے که خداوند تعالی کی تسبیح میں دونوں جہان مشغول هیں ' اس کا ایک شعر ملاحظه هو ' کیا موتی جڑے هیں :

مہر و مه ' ارض و سما ' حور و ملک ' شاه و گدا   خار و گل ' خاک و هوا ' تیغ و قلم ' آتش و آب

اپنی پوشاک کا کوچے میں ترے حال هے یه   آستیں وه هے ' گریبان یہاں واں ' دامن

در په کیوں اهل دول کے در حق سے آ یا   اس لئے کھینچے هے درویش کا درباں دامن

جو مجھ سے پوچھو یه عشق کیا هے بهار پیرا ے باغ دانش

چراغ دانش ' فراغ بینش ' فراغ بینش ' چراغ دانش

فلک په پہنچے دماغ دانش قبول درگاه عشق گر هو

قبول درگاه عشق گر هو ' فلک په پہنچے دماغ دانش

گدا ے میخانۂ محبت مدام رکھتا یہی صدا هے

صدا ے جام جلوں الفت ' شراب بینش ایاغ دانش

شجر کوه جاے ' آهوے ها موں ٹھٹرے   تھرھرے ایسی که سرے دل میں هیں مضموں ٹھٹرے

کوه و دریا میں هے تاثیر برودت یہانتک   سنگ میں لعل ' صدف میں در مکنوں ٹھٹرے

هاتھ سے تھر کے دم گرم هے بھرتی اولی   که بیاباں میں مرا آه مجنوں ٹھٹرے

بل بے تھر، بل بے ھوا، بل بے برودت 'احسان' مجھ کو ترہے نہ مرا نالۂ موزوں ٹھٹرے

بل بے کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ پرانے زمانے کی غزل ہے —

بعض عجیب قافیے | خواجہ الطاف حسین 'حالی' مرحوم نے اپنے دیوان کے شروع میں جو مقدمہ لکھا ہے، اس میں قافیے کی بحث میں یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ قافیے کو اس قدر تنگ کرنا مناسب نہیں کہ جب تک حرف کی جگہ حرف نہ آے اس وقت تک قافیہ صحیح نہ سمجھا جاے - بہتر تو یہ ہے کہ اگر کسی لفظ کی آواز بھی قافیہ جیسی ہوجاے تو اس لفظ کو قافیہ بنالینے میں تامل نہ کرنا چاھئیے ' اس بحث کی تائید میں انھوں نے شوق کی مثنوی کا ایک شعر دیا ہے :

کوئی مرتا ہے کیوں بلا جانے ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

'احسان' کے ھاں اس کی بہت مثالیں ھیں ۔ وہ اس قسم کے قافیے بلا تامل استعمال کرتے تھے' دو تین مثالیں لکھے دیتا ھوں - غزل ہے ۔

خفا مت ھو مجھ کو ٹھکانے بہت ھیں مرا سر رہے آستانے بہت ھیں

اس میں ایک شعر ہے :

کہاں تیری ابرو سے کم ھے وگرنہ کمی کیا ہے یوں تو کمانیں بہت ھیں

ایک اور غزل ہے :

ھمارا جگر اس "نہیں" نے جلایا الٰہی لگے آگ تیری "نہیں" کو

ترے جاتے ھی تفرقہ پڑگیا یاں گیا دل کہیں کو' گئی جاں کہیں کو

اس میں ایک شعر ہے :

سنا ہوگا احوال فرعون تم نے ڈبوتا ہے آخر غرور آدمی کو

کمزوریاں | ان کے دیوان میں بہت کم ایسے شعر نکلیں گے جن میں شاعری کی کوئی کمزوری پائی جائے' جن میں محض قافیہ پیمائی ہو ' یا جن میں بھرتی کے الفاظ استعمال ہوے ھیں' البتہ ان کے ھاں لفظ "ھم" بمعنی "بھی" بہت آیا ہے - اس زمانے میں یہ عیب نہ ھوا' اب تو بڑا کھٹکتا ہے ۔

اک تری ذات کو ہے اے مرے قیوم قیام نے سدا خاک ہے، نے باد، نہ ہم آتش و آب

کچھ اپنے ہی گریے کا نہیں زور اٹھا اب بدلی نظر آتی ہے زمانے کی ہوا ہم

مت میری طرف گھورئیے بس مہر ہی رکھیے مردم کو ذرا چاہئیے آنکھوں میں حیا ہم

خیر مردم کا لفظ تو آنکھوں کی رعایت سے لے آئے، مگر یہ ہم چہ معنی دارد —

بعض جگہ ایسے لفظ استعمال کرگئے ہیں جو لغت میں تو ضرور ہیں مگر عام طور سے استعمال میں نہیں آتے - ایک غزل ہے :

قالۂ آتش عذاں ہے برق اس کو مت سمجھ دود آہ عاشقاں ہے یہ گھٹا کالی نہیں

اس میں ایک شعر ہے :

سر بسر پامال غم ہوں کیوں نہ اس صورت سے آہ دسترس مجھ کو کف پا تک بھی جوں قالی نہیں

عام طور سے قالین بولتے ہیں ' قالی بھی صحیح ہے، مگر زبان پر کم آتا ہے . خود لی سے سند مانگتے تو کہت سے دیدیتے ' خیر سند ہو یا نہ ہو، جو سچی بات تھی وہ میں نے لکھدی - نیچے جو شعر دیتا ہوں اس میں "وجب" کا لفظ ایسا ثقیل آیا ہے کہ خدا کی پناہ - خود ان کے دیوان بھر میں ایسی کمزوری کہیں نہ ملے گی —

ہزار باغ میں کھینچے ہے سرو سر بفلک زیادہ تو یہی کہوں کا کہ یک وجب تم ہو

ہمارے ہاں بالشت بھر اونچے یا بڑے ہوے یا مٹھی بھر اونچے ہونے کا محاورہ ہے - "یک وجب زیادہ" ہونا بس ان ہی کے ہاں دیکھا —

فارسی ترکیبیں

ان کے ہاں فارسی ترکیبیں بھی ہیں، مگر بہت کم - ان کی شاعری کا دار و مدار سلاست عبارت پر ہے' پھر بھی کہیں کہیں خوبصورت فارسی ترکیبیں استعمال کرگئے ہیں —

احسان، لب اس کے وہ ہیں کہ جن کا ہر ایک سخن شرمندۂ ساز عیسی گردوں نشیں ہوا

مژدہ سودۂ الماس تجھے زخم جگر — یعنی بیزار ہوئے مرہم کافور سے ہم

اس شعر کو غالب کے دیوان میں بڑھادو تو ذرا مشکل سے پہچانا جائے :

کام رہتا ہے سدا گردن کشوں سے ہی مجھے — پیچ و تاب حلقہ ہائے جوہر شمشیر دوں

جان دل حزین جگر خستگاں پہ رحم — میں نے کہا ثواب ہے، کہنے لگا گناہ

ذرا اس قطعے کو دیکھئے، غالب کا دھوکا ہوتا ہے اور ان کا ایک قطعہ یاد آجاتا ہے جو اس طرح شروع ہوا ہے :

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوس نا و نوش ہے

وہی بندشیں ہیں، وہی ترکیبیں ہیں اور وہی زور ہے -

دوش بدوش دوش تھا جو دست بت کرشمہ کوش — پردۂ در خیام عقل رخنہ گر حریم ہوش
غازہ بروٗ، مسی بلب، پان بدہن، حنا بکف — سلک در عدن بہ سر، طرۂ عنبریں بدوش
پل میں مریض وہ کرے، دم میں شفا یہ دے مسیح — آہ وہ چشم مے پرست، واہ وہ لعل بادہ نوش
منکر مے تھا شیخ کل، آج یہ حال ہے کہ ہے — جام بدست و خم بسر، شیشہ بہر، سبو بدوش

اس غزل میں بجائے 'احسان' کے 'محسن' تخلص ڈالا ہے، سارے دیوان میں یہ تخلص بس اسی جگہ آیا ہے، اس لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ 'محسن' بھی تخلص کرتے تھے، پھر بھی ایک یاد رکھنے کے قابل بات ضرور ہے -

نغمہ سرا ہو 'محسنا' تاکہ ہو باغ باغ باغ — سوسن صد زبان ہو گل کی طرح تمام گوش

عربی کے فقرے

فارسی اور عربی کے فقرے 'احسان' کے ہاں شعر میں کیا آتے ہیں، بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ نگینے جڑے ہوئے ہیں . فارسی کے نمونے تو آپ دیکھ چکے اور کچھ آگے دیکھیں گے، عربی کے دو چار نمونے درج کرتا ہوں :

یہی وظیفۂ مجنوں بدشت عشق رہا　　فدا ہوں اس پہ کہ اسوا ہمیدہ لیلی
جبین عرش معلی ہے سجدہ کا نیاز　　اس آستان پہ سبحان ربی الاعلی

مونس شام غم ہے زلف رسا　　اصلح اللہ شانہ ابدا
سالہا اس کے در پہ 'احسان' نے　　قال سل ما ترید یا سلوی

پرانی زبان | حافظ احسان کا زمانہ میر سے لگا کر غدر کے کچھہ پہلے تک، گزرا ہے - زبان نے ہزاروں پلٹیاں کھائیں، پرانے الفاظ متروک ہوئے، نئے داخل ہوئے - ان کو بچپن ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا کچھہ پرانے زمانے کے الفاظ بھی ان کے دیوان میں موجود ہیں -

اودی پوشاک عجب تم نے سجی واچھوڑے جی　　اس بناؤ سے اجی قصد کہاں کیجئے گا

یہ غزل بہت پرانی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس کے بعض شعر ایسے ہیں کہ اس کو زبردستی کی ٹھونسم ٹھانس کہا جاسکتا ہے اور یہ بات ان کے آخری زمانے کی غزلوں میں نہیں ہے -

رخ نہ پھیروں کا ترے کہنے سے سن اے شہ حسن　　گر مجھے روبروے پیل دماں کیجئے گا
دشت پر خوف محبت میں کہاں جاے اماں　　مسکن اپنا دہن شیر ژیاں کیجئے گا

ہم ہیں اور کوچہ یار جانی کا　　زور ہے زور ناتوانی کا

پہلے زمانے میں زور بمعنی بہت آتا تھا، غدر سے پہلے تک اس کا زور رہا، اب اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا - میر صاحب کہتے ہیں :

تا بمقدور' انتظار کیا　　دل نے اب زور بے قرار کیا

آنکھوں میں موج گریہ اسطوح سے رواں ہے　　پتھروں پہ جسطرح سے زنجیر کھینچتے ہیں

مضمون نہایت نفیس ہے، تشبیہہ بڑی پاکیزہ ہے، مگر پتھروں کی "ت" کو سکون کے ساتھہ جس طرح استعمال کیا ہے وہ سودا اور میر کے زمانے کی زبان ہے -

شاید اسی زمانے کی یہ غزل ہو، سودا فرماتے ہیں :

سودا نکل نہ گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈتے — لڑکے پھرے ہیں پتھروں سے دامن بھرے ہوئے
مجنوں کے گرد لڑکے پتھرے لئے نہیں ہیں — تنہا یہ آج نکلا حشمت مآب کیونکر

میر کے زمانے میں پتھروں کی جگہ پتھرے بھی بولتے تھے، چنانچہ میر صاحب فرماتے ہیں :

لگوائے پتھرے اور برا بھی کہا کئے — تم نے حقوق دوستی کے سب ادا کئے
چشم تر، سوز جگر، آہ سحر، نالۂ شب — تیری دولت سے ہے ہر چیز مہیا مجھکو

"بدولت" اور "دولت" سے دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، مگر اب "بدولت" برتا جاتا ہے، ذوق نے تو صرف " دولت ہی استعمال کیا ہے -

نہ دیکھہ لی کیسی کیسی آفت جہاں میں ہم نے تمہارے باعث
اور آگے کیا کیا غم و الم ہم تمہاری دولت نہ دیکھہ لیں گے

اگر احساں دل اپنا دے تو لے لیجے مبارک ہو — کسی سے کہا تو ہیں حضرت سلامت اپنا گھر دیکھو

گھر دیکھنا اب کوئی محاورہ نہیں ہے، اس زمانے میں ہوگا - یا تو اس کے معنی ہیں اپنے گھر کا رستہ لو یا یہ ہیں کہ اپنے فائدے پر نظر رکھو -

دلبر یہ وہ ہے جس نے دل کو دغا دیا ہے — اے چشم دیکھہ، تجھکو میں نے سجھا دیا ہے
سررشتۂ وفا سے کیا شمع رو ہیں واقف — ہم نے پتنگ ان سے ملنا اُڑا دیا ہے

دغا کا لفظ غدر سے پہلے بھی مؤنث تھا - مؤمن کا شعر ہے :

دیا علم و ہنر حسرت کشی کو — فلک نے مجھہ سے یہ کیسی دغا کی

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس سے بھی پہلے کا شعر ہے -

آشنا کس کے ہیں، بے دید ہیں یہ دیدۂ و دل (ق) — ہیں یہی دیدۂ و دانستہ ڈبانے والے
اُن کے رونے پر ہنسی آتی ہے مجھکو احساں، — دوڑے پانی کو ہیں کیا آگ لگانے والے

ڈبانے کا لفظ عامیانہ ہے، بول چال میں کبھی کبھی آجاتا ہے، مگر تحریر میں بہت کم دیکھا گیا ہے - احساں کے ابتدائی زمانے میں دیکھنا ہو تو جرأت کا یہ شعر دیکھہ لو :

سمجھ کے دیکھا تو بیجا تھا سب گلہ دل کا　　کہ چشم نم نے ڈبویا معاملہ دل کا

ان کے آخر زمانے میں دیکھنا ہو تو غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو :

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر　　اچھے رہے آپ اس سے مگر مجکھو ڈبو آئے

بی نور کے روضے میں ہے مچلا ہوا بیٹھا (ق) سنتا ہی نہیں یہ دل مہجور کسو کی

میں سورۂ نور آپ ہی بی نور کو بخشوں　　گر آے نظر صورت پر نور کسو کی

پوری غزل کی غزل ہے، جس کی ردیف "کسو کی" ہے۔ بی نور کا روضہ قطب کے راستے میں ہے ' بی نور حضرت نظام الدین اولیا (رح) کی والدہ تھیں ۔

انگریزی حکومت کا اثر

لارڈ لیک کے دھلی فتح کرنے کے بعد بس قلعہ ہی قلعہ بادشاہ کے قبضے میں رہ گیا تھا ' سارے شہر میں کمپنی کی حکومت تھی، انگریز آکر بس گئے تھے ' اس طرح انگریزی کے بہت سے الفاظ لوگوں کی زبان پر چڑہ گئے - اس زمانے کے اکثر شاعروں نے یہ الفاظ اپنے ہاں باندھے ہیں - اس ہوا سے 'احسان' بھی نہ بچ سکے اور کیسے بچتے؟ ان کا دوستانہ برکت علی خاں 'برکت' خیر آبادی سے بہت تھا ' ان کی غزلوں پر غزلیں کہتے تھے' ان کے مصرعوں کی تضمین کرتے تھے - چنانچہ برکت کا شعر ہے :

اشکوں کو بہا دیدۂ گریان سمجھ کر　　گھبرائے نہ عالم کہیں طوفان سمجھ کر

احسان پہلے مصرعے پر یوں گرہ لگاتے ہیں :

احساں کہا مان تو 'برکت' کی طرح سے　　اشکوں کو بہا دیدۂ گریان سمجھ کر

ایک قطعے میں لکھتے ہیں :

جاکے اس در پہ یہ احساں نے کہا بندہ نواز　　کھول دروازے کو' آ اپنے گرفتار سے مل

اُس نے جب در کو نہ کھولا تو وہ برکت کی طرح　　خوب جی کھول کے رویا در و دیوار سے مل

یہ میاں برکت نصیرالدولہ جرنل اختر لونی کے پیشکار اور دست راست تھے - انہی کے ذریعے سے 'احسان' جرنل اختر لونی سے بھی ملے - اسی میل جول میں اگر انگریزی کے کچھ الفاظ زبان پر چڑہ گئے ہوں تو کیا تعجب ہے -

کلکتے میں الفت کا گورنر ہے سدا عشق | آمادہ ہو تو رستم دستاں سمجھ کر
مہجر نے جلوں کے ہے یہ تیار کی پلٹن | ہاں دیکھ صف خار مغیلاں سمجھ کر
جرنیل تو صحرا میں ہے اور کوہ میں کرنیل | ہے شہر میں چھوڑا مجھے کپتان سمجھ کر

شیخ سے بولا خفا ہوکر وہ یوں شوخ فرنگ | ول نہ ہم بیٹھے کا ایسے پاگل اور لوفر کے پاس
غائب ہے جب سے چشم سے وہ اعہمد فرنگ | واقف نہ حاضری سے نہ ہرگز تقی سے ہم

قلق کی ہجو میں لکھتے ہیں:

قلق ابن قلندر نامی | ایک بو گر ہے ایک گداسی

پنسلیں نکل آئی تھیں' ہر شاعر مختلف پہلو سے ان کو باندھتا تھا - ذوق لکھتے ہیں:

خط جو اس نے قلم سرمہ سے لکھا ہم کو | لکھا ایمائے خموشی ہے یہ گویا ہم کو

'احسان' اس کا دوسرا پہلو لیکر لکھتے ہیں:

'احسان' برنگ خامۂ اہل فرنگ ہاں | محتاج توتیا مژۂ تو ہطار نہیں

انگریزی عملداری تھی' مجرموں کو قید کی سزا دی جاتی تھی' قیدیوں سے سڑکیں بنوائی جاتی تھیں' برقنداز نگرانی کرتے تھے' انھوں نے یہ رنگ دیکھا' نیا مضمون ہاتھ آگیا' باندھ گئے -

دل عشاق سدا زلفوں کی زنجیر میں ہے | اور نگہبان' نگاہ بت عیار مدام
مانگ کی راہ کو یہ حکم ہے یوں صاف رکھیں | جوں بناتے ہیں سڑک آ کے گنہگار مدام

احسان کا معشوق

مجھے ان کے دیوان میں ان کا معشوق سب سے زیادہ پسند آیا - معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کا جوش نہیں رہا تھا - اس لئے آخر زمانے کی غزلوں میں معشوق کی وہ وہ خبر لی ہے کہ خدا کی پناہ' ایسا ڈانٹتا ہے کہ کوئی نوکر کو بھی کیا ڈانٹیگا - ہر جگہ طعن کرتے ہوں کہ میاں تم تو روپیے پر مرتے ہو' ہم غریبوں کی طرف کیوں دیکھنے لگے - ذرا معشوق سے ان کی توتکار دیکھئے' فرماتے ہیں:

جب سیمبروں نے ہوئیں زردار نہ پایا ۔ جوں نگہۂ زر ہم کو گلے تک نہ لگایا
تمھاری آنکھوں میں اسلئے مجھے دھیرکیا ۔ یہ بھی زری ہوئی عجب بد بلا ہے سیمبرو
تجکو ہی شرم نہیں تو مری پیزار سے مل ۔ کب تلک تجھسے کہوں یار ندا غیار سے مل
زر ہے در کار تو جاکر کسی زردار سے مل ۔ گر وفا چاہئے تو ہم سے وفادار سے مل

کسی کے معشوق کے چہرے پر داد ندھوا ہوگا ہوا تو حافظ جیو کے معشوق کے ہوا ۔

داد دو میری کہ یہ باعث بیداد ہوا ۔ چہرے پر آپ کے بیوجہ نہیں داد ہوا

داد کا لفظ ایک جگہ میں نے اور دیکھا ہے ' داغ کے مرنے کے بعد مرزا خدا داد بیگ مرحوم نے اعلیٰ حضرت غفران مکان کے پاس مثنوی "گل و صنوبر" پیش کی تھی اس کے آخر میں لکھا تھا :

ہے داغ کی جا خداداد خالی ۔ ہو داد کے نام پر بحالی

اور دیکھئے کیا کھری کھری سناتے ہیں ' معشوق کو ظالم سبھی کہتے ہیں قصائی کوئی نہیں کہتا ' انھوں نے قصائی بنانے میں بھی کمی نہیں کی :

تو اپنے تئیں شہر میں قصاب نہ ٹھیرا ۔ ہر دم نہ گلے کاٹ غریبوں کے ستمگر
ہم تو منہہ پر یہ کہینگے تم بڑے قصاب ہو ۔ جب چھری پھیری غریبوں پر تو کیا نواب ہو

دیکھئے کا معشوق کو کس زور سے ڈانٹتے ہیں :

میں ایک طرح کا ہوں نہ کہو یا رہی طرح ۔ کیوں بولتے ہو ہو کے طرحدار بیطرح
تڑکا تھا حلق کہ آواز بھی سنا نہ سکے ۔ اگر چہ خلق کے چرچے سے منہہ دکھا نہ سکے

معشوق بھی کچھہ ڈبیل نہ تھا ' وہ کب چپ رہنے والا تھا ۔

اسے تو دھکی سے تمھارے کیوں نہ ہم ترجائینگے ۔ بوسہ مانگا ہم نے دھمکا کر تو یوں کہنے لگا

معشوق کو ایک قطعے میں بگڑ بگڑ کر سمجھاتے ہیں ۔

تم تو ہو بھولے کیو نکہ کہیں تم کو برا ہم ۔ اپنے پہ نہ لیجیو تو میں اک بات کروں عرض
ویسی ہی گرفتاری میں رکھتے ہوں سدا ہم ۔ سمجھا چکے تم ہم کو نہ لے ہم ہی نہ سمجھے
ہم ہی تو سدا رکھتے ہوں واں سجدے با ہم ۔ کوچے میں ہمارے ہی تو بلوے ہیں ہمیشہ

القصہ یہ قصہ تو نہیں ، قصۂ کوتاہ کچھہ اور نہیں سمجھے ہیں یہاں اسکے صوا ہم
اغیار کا ملنا نہ ہوا ہم کو سزاوار جو ہم نے کیا پاتے ہیں اب اسکی سزا ہم
منہ میری طرف کھورئے بس ہو ہی رکھئے سر دم کو ذرا جاهئے آنکھوں میں حیا ہم

ہاں صاحب ، بات یہ ہے کہ معشوق ایسے ہی عاشقوں سے دبتے ہیں ، جنھوں نے پہلے تو خوشامد درآمد کی ، نہ مانا تو ڈانٹ دیا —

جب کسی نے کہا مرتا ہے تمھارا عاشق تم جو جا بیٹھو تو آجاے وہ جینے کے قریب
کوٹ کر سینے کو ایک ناز سے بولے ، ہے ہے کس کی کمبختی جو بیٹھے وہ کمینے کے قریب

شاید ہی کسی عاشق نے اپنے معشوق کے سر میں جوئیں ڈالی ہوں ، یہ 'احسان' کا معشوق ہے ، اس کے سر میں جوئیں کیوں نہ پڑینگی ، لکھتے ہیں :

نہ سارے جوں کی طرح کیوں دل نزار کو آج جوئیں لگی ہیں تری زلف تابدار کو آج

جوئیں لگنا پرانا محاورہ ہے ، اب سر میں جوئیں پڑنا کہتے ہیں —

اس سے بھی زیادہ تیز سنئے ، اس شعر میں تو یار پر لعنت ہی بھیجی ہے :

پھٹے منہ تو اور مل اغیار سے رنگ منہ کا اُڑگیا پھٹکار سے

شوخی اور مذاق

'احسان' کے کلام میں شوخی بھی ہے اور مذاق بھی ۔ بعض جگہ یہ مذاق بہت لطیف ہے اور بعض جگہ رکیک ۔ دونوں طرح کی مثالیں لکھتا ہوں ، کیا اچھی غزل ہے :

بس ترے آتے ہی مجکو چین سا کچھہ آگیا اب وہ بیچینی ، وہ بیتابی ، وہ بیحالی نہیں
دو ہی دن کے عشق میں احساں یہ صورت بن گئی منہ پہ وہ رونق نہیں ، چہرے پہ وہ لالی نہیں

اس غزل میں شیخ جی پر حملہ کرتے ہیں ۔ شاید شیخ جی اُدھار پی گئے تھے ، ورنہ اس کی عوض ان کا عمامہ لینے آے ہیں ۔ قطعہ ہے :

شیخ اپنی گفتگو سے قلتبان بنتا ہے آپ ورنہ اپنی طبع مائل سوے ہزالی نہیں
رند عمامہ طلب کرتے ہیں وہ خانہ خراب گھر سے باہر آن کر کہتا ہے گھروالی نہیں

اس قطعے میں شیخ جی پر کئی پہلووں سے حملہ کیا ہے ۔ ایک یہ کہ ان کا

عمامہ بھی جورو کے قبضے میں رہتا ہے، دوسرے یہ کہ بیوی کا دوپٹہ ان کے عمامے کے کام آتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان کی زوجہ بغیر ان کی اجازت کے جہاں چاہے نکل جاتی ہے اور ان کو خبر تک نہیں ہوتی کہ وہ گھر میں ہے یا کہیں با ہر گئی ہوئی ہے:

کیاشیخ جی کی جوروورہتی ہے کشمکش میں   کا ہے وہ کھینچتا ہے، کہ پیر کھینچتے ہیں

اس شعر میں شیخ کے ساتھ ان کے پیر کو بھی لے مرے ہیں:

نچھوڑ زوجۂ شیخ اب تو شیخ کا اخلاص   اگرچہ پیر ہے، پر ہے مرید باا خلاص

پیر کے یہاں دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ واقعی پیری مریدی کرتا ہے دوسرے یہ کہ بڈھا ہے اور بڈھے ہمیشہ زن مرید ہوتے ہیں۔

اب شیخ جی کو خطاب دینا رہ گیا تھا، وہ ہولی کے زمانے میں پورا ہو گیا۔ پھاگن کا مہینہ ہے۔ موسم اعتدال پر ہے، لوگ ہولی منا رہے ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کہتے ہیں:

ہر آن خوشی میں آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں، کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ راگ اور رنگ جھمکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودے ہیں۔ کچھ اچھلے ہیں، کچھ ہنستے ہیں، کچھ بکتے ہیں

ہر طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن دکھایا ہولی نے

بھلا ایسے موقعے پر نئے سال کے خطابوں کی طرح شیخ جی کو کیوں خطاب نہ ملے اور لوگ بھی اس خطاب سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ چنانچہ نظیر کہتا ہے:

بیٹھے ہیں سب آپس میں نہیں ایک بھی کڑوا   پھکاری اٹھاکر کوئی جھمکاوے ہے کھڑوا
بھرتے ہیں کہیں مشک کہیں رنگ کا کڑوا   کیا شادوہ ہوتا ہے جسے کہتے ہیں بھڑوا

سنتے ھیں یہاں تک نہیں اب ننگ زمیں پر ۔ ھولی نے بچھایا ھے عجب رنگ زمیں پر

جب دوسرے اس خطاب سے برا نہیں مانتے تو بھلا شیخ جی کیوں برا مانیں۔

احسان نے شیخ جی کو خطاب دیا ھے، مگر کنایے ھی کنایے میں دیا ھے :

تم جاؤ شیخ جی، آؤ قریب ھے ھولی ۔ خفا نہ ھو کہ چلے آتے ھیں خطاب کے دن

کیوں ھم سے ھو بگڑتے، ھم نے تو شیخ صاحب ۔ ھولی سے پیشتر ھی تم کو بنا دیا ھے

اس کے بعد شیخ صاحب کو چھوڑکر محتسب کے پیچھے پڑتے ھیں

جب جوانوں سے مدد پیر مغاں نے چاھی ۔ لے کے رندوں کو وھیں ھم بہ تجمل پہنچے

محتسب کے سر نا پاک پہ رکھوا خم مے ۔ اس طرح سے در میخانہ پہ ھم کل پہنچے

یہاں تلک محتسب شہر ھے لرزاں اب تو ۔ رند کشمیر میں ھوویں تو وہ کابل پہنچے

سبحان اللہ کیا قطعہ ھے داد دیجئے گا :

پکڑ لیا مجھے ھمراہ دختر رز آج ۔ شتاب آؤ کہ یہ محتسب ستا نہ سکے

یہ کہدو پیر مغاں سے یہی ھے وقت مدد ۔ وھاں چھڑا چکے، دنیا میں جب چھڑا نہ سکے

محتسب کا خطاب ملاحظہ ھو.

نہ میکدے میں کرو ذکر محتسب رندو! ۔ خدا نہ وہ شتر بے مہار دکھلاوے

یہ دو خطاب سن چکے، اب زاھد کا خطاب بھی سن لیجئے :

زاھدا دل میں نہ رکھ زھد ریائی کا خیال ۔ کیوں تو اے گاؤدی مسجد میں اڈا باندھے ھے

کوچے میں تیرے آج خرد سب اٹھا چلے ۔ کعبے میں زاھد آئے تو سر کو منڈا چلے

اس سے بھی تیز سنئے :

زاھد آیا تو، گوارا نہیں رندو ھم کو ۔ اپنی اس بزم میں مکار اٹھے اور بیٹھے

دونوں کانوں کو پکڑ کر، یہ سزا ھے اس کی ۔ کہہ دو سو بار یہ عیار اٹھے اور بیٹھے

ذرا مقطع ملاحظہ ھو، کیا خوب کہا ھے :

بھولتے اٹھتے اسی طرح کی لکھہ اور غزل ۔ جس میں احسان نہ ھو، بیکار اٹھے اور بیٹھے

قافیے رہ گئے، وہ کیوں خالی ھاتھ جائیں، ان کو بھی دو دو سنا دیں :

قاضی سے، ٹلگوں کی حرمت ہے کتابوں میں   ایک بڑی دقت ہے رشوت کا پچا جانا

محتسب اور زاہد پر تو سب ہی آوازے کستے ہیں، ہاں ملا کو اب تک کسی نے نہیں لپیٹا تھا، اس پر انہوں نے ہاتھ صاف کیا:

سفارش مری یہ ہے پیر مغاں سے   کوئی ساغر مل تو ملّا کو بخشو

شوخی | شوخی کی مثالیں ان کے ہاں بہت ہیں۔ چار پانچ لکھے دیتا ہوں۔

چھیڑ تو دیکھو، سناکر مجھ کو، غیروں سے کہا   آج عاشق ہم کو صدقے کے لئے درکار ہیں

کہتے ہو کیا رقیب کو بھیجوں بتا صلاح   لعنت ہی بھیجئے کا یزید لعین کو

بعد مردن دیکھکر مجھکو، جھجک کر یوں کہا   میں یہ ڈرتا ہوں مبادا اب یہی عیاری کرے

مجھکو مسجد سے نکالا تو بس اب لے یہ ثواب   زاہدا تو ہی بتا خانہ خمار مجھے

اور یہ قطعہ بھی ملاحظہ فرمائیے، نیا رنگ ہے:

شہرہ یہ کندہ تھا اس شیریں بیاں کی قبر پر (ق) خوب روئے دیکھکر فرہاد کی تربت کو ہم

واہ واہ اے بادشاہ عشق تیری منصفی   راحت اوروں کے لئے خدمت کو ہم محنت کو ہم

اس کے مقابلے میں یہ شعر دیکھئے، کیا رکیک مضمون ہے:

جب زرہ تن پر سجی ہاتوں میں دستانے لگے   دیکھکر یاروں کی سج غیروں کو دست آنے لگے

دیکھ کر چاک جیب عاشق کو   یہ لگے کہنے وہ بہ عیاری

ان دنوں خیر سے ہے پھر 'احسان'   جیب کتروں کی گرم بازاری

ایک قطعہ لکھتا ہوں، ذرا سمجھنا مشکل ہے، ایک کہانی کی طرف اشارہ ہے۔ پہلے قطعہ لکھتا ہوں، بعد میں قصہ بیان کروں گا۔

سن کے وصف اس کی چشم کا نرگس   رشک سے بولی: میں نہ کوئی تھی۔

پھر لگی کہنے چشم باغ ہوں میں — ختم مجھ پر ہے جونکوئی تھی
ہے بجنسہ مثل یہ نرگس کی — سب تو بولے تھے میں نہ بولی تھی

بچوں کی کہانی تھی، مثل ہوگئی - کہانی یہ ہے کہ ایک تھے میاں توتلے، ان کی بیوی بھی توتلی اور بیٹا بھی توتلا - شادی جو ہوئی تو خیر سے بہو بھی توتلی آئیں - سسرال جاتے وقت ماں نے بیٹی سے کہا : دیکھو سسرال میں زیادہ نہ بولیو، نہیں تو تیری توتلی زبان پر ہنسی اڑے گی - تھوڑے دنوں تو یہ منہ سے نہ بولیں - ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ شام کو سسرے آے، کیا دیکھتے ہیں کہ گھر میں اندھیرا گھپ ہے - کہنے لگے "تیوا توں نہیں تلایا" - (دیوا کیوں نہیں جلایا) بیوی نے جواب دیا "توھا بتی لے تیا" (چوھا بتی لے گیا) بیٹے صاحب بولے : تل بوی تو لے تیا تھا (کل بوی تو لے گیا تھا) بہو اتنی باتیں سن کر کہاں رہا جاتا تھا، یہ سوچ کر کہ اچھا ہوا میں نے کچھ نہیں کہا نہیں تو میرا بھی توتلا پن کھل جاتا، کہنے لگیں "سب بولے میں نہ بولی" (سب بولے میں نہ بولی) معلوم ہوتا ہے بڑے میاں نے بچوں کو یہ کہانی کہتے سنا تھا، مضمون دھیان میں آگیا، قطعہ لکھ مارا - یہ مثل اس وقت بولی جاتی ہے جب کسی کی بے تکی باتوں کا مذاق اڑانا ہوتا ہے —

ہجویں احسان کے ہاں ہجویں جس مزے کی ہیں، سودا کے سوا شاید ہی کسی کے ہاں ہوں گی - بعض تو ایسی ہیں کہ ذرا تہذیب سے گرگئی ہیں، مگر بعض میں صرف چٹکیاں لے کر چھوڑ دیا ہے - جی میں تو آتا ہے کہ سب لکھدوں مگر ہوائی قانون سے ڈر لگتا ہے، کہیں مقدمہ قائم نہ ہوجاے - خیر کچھ نہ کچھ تو ضرور لکھوں گا - ہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑے گا - نواب ظفرالدولہ کا قطعہ کہیں اوپر لکھ آیا ہوں، کیا نازک چوٹ کی ہے :

بسان آئینہ، آئین اپنا رکھتا ہوں — میں صاف گو ہوں، نہیں آتی مجھکو مکاری
تو گل ہے گلشن دربار بادشاہی کا — ولے چو غنچہ زباں در تہ زباں داری

ایک حکیم صاحب کے متعلق فرماتے ہیں :

ہیں ایک حکیم جی بشکل طاعون ہے رقص تقلید، بغل ان کا قانون
پڑھتے ہیں نفیسی اور خود ہیں وہ کثیف نسخے ہیں عجیب اور تحفہ معجون

کوئی صاحب بندو نامی تھے، تخلص قلق تھا اور قلندر شاہ کے بیٹے تھے، خبر نہیں میاں احسان سے کیا گستاخی کر بیٹھے، جو انہوں نے ایسی لمبی چوڑی ہجو لکھ ماری ہے :

فکر میرا ہے آسماں پرواز لا مکاں سیر ولا مکاں پرواز
مجھ سے اُڑ کر عدو کہاں جائیے جس جگہ جاے جوتیاں کھائیے
شہرہ اپنا عدو کو ہے منظور چل قلم نام اس کا کر مشہور
آپ جنجال میں پڑا وہ پلید ریسمانے براے خود تابید
ہجو میری زباں پہ آنے لگی روح سودا کی تھر تھرانے لگی
قلق ابن قلندر نامی ایک بوگر ہے، ایک کنجامی
ایک مچھندر ہے شہر کے اندر ہے قلندر کے گھر میں وہ بندر
نام بندو ہے اسم زن بندی وہ تو خندہ ہے اور یہ خندی
میر خاں کا ہے شہر میں بازار جوتیاں گانٹھتا ہے وہاں بہ چمار

(اس کے بعد کا شعر نہیں لکھتا)

قطعہ

حکم انگریز ہے کہ سگ ہیں پلید ایک رہوے نہ مثل نسل یزید
کنجروں کو عجب دیا بٹّا شہر میں وہ گیا ہے یہ کُتّا
کیا قلم ہاتھ سے اپنے ڈالوں تیرے استاد کو بھی لے ڈالوں
ہجو کیا کہہ کے میں اسے دوں کل پابگل ہے وہ آپ ہی پاگل
عجب ہوشی تھاے مزدا نسہ خشم خوردن غذاے مردالسف

نہ پسند آئے اس کو گر مری بات   خر چہ داند بہائے قند و نبات
قدر سے میری کب عدو کو خبر   قدر عیسیٰ کجا بداند خر

میں دعا دوں اسے بصدق و یقین   میری خاطر سے سب کہو آمین
رہوے یارب قلق میں وہ ابلیس   جب تلک ہیں قلق کے دو سو تیس

آپ نے دیکھا، اردو، فارسی، انگریزی سب زبانوں میں گالیاں دی ہیں۔ پرانے زمانے کے بڈھوں کے منہ پر انگریزی کے یہ دو الفاظ 'بوگر' اور 'گڈتامی' بہت چڑھے ہوئے تھے، 'گڈامی' کی دوسری شکل ان کے ہاں 'گڈتا میر' بھی تھی۔ مجھے اس کے ظاہر کرنے کی تو ضرورت نہیں کہ بوگر بگر کی اور گڈامی گو، ڈیم، یو" کی بگڑی ہوئی صورت ہے اس بات کی تو آپ بھی داد دینگے کہ دعا ایسی خوبصورتی سے دی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی —

دھلی کی دیوانی کی کچہری میں کوئی صاحب محمد بیگ صیغۂ لاوارثی کے حاکم تھے، ان کی ہجو کرتے ہیں:

کسی نے پوچھا یہ شیطاں سے ہاں اے لعیں سچ کہہ
جو تو مر جائے شاید، کون ہے تیرا پتا وارث
لگا کہنے کچہری میں دیوانی کے ہے دلی میں
مرا سالا مرا وارث، محمد بیگ لاوارث

مجھے ان کے ہاں اگر کوئی ہجو پسند آئی تو وہ الہی بخش خاں 'معروف' کی ہے دونوں میں بڑا دوستانہ تھا، یہاں تک کہ جب بعض شعرا کی بیہودہ گوئیوں سے 'معروف' نے شعر کہنا چھوڑ دیا تو اس پر 'احسان' نے نواب صاحب کو ایک قطعہ لکھ کر بھیجا۔ پہلے وہ لکھتا ہوں، کسی قدر نغز ہے، مگر اس سے 'احسان' کی شاعری کا یہ رخ بھی ظاہر ہو جائے گا، اس کے بعد وہ ہجو لکھوں گا —

صبا تو کیجیو آہنگ خدمت 'معروف'   یہ اس سے کہیو کہ اے عندلیب خوش آہنگ

تورنج شورش زا فاں ہے اس گلستاں میں　نہ کبھو ترک ترنم کا ایک شب آہنگ
وہ شہسوار ہے تو عرصۂ فصاحت کا　مقر ہیں اہل صفاہاں و روم و ہند و فرنگ
عناں اشہب معنی ہے تیرے کف میں سدا　صدائے سگ سے نہو نا تو زینہار بتنگ
در آنکہ خاطر تو بہ سبب برنجاند　زقعر ہفت زمیں تابارج ہفت اورنگ
ز ترک تاز در خانۂ تناسل او　شکستہ باد بکو پال قاضی کیرنگ

قاضی کیرنگ کا حال معلوم کرنا ہے تو 'انوری' کی ہجویں دیکھئے - ہاں '
تو اب وہ ہجو ملاحظہ ہو - ہجو نہیں ہے ' چٹکی لی ہے اور ایسی چٹکی لی ہے کہ
نواب الہی بخش خاں کو بھی مزا آگیا ہوگا - ایسی خوبصورت ہجو شاید ہی آپ کی
نظر سے گزری ہو ' شاعر نے پہلے ساری برائیاں اپنے اوپر لیں اور پھر سب کی سب
نواب الہی بخش خاں ' معروف ' پر اُلٹ دیں - شاید یہ تو مجھے بتانے کی ضرورت
نہیں کہ معروف ریاست چھوڑ فقیر ہو گئے تھے ' قطعے کے آخری شعر میں اسی طرف
اشارہ ہے :

تلون ' زود رنجی ' بد مزاجی　یہ خو تیری مجھے احساں نہ بھائی
نہ ہو تو بحر الفت کا شناور　جو تیرا تو تو تو ہی سب خدائی
جہاں میں وہ ہوا ہے تو بھی معروف　جہاں جائیگا ' پا ایں بیوفائی
کہیگی خلق یہ دیکھو وہ آیا　الہی بخش خانصاحب کا بھائی
الہی بخشیو مجھکو کہ غیبت　زباں پر میری نادانی سے آئی
الہی بخش خاں سے کسکو نسبت　نثار فقر چتر پادشاہی

ہم مضموں اشعار | حضرت امیر خسرو (رح) کے اس شعر سے خدا معلوم کتنے شاعروں نے مضمون لیا ہے ' مگر بڑھنا تو کیا کوئی برابر بھی نہ پہنچ سکا :

ناخدائے کشتی ما گر نباشد گو مباش　ما خدا داریم و ما را ناخدا درکار نیست

انھوں نے تو یہ کہا کہ اگر ناخدا نہ آئے تو بلا سے نہ آئے، ہمیں اس کی ضرورت ہی نہیں، خدا ہمارا ناخدا ہے۔ احسان نے اس پر ایک اور اضافہ کیا، ان کی کشتی میں ناخدا ہے، وہ خدا کے بھروسے پر اس کو نکال رہے ہیں۔ کہتے ہیں:

خدا خود ہے مری کشتی کا حافظ خدا کے واسطے اے ناخدا جا

شاہ مبارک 'آبرو' کا ایک شعر ہے:

جہاں اس خو کی گرمی تھی، نہ تھی وہاں آگ کو عزت
مقابل اس کے ہوجاتی تو آتش لکڑیاں کھاتی

'آزاد' مرحوم نے اس شعر کا مقابلہ حافظ عبدالرحمٰن خاں 'احسان' کے ایک شعر سے کرکے 'احسان' کی بہت تعریف کی ہے، وہ شعر یہ ہے:

دخت رز سے کہا میخانے میں شب رندوں نے آج تو خوب ہی ختکے تری سوکن کو لگے

یہاں تک تو ٹھیک تھا، مگر 'احسان' کے شعر کے جو معنی کئے ہیں وہ ذرا قابل غور ہیں۔ فرماتے ہیں: "بھنگڑ خانے میں بھنگڑوں نے خوب سبزیاں گھونٹیں اور طرے اڑائے۔ تم بھی یاروں پر نظر عنایت کرو"۔ میری رائے میں اس شعر کے یہ معنی ہیں کہ رندوں نے دخت رز کو یہ خوش خبری آکر سنائی کہ تیری سوکن یعنی بھنگ کی آج بڑی ٹھکائی ہوئی۔ (ختکے لگنے کے معنی اکڑی سے پٹنے کے ہیں اور بھنگ بھی چونکہ سرنٹے سے گھونٹی جاتی ہے، اس لئے اس کو ختکے لگنے سے تعبیر کیا ہے)۔ یہ خبر سنا کر رند منہ سے تو کچھ نہیں کہتے مگر انہیں یقین ہے کہ سوکن کے پٹنے کی خبر سن کر دخت رز ضرور خوش ہوگی اور ان کو شاد کام کریگی —

خیر یہ تومیں نے 'احسان' کا وہ شعر نقل کردیا جو 'آزاد' مرحوم نے آبحیات میں لکھا تھا، مگر دیوان میں یہ شعر قطعہ بند ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے محض اپنی یاد پر اس کو کچھ الٹ پلٹ کر لکھ دیا ہے۔ اصل میں قطعہ یوں ہے:

دخت رز کہتی ہے، سبزی مجھے لگتی ہے زہر ہائے تم چاہنے اس سوت کو بیروں کو لگے
ساقیا اس کی تسلی ہے بہرکیف، یہ کہہ پس گئی، ایسے ہیں ختکے تری سوکن کو لگے

اس غزل میں ایک شعر کیا اچھا ہے ' بے موقع سہی مگر سن لیجئے :

تیری دولت سے ہے جو روگ لگا دل کو مرے ارے دشمن ' کسی دشمن کے نہ دشمن کو لگے

"خدا کے گھر سے پھرنے" کے محاورے کو 'احسان' اور ذوق دونوں نے باندھا ہے اور خوب باندھا ہے —

ذوق : گر اب کے پھرے جیتے وہ کعبے کے سفر سے

تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

احسان : جو کوئی جان بچا کر تمہارے در سے پھرا

یہ جانتا ہوں مرے جاں خدا کے گھر سے پھرا

ذوق کے ہاں کعبے کے لفظ نے شعر میں جان ڈال دی ہے ۔ کیونکہ وہ تو خدا کا گھر ہے ہی ۔ مگر احسان نے یہ کمال کیا ہے کہ در یار کو خدا کا گھر بنا دیا ہے اور اس سے شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے —

اسی طرح ذوق کا ایک شعر ہے :

مرے حسن عمل سے معصیت بھی عار کرتی ہے مری توبہ سے توبہ' توبہ استغفار کرتی ہے

اس مضمون کے 'احسان' کے ہاں کئی شعر ہیں ۔ ایک شعر تو ایسا ہے کہ لا جواب ہے :

توبہ اس توبہ سے اکدم نہ نبھا ہی توبہ میری توبہ ہے وہ توبہ کہ الہی توبہ

کیا مری توبہ ہے توبہ کیجئے اس توبہ سے

توبہ بھی توبہ سے مری پڑھتی استغفار ہے

مے سے میں توبہ کروں استغفر اللہ سب غلط

نام توبہ سے سدا ہم پڑھتے استغفار ہیں

کیا تعجب ہے کہ اکبر الہ آبادی نے اپنا یہ مضمون کہ :—

" دب گئی آخر مسلمانی مری پتلون سے "

حضرت احسان سے لیا ہو، ان کا شعر ہے :

ڈر گیا طرز مسلمانی وہ کافر دیکھ کر ڈھب پہ اس بد کیش کو لایا ہی تھا پر کیا کروں

اکبر کا ایک بڑا مشہور شعر ہے :

داڑھی مونچھوں کا سب صفایا ہے فارغ البال ان کو کہتے ہیں

انھی معنوں میں فارغ البال کا لفظ 'احسان' نے بھی استعمال کیا ہے:

خواب میں بھی دل خیال زلف سے خالی نہیں

جب سے دیکھے بال تیرے فارغ البالی نہیں

احسان اور غالب کا ایک ہی زمانہ تھا، اس لئے کہیں کہیں احسان اور غالب کا رنگ مل گیا ہے۔ اس شعر میں احسان کی جگہ غالب رکھ دو، دیکھوں تو کون پہچان سکتا ہے، غالب کا رنگ ہی نہیں، غالب کے الفاظ ہیں اور غالب ہی کا طرز ادا۔

نام ملتا ہے مجھے رنگ ہے آتا احسان شہرۂ نام کو کیوں اہل فنا نے چاہا

بعض جگہ ذوق کا رنگ ایسا آگیا ہے کہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے، مجھے تو ان شعروں پر شبہ ہوا تھا کہ ذوق کے ہوں۔ تمام دیوان ڈھونڈ مارا، جب اس میں نہ ملے، اس وقت کہاں جاکر اطمینان ہوا کہ احسان ہی کے ہونگے :

شب عجب تھی تاب جگنو کی کہ جسکے سامنے ماہ عالم تاب بھی ایک کرمک شب تاب تھا

میں جو مے پینے پہ آؤں تو سبو پی جاؤں گر محتسب منع کرے اسکا لہو پی جاؤں

کھلے، کیا کہوں طفل اشک اپنے گلے کا ہار ہیں اس زمانے کے تو چھوٹے لڑکے بھی ناہموار ہیں

اس شعر کو دیکھئے، انشا کا کلام معلوم ہوتا ہے، وہی شوخی ہے وہی چہل اور وہی الفاظ :

گھر سے کس طرح سے یوں حضرت سلم نکلیں   دی نہ ہو ہونے اجازت نہ ددا نے چاہا

مومن کا رنگ دیکھو :

گرہ دل، احسان، غم، معشوق وسے صد آفریں   پیرومرشد واہ یہ بدوست خدا کے گھر کے پاس

کیا احسان کے اس شعر کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ میر کا نہیں ہے :

غم ساتھ ہوا گلی سے تیری   اک آئے تھے اور دو گئے ہم

ہم طرح غزلیں

احسان نے اتنی بڑی عمر پائی کہ میر سے لگا کر ذوق تک کا زمانہ ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا - ان سے کوئی مشاعرہ نہیں چھوٹتا تھا - ممکن نہیں کہ طرح کی غزلیں نہ کہی ہوں ، مگر ان کا دیوان دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ میر ، جرات ، انشا ، مصحفی، نصیر ، غالب ، مومن ، اور ذوق کی غزلوں پر ان کی صرف ایک ایک دو دو غزلیں ہیں، بلکہ دیوان دیکھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے جان کر پہلو بچایا ہے ، کہیں ردیف بدل دی ہے ، کہیں قافیہ بدل دیا ہے، ذوق اور یہ تو ایک دوسرے کے مدمقابل تھے ، یقین ہے کہ دونوں نے اس کا التزام رکھا ہو کہ ایک ہی طرح میں دونوں کی غزلیں نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو ایک کا قافیہ دوسرے کے ہاں حتی المقدور نہ آئے تاکہ مقابلے سے کسی کی استادی پر حرف نہ آسکے —

ذوق کی ایک غزل ہے :

ہے جی میں اپنے غرۂ جو ہر کو توڑ دوں   آئینۂ خیال مکدر کو توڑ دوں

اس کے کل ۱۲ شعر ہیں ، ، احسان، نے اسی زمین میں ۳۴ شعروں کا دو غزلہ لکھا ہے - مقابلتاً صرف ۷ اشعار لکھ دیتا ہوں جن کے قافیے ایک ہیں - آگے چل کر صرف ایک غزل میں ان دونوں استادوں کے اشعار کے متعلق اپنی رائے ظاہر کروں گا، باقی کے بارے میں آپ خود فیصلہ کر لیجئے :

ذوق :   دنیا سے میں اگر دل مضطر کو توڑ دوں
سارے خیال وہم مکدر کو توڑ دوں

احسان: کیوں تار گریۂ دل مضطر کو توڑ دوں
گوہر کو توڑوں رشتۂ گوہر کو توڑ دوں

ذوق: میں کاٹ دوں پہاڑ کو پتھر کو توڑ دوں
پر کیوں کہ غیر سے بت کافر کو توڑ دوں

احسان: وہ آگ اور وہ آب ہوں، پتھر کو توڑ دوں
پر بس نہیں کہ میں دل کافر کو توڑ دوں

ذوق: نازک کلامیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

احسان: دل میں ہے اب کے ایسی غزل گرم میں کہوں
پتھر کا دل جو اس کا ہو پتھر کو توڑ دوں

ذوق کا یہ شعر بیت‌الغزل ہے:

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا — کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں

اور احسان کا یہ قطعہ بہت مزے کا ہے۔

گر ذکر بحر رحمت حق حشر میں کروں — کوہ گناہ ہر صف محشر کو توڑ دوں

از بہر تشنگان قیامت بہر طرف — تسنیم و سلسبیل کو، کوثر کو، توڑ دوں

یہ شعر بھی اچھا ہے:

مسجد میں یاد آئے جو نام خدا وہ بت — سر پٹکوں اس طرح سے کہ منبر کو توڑ دوں

ذوق کی ایک اور سات شعر کی غزل ہے:

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے — یہ نصیب اللہ‌اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اس زمین میں احسان کی ۲۴ شعروں کی دو غزلیں ہیں۔ ذوق کے مطلع بالا کا جواب ہوا ہے:

محتسب بھی پی کے مے لوٹنے ہے میخانے میں آج
ہاتھ لا پیر مغاں یہ لوٹنے کی جاے ہے

ذوق: رخصت اے زنداں، جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

احساں: عشق کی دولت سے جب غش سا مجھے آجائے ہے
آپ وہ روئے ہے اور تلوا مرا کھجلائے ہے

ذوق کا بہترین شعر اس کا مقطع ہے:

نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانب در دیکھ لے ہے جب کہ ہوش آجائے ہے

احسان کا سب سے اچھا شعر یہ ہے، ذرا دیکھئیگا، نیا مضمون ہے:

گرمیء الفت سے آنسو چشم تر برسائے ہے پہلے گرمائے ہے پیچھے جس طرح مینہ آئے ہے

مہاراجہ چندو لعل مدارالمہام حیدر آباد دکن نے أستاد ذوق کے پاس اپنے ہاں کے مشاعرے کی طرح بھیجی تھی، انہوں نے دو غزلہ کہہ کر روانہ کیا۔ احسان کا بھی اس زمین میں دو غزلہ ہے:

ذوق: کل گئے تھے تم جسے بیمار ہجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

احساں: قیس مت جا، بند و غل، زنجیرو زنداں چھوڑکر
کس طرف جاتا ہے دیوانے یہ ساماں چھوڑ کر

ذوق: کام یہ تیرا ہی تھا، رحمت ہے اے ابر کرم
ورنہ جائے داغ عصیاں میرا داماں چھوڑ کر

احسان: دامنِ صحرا و جیب کوہ کو کر چاک چاک
اے دلِ دیوانہ اپنے جیب و داماں چھوڑ کر

ذوق: دیکھئے کیا ہو کہ ہے اب جان کے پیچھے پڑی
دل کو اے کافر تری زلفِ پریشاں چھوڑ کر

احسان: ہر دم و بر ہم ہوئی جمعیتِ خاطر تمام
کون آیا منہ پہ شب زلفِ پریشاں چھوڑ کر

ذوق: میں وہ ہوں گم نام - جب دفتر میں نام آیا مرا
رہ گیا بس منشی قدرت جگہ وہاں چھوڑ کر

احسان: دشت میں مجنوں کو چھوڑا کوہ کن کو کوہ میں
ذائب اپنے ہم چلے یہاں چھوڑ کر وہاں چھوڑ کر

ذوق: سایۂ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے
سانپ سا پانی میں اے سرو خراماں چھوڑ کر

احسان: سرو سے قمری پھرے ہے بگڑی بگڑی باغ میں
کیا شگوفہ تو گیا سرو خراماں چھوڑ کر

ذوق: اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

احسان: لعل لب پر شش ہوں گو دستِ حنائی بھی ہیں خوب
کون لے مرجاں کو لعلِ بدخشاں چھوڑ کر

ذوق: وصل میں گر سمجھ کو ہووے رویت ماہ رجب
روے جاناں ہی کو دیکھوں میں تو قرآں چھوڑ کر

احسان: اس فرنگی زادے کا منہ تکتے گزرے ہے انھیں
اب لگے انجیل پڑھنے یار قرآں چھوڑ کر

احسان نے کئی جگہ اور بھی روے یار کو بجاے قرآن کے انجیل سے تشبیہ دی ہے - ذرا اس مضمون کو دیکھئے کیا عجیب و غریب ہے :

نہیں لب پہ تیرے خط اے یار جانی مسیحا ہے مصروف انجیل خوانی

ذوق کی ایک اور مشہور غزل ہے :

مے پلاکر ساقیاں سامری فن آب میں کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

اس غزل کے بعد انھوں نے اکبر شاہ ثانی کی تعریف میں ۳۰ - ۳۲ شعر کا ایک قصیدہ بھی اسی زمین میں کہا ہے —

احسان کے صرف دو شعر اس زمین میں مجھے ملے ہیں، لیکن ان دونوں شعروں میں جو قافیے ہیں، وہ ذوق کے ہاں نہیں ہیں - ایک قافیہ تو ایسا عجیب و غریب ہے کہ کسی شاعر کے ہاں نہ یہ قافیہ ہوگا اور نہ یہ مضمون —

عکس پرویں دیکھ کر بولا وہ پر فن، آب میں
کس نے پھینکی موتیوں کی میری سمرن آب میں

جوسیہ روے ازل ہیں وہ سپید اصلا نہ ہوں
آ اگر ہے شبہ کچھ ، دھو دیکھ جامن آب میں

اب تک یہ مضمون " کہ زنگی بشستن نگردد سپید " سے ادا کیا جاتا تھا - انھوں نے خاص ہندوستانی رنگ میں اس کو باندھا ہے - یہی چیزیں ہیں جن سے زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے " جامن " کا قافیہ کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں اسکتا اور آ بھی جاے تو اس کا باندھنا دشوار ہے —

احسان اور ذوق کے بعض شعر تو ایسے ہیں کہ ایک ہی قلم سے نکلے ہوے

معلوم ہوتے ہیں۔ بھلا ایسے اُستادوں کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ ایک نے دوسرے کی نقل کی ہے—

احسان: پلاؤں میں تجھے، گو کاٹے ہاتھ تو میرا
جو اب کے تو نہ پئے مے پئے لہو میرا

ذوق: کہے ہے خنجرِ قاتل سے یہ گلو میرا
کبھی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا

احسان: دوست کیا کیا مر گئے اہل کمال افسوس ہے
پر جو تھے اہل کمال ان کا کمال افسوس ہے

ذوق: یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

احسان: میل کباب دل اسے دل کی تلاش ہے
اس کی معاش دیکھو بڑا بد معاش ہے

ذوق: دل کی معاش غم، اسے غم کی تلاش ہے
ڈرتا ہوں دل سے میں کہ بڑا بدمعاش ہے

ذوق کی ایک غزل ہے

کب وہ گزرتے ہیں سرلات و کذات سے   جن کی کہ آشنا ہے زباں لام و کاف سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشاعرے کی غزل ہے۔ کیونکہ احسان کی بھی ایک بڑی لمبی چوڑی غزل اسی زمین میں ہے۔ مگر یہاں بھی دونوں شاعروں نے کوشش کی کی ہے کہ ایک کا قافیہ دوسرے کے ہاں نہ آئے۔ میں صرف وہ شعر نقل کرتا ہوں جو ہم قافیہ ہیں—

کب وہ گزرتے ہیں سرلات و کذات سے
جن کی کہ آشنا ہے زباں لام و کاف سے

احسان : دشنام اور دے تو مجھے انحراف سے
عاشق کو لک وصول ہیں اک لام و کاف سے

بھلا میں کیا اور میری رائے کیا - پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ شاعری کے لحاظ سے ذوق کا شعر کمزور ہے - لام و کاف ' لعنت کرنے اور کافر کہنے ' کے سر حرف ہیں اور اس کے معنی ' گالی گلوج کرنا ' لئے جاتے ہیں - لاف و گذاف کے معنی ' تعلی اور بیہودہ سرائی' کے ہیں-ذوق نے لام و کاف کولاف و گذاف کا سر حرف قرار دیا ہے - یہاں تک تو بالکل ٹھیک ہے اور واقعی ایک اچھی بات نکالی ہے - اب شعر کے یہ معنی ہوے کہ جن کی زبان پر گالی گلوج چڑھی ہوتی ہے وہ اگر شیخی ماریں تو کیا تعجب ہے - اس میں دو کمزوریاں ہیں - ایک تو یہ کہ صفت نے بجاے ترقی کے تنزل کیا ہے - بس یہی صورت ہوئی جیسے کہیں کہ وہ رستم ہے ' چوہا بھی مار سکتا ہے - دوسرے یہ کہ وجہ سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ لازمی نتیجہ نہیں ہے- یہ کیا ضرور ہے کہ جو شخص گالیاں بکتاہو وہ شیخی خورا بھی ہو-

اب اس کے مقابلے میں احسان کا شعر دیکھئے - اس نے بھی لام و کاف کے دوسرے معنی لئے ہیں اور لاکھ روپے کی بات نکالی ہے - کہتا ہے : تو بگڑ بگڑ کر مجھے گالیاں دئے جا ' تیرا ہر لام و کاف مجھے لاکھ روپے کے برابر ہے- مگر لک کا لفظ ذرا کھٹکتا ہے - مجھے تو دونوں شعروں میں سے ایک بھی پسند نہیں -

ذوق : اول ہی سے بشر کو ہے رغبت خلاف سے
لیتا تھا کام منہ کا شکم میں یہ ناف سے

احسان : عنبر خجل ہے زلف سے' پر ہے نئی یہ بات
شرمندہ مشک نافہ ہوا بوے ناف سے

ایک کا حکیمانہ شعر ہے' دوسرے کا عاشقانہ - ایک منطقی وجہ قائم کر کے انسان کی فطرت بیان کر تا ہے ' دوسرا صرف واقعہ بیان کر تا ہے - ایک پیٹ کی

بات کہتا ہے - دوسرا آنکھ دیکھی (آنکھ دیکھی نہیں ، ناک سونگھی) بات کہتا ہے —

ذوق : چل میکدے میں شیخ بسر کر مہ صیام
مسجد میں تنگ بیٹھا ہے کیوں اعتکاف سے

احسان : ماہ صیام میں تجھے ہر روز عید ہے
احساں عجب ہے کل ، نہ نکل اعتکاف سے

احساں کے ہاں ' کل ' کے معنی آرام کے ہیں - دونوں شعر معمولی ہیں ، پھر بھی ذوق کا شعر بہتر ہے —

ذوق : نالوں نے دی چڑھا جو تپ لرزہ مہر کو
کھولی نہ آنکھ ابر سیہ کے لحاف سے

احسان : سوتے میں کس کا روے منور ہے کھل گیا
یہ منہ نہیں ہے چاند ہے نکلا لحاف سے

دونوں شعر بھرتی کے ہیں-

ذوق : ہو جوہر کمال پہ ننگا جو خاکسار
ایک تیغ ہے کہ ننگ ہے اس کو غلاف سے

اسی قافیے میں ذوق کا دوسرا شعر ہے

جوں تیغ خوش غلاف نگہ تیری اے پری
ہے دمبدم نکل کے چمکتی غلاف سے

احسان : اس بانکپن پہ میں ہوں تصدق کہ اے میاں
شمشیر نکلی پڑتی ہے ہر دم غلاف سے

ذوق کا پہلا شعر غضب کا شعر ہے ، کیا بلحاظ شوکت الفاظ اور کیا بلحاظ مضمون اس شعر کا جواب ہونا مشکل ہے - احساں کے ہاں رعایت لفظی نے کمزوری پیدا کردی ہے - دوسرا مصرعہ واقعی لاجواب ہے ، مگر پہلے مصرعہ کی اول تو بندش

کمزور ہے، دوسرے "میاں" کے لفظ نے اس کو اور بھی گیا گزرا کردیا -

ذوق : گردش ہے اس کی چشم کی کیوں میرے دل کے گرد
کافر کو کام کعبے کے ہے کیا طواف سے

اس قافیے میں ان کا دوسرا شعر ہے :

طوف سیاہ خیمۂ لیلیٰ ہوا نصیب
مجنوں، سمجھیو کعبے کے بہتر طواف سے

احسان : آؤں گا میں بھی کعبے کو، تم جاؤ شیخ جی
فرصت اگر ہوئی مجھے دل کے طواف سے

احسان کا شعر یقیناً ذوق کے دونوں شعروں سے بڑھا ہوا ہے اور طرز ادا ایسا بانکا ہے کہ سبحان اللہ -

ذوق : اڑتے ہیں کہ نصیب سے گاہے فلک سے ہم
فرقت کی رات کم نہیں روز مصاف سے

احسان : بے فائدہ نہ تیغ و سپر کو سنبھالئے
انصاف کیجئے فائدہ کیا ہے مصاف سے (ق)

ہے صاف صاف یہ کہ نہ لوں بوسے کس طرح
یہ گورے گورے گال ہیں کیا صاف صاف سے

ذوق : گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق جہاں
اے 'ذوق' اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

احسان : دل میرا زلف کو ہی دے، اے خال مت جھگڑ
سو سو بلائیں اٹھتی ہیں ایک اختلاف سے

ذوق ایک شعر میں وہ فلسفہ بیان کرگیا ہے جو ایک کتاب میں آنا مشکل ہے -

ایسے هی شعروں نے آخر اس کو ملک‌الشعراء بنادیا تھا —

شاہ نصیر کی بھی دو چار غزلوں پر احسان کی غزلیں هیں۔ ایک مشاعرے میں طرح کا مصرعہ تھا: ۔ " خدا جانے کیا اس کا انجام ہوگا" دونوں نے اس کی تضمین کی هے —

نصیر : نہ سمجھو کہ آغاز خط عارضی هے
خدا جانے کیا اس کا انجام ہوگا

احسان : سنو! جب کہ آغاز الفت هے یہ کچھہ
خدا جانے کیا اس کا انجام ہوگا

شاہ نصیر اور احسان کی ایک طرحی غزل کے هم قافیہ اشعار بالمقابل لکھتا هوں ۔ اس سے ان دونوں استادوں کے کلام کا اندازہ هو جائیگا ۔ بعض جگہ تو یہ حالت هوئی هے کہ مضمون تو مضمون الفاظ بھی مل گئے هیں —

نصیر : میں هی تھا جو کہ دل کو رها تھام اب تلک
غم کر چکا تھا ورنہ مرا کام اب تلک

احسان : نکلا نہ اس کے لب سے مرا کام اب تلک
اللہ وہ صنم نہ ہوا رام اب تلک

نصیر : همچشمی اس کی چشم سے جو کی تھی اسلئے
هم پھوڑتے هیں دیدۂ بادام اب تلک

احسان : رتبہ وہ تیرے چشم کے کشتے کا هے کہ خلق
لاتی هے اس کی قبر پہ بادام اب تلک

نصیر : هے یاد اس کی دل میں همارے کہ جسنے آہ
بھولے سے بھی لیا نہ کبھی نام اب تلک

احسان — احساں میں جسکے نام پہ دیتا ہوں اپنی جاں
وہ جانتا نہیں ہے مرا نام اب تلک

نصیر : یاں چھت سے آنکھیں لگ گئیں اور واں وہ ماہرو
آیا نہ حیف تا بہ لب بام اب تلک

احسان : گزرا تھا رشک ماہ کہیں ایک شب وہاں
اک روشنی سی ہے بلب بام اب تلک

نصیر : مر کر بھی ہم نے اس دل مضطر کے ہاتھ سے
پایا نہ زیر خاک کچھ آرام اب تلک

احسان : گو مر چکا ہوں، پر دل مضطر کے ہاتھ سے
میرے نصیب میں نہیں آرام اب تلک

نصیر : کھا کھا کے داغ سرو چراغاں میں بن گیا
ہر گز ملا نہ، پر، وہ گل اندام اب تلک

احسان : ہوتی تھی جن کو بستر گل پر بھی بیکلی
ہیں خاک میں پڑے وہ گل اندام اب تلک

نصیر : ظاہر میں اس کے گو ہے رکاوٹ پر اے نصیر
جاری ہے رسم نامۂ و پیغام اب تلک

احسان : پیغام بوسہ پر ہے تسلی کسے یہاں
تیرا وہ ہی ہے بوسہ بہ پیغام اب تلک

اب دونوں غزلوں کو آپ خود ملاحظہ فرما لیجئے - احسان کی غزل کسی طرح

شاہ نصیر سے دبی ہوئی نہیں ہے —

میر نظام الدین ممنون اور احسان کی اکثر غزلیں ایک ہی زمین میں ہیں، لیکن خدا معلوم کیا بات ہے کہ جو قافیہ ایک نے باندھا ہے وہ دوسرے نے چھوڑ دیا ہے - بعض میں قافیے ملتے ہیں، وہ بالمقابل لکھے دیتا ہوں :

ممنون : کہاں نہ کیونکہ کروں تجھپہ دل چرانے کا
جھکا کے آنکھ سبب کیا ہے مسکرانے کا

احسان : ہماری جان پہ گرتی ہے برق غم ظالم!
تجھے تو سہل سا ہے شغل مسکرانے کا

ممنون : وائے بیکاری وحشت کہ رکھیں مشغلہ کیا
نہ تو داماں ہے ثابت نہ گریباں درست

احسان : سینہ اسطرح کھلا بند ہے وا، بندہ نواز
کچھ بھی موقع ہے ذرا کیجے گریباں درست

نمونہ کلام

جب مضمون بڑہ جاتا ہے تو لکھنے والا لکھتے لکھتے اور پڑھنے والا پڑھتے پڑھتے اُکتا جاتا ہے - ایسی صورت میں یہی بہتر ہوتا ہے کہ کسی طرح لپیٹ سمیٹ کر مضمون ختم کر دیا جائے - یہی طریقہ اب میں بھی اختیار کرتا ہوں اور 'احسان' کے کلام کے کچھ نمونے اور بعض غزلیں لکھ کر مضمون کو ختم کرتا ہوں - ہر شخص کی پسند جدا جدا ہوتی ہے - کیا ضرور ہے کہ جو شعر مجھے پسند ہو وہ آپکو بھی پسند آئے، پھر تو وجہ ہے کہ جتنے شعرا کے تذکرے ہیں سب میں انتخاب کلام مختلف ہے - آپکو کیا کروں مجھا نقد تنہا مجھی ہی پڑیگا، آپ ہوتے تو آپ سے بھی مشورہ لے لیتا - انتخاب میں میرے دو تین چیزوں کو پیش نظر رکھا ہے - ایک جدت مضمون، دوسرے محاورہ اور تیسرے روانی - اگر ہر عنوان کے شعر علحدہ علحدہ کر دوں تو بعض صورتوں میں سلسلہ ٹوٹ کر مزا جاتا رہیگا - اس لئے بلا لحاظ

مضمون سب کو ایک ہی جگہ لکھہ دیتا ہوں ، آپ کو ضرورت ہے تو تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے ان اشعار کو بہ لحاظ مضامین خود تقسیم کر لیجئے —

رکھا ہے عشق کے دریا میں اب قدم میں نے معاف کیجیو یا ر و ! کہا سنا میرا

سیری ہمارے زخم کو مطلق نہیں ہوئی جتنا تھا زور شور نمکداں کا ہوچکا

دریا بہی کیا ہے ، گرم تو ے پر ہو دیے بوند ہم سے علاج سینۂ سوزاں کا ہوچکا

مر جائیگا فراق میں کہتا ہے مجھکو تو ق اس منہ پہ وصل اس مہ تاباں کا ہوچکا

فی الواقعہ یہ تو نے کہا ایک ناصحا یہاں کل ہی واقعہ شب ہجراں کا ہوچکا

تجھہ کو کبھی نہ دیکھا ، دیکھا جہاں سارا گرچہ تجھی کو میں نے سارے جہاں میں دیکھا

کہا جو میں نے کہ اے رشک ماہ کو رمیرے ق تو مہربانی سے کیوں ایک ذرا نہیں رہتا

لگا یہ کہنے کہ ہاں ہاں ، ہے یہ بھی اپنا شوق
نہیں ، نہیں ، نہیں رہتا ہوں ، جا نہیں رہتا

داد دیجئے کا ، کیا خوبصورت تکرار ہے —

ہماری چھاتی پہ پھرتا ہے سانپ یہاں احسان
وہاں ہے شغل اسے زلف کے بنانے کا

یہ شام ہجر آئی شامت زدہ کہاں سے ہو رو سیاہ ایسے ناخواندہ میہماں کا

پیک اجل ٹھہر جا ، چلتا ہوں میں بھی یعنی پیغام خود سنونگا یاران رفتگاں کا

کیا خوبصورت شعر ہے اور کیا لطیف مضمون ہے - سبحان اللہ —

مرگ کے پہنچا ہوں نزدیک ، تری جان سے دور
مجھہ پہ کیا کیا کہوں فرقت میں کہ کیا کیا نہ ہوا

کیا ہی کوچہ ہے مرے دوست کا اللہ اللہ بر ہمن آن کے وہاں دشمن بتخانہ ہوا

مرا تو ناک میں دم تو نے چرخ پیر کیا   پہ تیری ناک میں آ کر رسا نے تیر کیا

تو کیوں ہے گریہ کناں اے مرے دل محزوں
نہ رو نہ رو کہ نہ تجھ کو کہیں رلائے خدا
بتو ! بتاؤ تو کیا تم خدا کو دوگے جواب
خدا سے بندوں پہ یہ ظلم بندہ ہائے خدا
رضا میں تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف
اور اس پہ تو نہیں راضی نہ ہو' رضائے خدا
بتوں کے کوچے میں کہتا تھا کل یہی احساں
یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

تیرا مریض عشق تو جی سے گذر گیا   کل پہلا دن تھا آج میری جاں ہے دوسرا

محاورہ ہے "آج مرے کل دوسرا دن" —

میری بغل سے دل کو نکالو کسی طرح   جراح سے یہ کہہ دو کہ پیکاں ہے دوسرا

لاجواب شعر ہے ' پیکاں سے دل کو تشبیہ دی ہے - جس نے خدا نخواستہ کبھی پیکاں دیکھا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ کیسی خوبصورت تشبیہ ہے اور اس کے ساتھ یہ دیکھئے کہ کس طرح جراح کو دھوکا دینا چاہتے ہیں - جانتے ہیں کہ دل کے نکلے بغیر درد نہ جائیگا اور جراح اس ڈر کے مارے دل نہ نکالیگا کہ دل نکالا اور یہ مرا - یاروں سے کہتے ہیں کہ اس کو دھوکا دیدو کہ یہ دل نہیں ہے دوسرا پیکاں ہے —

ہوا ہوں عشق سے ناچار یہاں تلک ' احساں'   جو مجھ کو ہائے نہ کرنا تھا ناگزیر کیا

یارو ! سبھی کو میرے گریباں کا فکر ہے   ناصح کے منہ کو آنکے کوئی نہ سی گیا

مری آہ آتش فشاں دیکھتے ہی   لئے گھر سے ہر ایک قرآن نکلا
کیا میلے مجرا تو جھنجلا کے بولے   کہاں کا مرا جان پہچان نکلا
مجھے شیخ الفت سے مانع ہے، احسان   ولی جس کو سمجھا تھا شیطان نکلا

بجھی جو شمع تو پروانوں پر ہوا روشن   کہ بعد مرگ کوئی آشنا نہیں رہتا

تم آئے ورنہ ہجر میں بچنا محال تھا   ہمکو شب فراق ہی روز وصال تھا

کبھی شادی کبھی غم ہے، یہی عالم ہے عالم کا
مہ عید الضحیٰ گزرا تو چاند آیا محرم کا

کہا میلے مرے گھر بھی کبھو آؤگے، یہ بولے:
میں کیوں آؤں مجھے کیا واسطہ، کیا کار، کیا باعث

سبک کہینگے تجھے لوگ اٹھ نہ بالیں سے
کہ رات اس ترے بیمار پر ہے بھاری آج
تمہارے آج کے وعدے کو میں سمجھتا ہوں
کہ تا بحشر نہ نبڑیگی یہ تمہاری آج
خاک میں مل کر تماشا مزرع دنیا کا دیکھ
ساتھ ہے ہر قفل کے کنجی یہاں دانے کی طرح

فائدہ؟ تم جو مجھے نزع میں یار آئے نظر
ہے نہ یارائے سخن اور نہ یارائے نظر

نظر آتی ہے تری مانگ میں یوں سلک گہر
ابر میں جیسے کہ بگلوں کی قطار آئے نظر

نئی تشبیہ ہے اور لاجواب ہے - میں شعر لکھے جاتا ہوں، آپ تعریف کرتے جائیے - اگر میں نے ہر شعر کی تعریف کرنی اور اس کی خوبیاں دکھانی شروع کیں تو یہ مضمون کبھی ختم ہی نہ ہوگا اچھا آگے چلئے:

دیکھیو میری طرف، سچ کہیو اے اختر شناس
کیوں فلک کو تو نے دیکھا میرے اختر دیکھکر

کیا غضب کا شعر ہے - ارادہ تھا کہ کسی شعر پر کوئی نوٹ نہ دونگا لیکن کیا کروں، اس شعر کی تعریف کئے بغیر بھی تو نہیں رہا جاتا - شعر کیا ہے ٹوٹکا ہے - معشوق کے ہاتھوں پریشان ہو کر فال کھلوانے جاتے ہیں کہ قسمت میں وصل لکھا بھی ہے یا نہیں - نجومی ہاتھ دیکھتا ہے، زائچہ کھینچتا ہے، ستاروں کے چکر دیکھتا ہے اور بجائے ان سے کچھ کہنے کے آسمان کی طرف دیکھتا ہے - اس کا جو اثر بیچارے عاشق کے دل پر ہوا وہ ایک دفتر میں بھی بیان نہیں ہو سکتا - اور جو الجھنیں اس کے دل میں پیدا ہوئیں ان کی تشریح محال ہے - یہ شاعر کا کمال ہے کہ اس نے کچھ نہ کہا اور سب کچھ کہہ دیا - کیا بلحاظ زبان، کیا بلحاظ طریقۂ ادا اور کیا بلحاظ مضمون، علم ادب میں ایسے شاید چند ہی شعر نکلیں؛ یہ وہ شعر ہے جس پر ہزاروں دیوان قربان کر دئے جائیں تو سزاوار ہے -

اگرچہ میں فغاں سے نیند اک عالم کی کھوتا ہوں
تری خاطر ہے مجھکو اے اجل بس آج سوتا ہوں

الہ میرا چھا گیا آنکھوں میں جب سے توگیا یہاں سے
کوئی آنکھوں سے روئے اور میں آنکھوں کو روتا ہوں

چھائے پھر خجالت میں وہ سب ڈوب مریں
اپنے معشوق کو جو جان جہاں کہتے ہیں
ایک نقطہ بھی زیادہ جو زباں پر آیا
وہ زباں ہی نہیں پھر اس کو زیاں کہتے ہیں
میں تڑپتا ہوں غم عشق بتاں میں 'احسان'
حکما ' فضل الہی ' خفقاں کہتے ہیں

مجھکو مت چھیڑو کہ میں سر تاپا تاثیر ہوں
برق ہوں ' آہ سحر ہوں ' نالۂ شبگیر ہوں
کام رہتا ہے سدا گردن کشوں سے ہی مجھے
پیچ و تاب حلقۂ ہائے جوہر شمشیر ہوں
درد دل تو میرے جانا اُس نے افسانہ مگر
چپ جو رہتا ہوں تو پھر کہتا ہے وہ بے پیر ہوں
فی المثل آب بقا برسے تو کیا حاصل مجھے
مزرع دنیا میں 'احسان' دانۂ زنجیر ہوں

پلا ئی مے رمضاں میں نہ مجھکو اے ساقی
بڑے عذاب سے کٹتے ہیں یہ ثواب کے دن

بہت کم ہے سچ اس زمانے میں 'احسان' یہاں جھوٹ کے کارخانے بہت ہیں

تاب کس کو ہے جو پھر پھر تقابل آ سکے (ق)
گرم آہ گرم ' اپنا جب دل بیتاب ہو

خاک کو بھی چاٹ کر کہتا ہوں اے بادِ سموم
تو تو کیا ہے آتشِ دوزخ کا زہرہ آب ہو
میں یہ کہتا ہی نہیں تجھکو، رہ الفت میں تو
رستم و افراسیاب و بیژن و سہراب ہو
بیدل و بیتاب و بے آرام و بیخود، بیخبر
بے سرو بے صبر و بیجاں، بیخور و بیخواب ہو
کیا نمودِ خط سے خطرہ، کیوں مکدر تو ہوا
اے الف قامت وہ مصحف کیا جو بے اعراب ہو

جب میںنے کہا چاہتا ہوں میں تجھے واللہ
بولا وہ صنم : تم مجھے للہ نہ چاہو
جنت کا یہ سب ذکر فراموش ہو واعظ
گر حضرتِ من آپ کا دوزخ نہ بھرا ہو

گیا نہ ہمراہ اس کے میں کل، گیا وہ گھر کو کیا بہانہ
دریغ یہ ہے دروغ گو کو نہ میںنے پہنچا یا تا بخانہ
جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا محاورہ باندھا ہے —

غرور سے نہیں خاطر میں اپنے لاتے ہو — سلام لیتے ہو یا مکھیاں اُڑاتے ہو

دیا ٹھکانا تیرے وعدے کا بت بے پیر ہے — آج ہفتہ اور کل اتوار پرسوں پیر ہے

غم بھی آ گیا دل میں یوں لپٹا ہوا ہمراہ عشق
جس طرح کوئی طفیلی آتا ہے مہماں کے ساتھ
اے وفا دشمن یہ تیرے عشق سے ثابت ہوا
سر بسر جی کا زیاں ہے دوستی ناداں کے ساتھ

محاورہ ہے " نادان کی دوستی جی کا زیان " غالب' نے بھی اس محاورے کو باندھا ہے
غالب: فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی ہے دانا اسد دوستی نادان کی جی کا زیاں ہو جائے گا

قسمت کا بلی زلف گرہ گیر سے چھوٹے ہاتھی بھی نہ جکڑا ہوا زنجیر سے چھوٹے

کی تو اغیار سے سازش ہے ' ولے غنچہ دہن!
چٹکیوں میں ہیں یہ جو بن کے اُڑانے والے
ان کے ہنسنے پہ نہ جا ' ان کے ہنسانے سے نہ ہنس
تیرے ہنسنے پہ یہ ہنستے ہیں ہنسانے والے

رخ پہ جب خال کو دیکھا تو کہا میں نے کہ یار!
ربط کس طرح بہم کافرو دیندار میں ہے
بولا سررشتہ یہ کچھ آج کی ایجاد نہیں
رشتہ اک دہر سے یہاں سبحۂ و زنار میں ہے

چشم مست اس کی یاد آنے لگی پھر زباں میری لڑکھڑانے لگی
آگ اس دل لگی کو لگ جائے دل لگی آگ پھر لگانے لگی
کس کی آواز پاسنی کہ مجھے نزع کے وقت نیند آنے لگی

مستعد بدی ہوا وہ ہی ق جس سے کی ہم نے بارہا نیکی
نیکیاں کر کے ہو بدی حاصل ہے تری آخری زمانے کی
اسی مضمون کو 'غالب' نے یوں ادا کیا ہے :

کہوں کیا خوبیٔ اوضاع ابنائے زماں، غالبؔ!
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

وہ بھر حسن شاید باغ میں آئے گا اے احسان
کہ فوارہ خوشی سے آج دو دو گز اُچھلتا ہے

الف قامت ترا، میم دھن، جوں نون تنویں ہے
کہ سننے میں ہے آیا، پر نہیں دیکھا کسو رو سے

جو میں نے دل کی خوشامد کہا یہ درباں سے
خوشامدی مری محفل میں کوئی آ نہ سکے

نہ زاہد ہوں، نہ میکش ہوں، نہ میناساز ہوں، احسان،
نہ مجھکو کام مینے سے نہ مینا سے نہ مینو سے

تسبیح کے ایسے دانوں کو جو شیشے کے ہوں "مینے" کہتے ہیں۔ مگر زاہد اور میکش کے ساتھ میناساز کا لفظ بہت بے جوڑ آیا ہے۔ "مینے اور مینا" کے ساتھ "مینو" کا لفظ لانا تھا، اس لئے زبردستی "میناساز" کو ٹھونس دیا —

اسی غزل میں دوسرا قطعہ کہا ہے، واقعی لاجواب ہے۔ مجھے اس لئے اور بھی پسند ہے کہ عربی اور ایرانی عاشقوں کے ساتھ ہندوستان کے عاشقوں کو بھی شریک کردیا۔ سسی اور پنو کے عشق کا حال پنجاب والوں سے پوچھو —

ہوا دشت محبت طے عزیزو، دوستو! ہرگز
نہ عشاق جفا کش ہے نہ معشوق جفا جو ہے

نہ خسرو ہے، نہ شیریں ہے، نہ مجنوں ہے، نہ لیلیٰ ہے
نہ وامق ہے، نہ عذرا ہے، نہ سسی ہے، نہ پنو ہے

جہاں تجھکو بھی نہو مجھکو ستانے والے
تو بھی تھانڈا نہ رہے جی کے جلانے والے

پیر مغاں کی ہے یہ کرامات ساقیا یوں میکدے میں ساغر بے دست وپا چلے

اب دو غزلیں پوری پوری لکھکر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ان غزلوں کے دیکھنے سے آپ کو احسان کی شاعری کا اور اچھی طرح اندازہ ہوجائیگا۔ فال کھولنے کی طرح دیوان کھولتا ہوں، جو دو غزلیں پہلے نکلیں۔ وہی نقل کردونگا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

دل کو چرا کے عشق کا مجھ پر رکھا گناہ
انصاف کیجیے میرا ہے یا آپ کا گناہ

جان دل حزیں جگرے خستگاں پہ رحم
میں نے کہا ثواب ہے کہنے لگا گناہ

جب تم سے بولتا ہوں برا مانتے ہو تم
کچھ جرم، کچھ قصور، بھلا کچھ خطا، گناہ

بار غم بتاں سے نجات اب کی بار ہو
بار دگر نہوگا یہ بار خدا گناہ

میں نے کہا کہ زلف میں دل کو اسیر کر
بولا کہ سر پہ لیوے یہ میری بلا گناہ

پایا رواج بخل نے اب تو یہاں تلک
سمجھے ہیں اس زمانے میں جود و سخا گناہ

جنت میں مجھکو اس کی گلی سے ہیں لے چلے
کیا جانیے کہ مجھ سے ہوا، آہ کیا گناہ

احسان پر گناہ کے فضل و کرم سے بخش
یا رب بحق حضرت خیرالوریٰ گناہ

ہم ہیں کوچہ ہے یار جانی کا — زور ہے زور ناتوانی کا
نام تیرا ہے ورنہ اے عنقا — ہے نشاں ہم سے بے نشانی کا
غم سے ہوتا ہے غم غلط اپنا — کس کو یہاں غم ہے شادمانی کا
میں تو اس نوجوان پر غش ہوں — ہائے عالم تری جوانی کا
تو نہ ہووے تو جان مرجاؤں — تو ہی باعث ہے زندگانی کا
نیند اڑجائے سنتے ہی اسکے — یہ اثر ہے مری کہانی کا
اسی زلف دراز سے ہے خضر — سلسلہ عمر جاودانی کا
نہیں احساں تجھے سلیقہ کچھ — شعر گوئی کا شعر خوانی کا

کئی رباعیاں اوپر دے آیا ہوں، شاید نکالنے میں دقت ہو اسلئے ایک یہاں بھی لکھے دیتا ہوں:

جس طرح بنے عمر کا میوا پیدا — پڑ جائیگا آخر کو تو لینا دینا
دے نام خدا اور تو لے نام خدا — دنیا میں عجب چیز ہے دینا لینا

لیجئے مضمون ختم ہوگیا۔ محرم کا زمانہ ہے، طبیعت خود افسردہ ہے، مضمون میں بھی اگر افسردگی ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ مضمون لکھنے سے نہ میری کبھی یہ غرض تھی اور نہ ہے کہ آسمان کے تارے توڑ لاؤں، یا ایسا مضمون لکھوں کہ دھاک بیٹھ جائے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جو کچھ گزشتہ اور پانا کاب بزرگوں سے معلوم ہوجائے، اسکو محفوظ کردوں۔ بعد میں کوئی نہ کوئی بلا آدمی ان واقعات و حالات کو سلیقے سے جما لے گا۔ اگر مضمون کی ترتیب اور الفاظ کے انتخاب کو لیکر بیٹھا تو نہ سمجھ سے کچھ ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ مضمون ہاتھ سے جائیگا اور پرانے زمانے کے حالات ان بزرگوں کے ساتھ قبر میں چلے جائینگے۔ میاں بات یہ ہے کہ جو بندہ گیا سو موتی —

ایثار (فسانہ)

از

(جناب کشن پرشاد صاحب کول ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی، لکھنؤ)

ساوتری— یہ ان کی بڑھ پے میں کیا ست بھلک ہوئی، چھپن برس کی عمر میں شادی کرنے بیٹھے، اُنیس برس کی لڑکی ہے اور پھر گھر میں بیوی موجود۔ بڑے بڑے جوان لڑکے سامنے۔ پوتے نواسے والے —

ومِلا— جی ہاں اور سوشل رفارمر بننے تھے۔ سوشل رفارم کے نام سے جب ہی تو لوگ بھڑکتے ہیں، یہ تو آپ کے رفارمروں کا حال ہے۔ بدھیا آشرم کھول کر بیٹھے۔ لوگوں نے بھروسا کرکے اپنے یہاں کی بہوں بیٹیوں کو آشرم میں بھیجا کہ کچھ پڑھینگی، لکھینگی، سیکھینگی، وہاں یہ گُل کھلا۔ بھلا اب اگر لوگ ان باتوں سے دور بھاگیں اور سوشل رفارم کو بدنام کریں تو ان کو کس منہ سے الزام دے سکتے ہو —

ساوتری— کچھ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آیا کہ دیوان صاحب کو ہوا کیا۔ کیسا نورانی چہرہ، فرشتہ سیرت، آج تک سوائے تعریف کے کسی کی زبان سے کوئی کلمہ برائی کا نہیں سنا۔ عمر بھر پرا و پکار کی زندگی بسر کی۔ پھر کیسے قابل، سمجھدار، بردبار، دفعتاً یہ ہوا کیا۔ کیا بڑھاپے میں سب ہی کی عقل ماری جاتی ہے!

ومِلا— بہن جی۔ میں نے تو جب سے یہ سنا، سچ کہتی ہوں شرم کے مارے سر نہیں اٹھایا جاتا۔ اُنہوں نے اپنی سپید داڑھی میں تو سیاہی لگائی ہی، مگر قوم

والوں کا منہ بھی کالا کیا۔

شانتی۔ اسکو قاتل ہونا آدمی شریف ' فرشتہ صورت اور پراوپکاری ہے۔ کل تک تم سب کی زبانیں اُس کی تعریف کرتے کرتے نہیں تھکتی تھیں اور جب سے یہ حادثہ گزرا ' بلا سوچے سمجھے تم سب کے سب ہاتھ دھوکر اس کے پیچھے پڑ گئے - تم لوگ حیرت ظاہر کرتے تو بات سمجھ سکتی تھی' لیکن تم نے تو اہانت ملامت کا وہ طومار باندھا ہے کہ توبہ ہی بھلی —

وملا - بہن جی! یہ تم نے خوب کہا- تم اس بات کی حمایت کرنے کے لئے تیار ہو؟ ساو تو برادری والوں میں کیسا طوفان برپا ہے- اسکو بھی جانے دو- اخبار والے کیا لکھ رہے ہیں - لاہور بھر میں تھاکہ مچا ہوا ہے اور دیوان صاحب خود منہ چھپائے پھرتے ہیں - جو بات جیسی ہوگی ویسی کہی جائے گی —

ساوتری۔ یوگی حرکت تو واقعی بڑی نازیبا ہوئی - ایسے شخص سے ایسی حرکت کا ساں گمان بھی نہ تھا - بدھوا آشرم کے تو پاس بھی اب کوئی نہ جائے گا —

وملا - یہ بھی غضب دل لگی کی بات ہے ' غصہ بھی آتا ہے' شرم بھی آتی ہے' پھر ہنسی بھی - دیوان صاحب کو تو بڑا بھس لگی تھی' اس لڑکی کو کیا ہوا - شادی بھی کی تو کس سوکھے اچھور سے' ایک پیر قبر میں لٹکائے - آج مرے کل دوسرا دن —

ساوتری -اے اور بھی سنا' شادی دیوان صاحب کی بیوی کی مرضی سے ہوئی ہے' سنا کہ رکمنی کو بڑے پیار سے رکھتی ہیں —

وملا - میرا میاں ایسے کاپھے پر اس طرح سے مونگ دلے تو میں تو داڑھی نوچ لوں اور اس موئی سوت کو لگاؤں لوکا —

ساوتری- (ہنسکر) اے تیرے میاں کے داڑھی مونچھ ہی کہاں ہے جو نوچھ گی —

شانتی- تم نے اس پر نہیں غور کیا کہ رکمنی نے سارے جہاں کو چھوڑکر ایسے شخص

سے جو ایک پیر قبر میں لٹکائے ہے، شادی کرنی کیوں پسند کی اور دیوان صاحب کی بیوی رکمنی کو بیٹی کی طرح کیوں پیار کرتی ہیں - کچھ تو راز ہوگا - تم نے غور کرنے کی تکلیف ہو گوارا ہی ہوتی —

وملا - راز سارا طشت از بام ہوچکا، راز کیا ہوگا خاک، میری سمجھ میں تو یہ سارا اوال کا اوال بگڑا ہوا ہے —

ساوتری - کیا راز ہے؟ تمھیں کچھ معلوم ہے؟ بتاؤ —

شانتی - تم لوگ تو مذاق اُڑا رہے ہو، سنجیدہ باتوں میں مذاق مجھے نہیں اچھا لگتا.

ساوتری - اچھی شانتی بتاؤ کیا بات ہے - تم سے تو رکمنی سے بڑی اپنائیت ہے اُس نے تو سب دل کا حال تم سے کہا ہوگا - کیا بات ہے بتاؤ —

شانتی - وعدہ کرو کہ سنجیدگی سے سنوگی اور جو کچھ میں کہوں اُسے یقین کروگی - دیکھو وملا نے ابھی سے مسکرانا شروع کیا - میں اُس کے آگے نہیں کہونگی -

وملا - بہن جی! تم تو خفا ہوتی ہو - میں وعدہ کرتی ہوں کہ سنجیدگی سے سنوں گی اور تمھاری بات برابر مانوں گی، کہو کیا بات ہے —

دیوان جے رام دوارکا داس لاہور کے ایک معزز اور متمول خاندان سے تھے - غدر کے زمانے میں پیدا ہوئے اور لڑکپن لاہور ہی میں گزرا - آپ شہر کے اُن چند اصحاب میں سے تھے جنھوں نے انگریزی کی تعلیم سے اس زمانے میں فیض اُٹھایا تھا - کچھ عرصہ پیشۂ وکالت میں صرف کیا، بعد ازاں محکمۂ عدالت میں مختلف عہدوں پر پنجاب کے مختلف اضلاع میں مامور رہے چونکہ آدمی ذہین اور قابل تھے، بہت جلد سشن جج کے عہدے پر سر فراز کئے گئے - آخری زمانہ سشن ججی کا خاص لاہور میں صرف ہوا، چونکہ تندرستی کچھ خراب رہتی تھی اور لاہور کے باہر نہیں جانا چاہتے تھے، کسی قدر قبل از وقت پنشن لے لی - دیوان جے رام دوارکا داس پرانے زمانے کے اُن چیدہ اصحاب میں تھے جن کا نہ صرف دماغ انگریزی تعلیم کی نئی روشنی سے منور تھا، بلکہ جنھوں نے پہلو میں دل اور دل میں درد

ہو پایا تھا ۔ قوم کے تعلیمی اور سوشل معاملات میں نمایاں اور عملی حصہ لیتے رہتے تھے۔ نیشنل کانگرس میں بھی بہ حیثیت تماشائی ضرور جاتے - پنجاب میں سوشل کانفرنس کے روح رواں تھے اور بالخصوص لاھور میں آپ کی بڑی وقعت اور مرتبہ تھا - گزشتہ بارہ سال سے آپ نے لاھور میں ایک بدھوا آشرم اپنے صرف سے قائم کیا تھا ' جس میں ھندو بدھواؤں اور لڑکیوں کی تعلیم کا نہایت معقول اور اعلی پیمانے پر انتظام کیا تھا۔ دس پانچ بدھواؤں کی شادی بھی اُنکی اور اُنکے ماں باپ کی مرضی سے کرادی تھی - علاوہ اس آشرم کے اور بھی کئی درسگاھیں آپ کی فیاضی سے مالامال ھوتی رھتی تہیں - اسی لئے آپ شہر میں ہر دل عزیز تھے اور اپنے صوبے میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔آپ کے راست باز اور فرشتہ سیرت ھونے کا ھر کہ و مہ معتقد تھا- آپ کے دامن شہرت پر کبھی کوئی چھینٹ بھی اُڑ کر نہیں پڑی تھی - اس لئے جب یہ خبر دفعتاً مشہور ھوئی کہ آپ نے آشرم کی ایک نوجوان بیوہ سے شادی کر لی تو نہ صرف آپکی برادری بلکہ تمام شہر میں تہلکہ مچ گیا اور لوگ متحیر رھگئے -

مسٹر بھگت رام سوری کے ڈرائنگ روم میں مسز سوری یعنی شانتی اور اُس کی دو اور سہیلیاں بیٹھی چاے پی رھی تہیں اور اسی حادثے کا چرچا ھو رھا تھا' جسکا ذکر اوپر آچکا ھے - جب وملا اور ساوتری نے شانتی سے افشاے راز پر اصرار کیا تو شانتی نے دونوں سے اس بات کا دھنی وعدہ لیا کہ علاوہ ان دو کے بات اور کسی تیسرے کے کانوں تک نہ پہنچے' اسطرح سے اطمینان کر کے شانتی نے رکمنی کی واردات یوں بیان کرنی شروع کی: —

رکمنی پرانے خیال والے لیکن شریف اور امیر گھرانے کی لڑکی تھی' گیارہ برس کی عمر میں شادی ھوئی' سال بھر بعد وہ لڑکا جو اسکا خاوند ھوتا چند روز بیمار رھکر مر گیا - بچپن کے کھیل تماشے عارضی طور سے طبیعت میں جوش مسرت پیدا کرتے ھیں لیکن اسیقدر جلد یاد سے اتر بھی جاتے ھیں- رکمنی شادی اور موت کے دونوں حادثوں کو بہت جلد بھول گئی اور میکے میں حسب معمول

وهنے سہنے لگی۔ دیوان جھرام دوارکاداس اور رکمنی کے والد میں علاوہ ہم قوم ہونے کے ربط و اتحاد تھا' ان کے کہنے سننے اور سمجھانے سے رکمنی آشرم میں داخل کی گئی اور اسکے درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوا - رکمنی بچپن میں بڑی خوبصورت لڑکی تھی' اب شباب جو آیا تو اسنے اسے اور چار چاند لگادئے - اٹھارھویں سال یہ کلی چٹک کر گلاب کا پھول ہو گئی - طبیعت کے بھولے پن' شباب کی شوخی اور تعلیم وتربیت کی جلا نے اسکو یکتائے روزگار بنا دیا - بچپن کی شادی اور موت کے حادثے کے معنی وہ اب سمجھنے لگی تھی' لیکن اُس کی فطرتی خندہ پیشانی پر ابھی بل نہیں پڑے تھے' چونکہ زمانے کی ٹھوکریں اُس نے ابھی نہیں کھائی تھیں' وہ مایوسی کے خیال سے بیگانہ تھی - اس کے دیکھتے دیکھتے آشرم کی کئی بال بدھوا سکھیوں کی شادی ہو چکی تھی ؛ اس لئے شباب کی امنگوں اور امیدوں سے منہ چھپانے کی مجبوری وہ کبھی محسوس نہ کرتی تھی - دیوان صاحب رکمنی کے والد کو اس کی دوسری شادی کرنے پر رفتہ رفتہ آمادہ کر رہے تھے' گو یہ آمادہ نہ ہوے تھے' لیکن اب اس خیال کی پہلی سی مخالفت بھی نہ کرتے تھے - ان باتوں کی بھنک رکمنی کے کانوں تک بھی پہنچتی رہتی تھی - اسی زمانے میں رکمنی کی آنکھیں جانکی سے چار ہوئیں - جانکی بائیس تیئیس برس کا خوشرو جوان لڑکا تھا - جیسا خوشرو تھا ویسا ہی ذہین' ہوشیار اور تعلیم یافتہ بھی تھا - رکمنی اور جانکی کے گھرانوں میں دوردراز کا رشتہ تھا' اور میل جول ہونے کی وجہ سے آنا جانا بھی تھا - جوانی دیوانی ہوتی ہے اور اس عمر میں محبت کا آزار مہلک ہوتا ہے؛ بالخصوص سیدھی سچی طبیعتیں اس آزار سے جان بر نہیں ہوتیں - چنگاری لگتے ہی شعلے بھڑک اٹھے - عورت جب اپنے محبوب پر دل اور جان فدا کرنے لگتی ہے تو قانون اور رواج کی پابندیاں ڈھیلی ہونے لگتی ہیں اور پھر قدموں کی لغزش کرنے میں دیر نہیں لگتیں - بھولی بھالی رکمنی کو جانکی شادی کی امید اور بھروسا دلاتا تھا اور غالباً اس وقت اس کا وعدہ اور

بھروسا نیک نیتی اور سچائی پر مبنی تھا۔ رکمنی شادی ہو جانے کو یقینی امر سمجھتی تھی، لیکن شوق کی بیتابی اور شدت انتظار رلائے جاتی تھی۔ ضبط و بے تابی کی کشمکش کچھ روز تک تو قابل برداشت رہی، لیکن تابکے۔ بالآخر حیا کا پردہ اٹھ کر آنکھوں پر پڑ گیا اور نتیجہ جو ایسی حالت میں ہوا کرتا ہے ہوا۔

وملا: ہے ہے۔ غضب یہ دیدہ دلیری، ماں باپ کا منہ کالا کرنے سے بھی نہ ڈری—

شانتی: وملا۔ بات ذرا سوچ کر کیا کرو، میں مانتی ہوں کہ اس سے غلطی ہوئی اور بڑی غلطی ہوئی، وہ اپنے کئے کو بھگت رہی ہے اور بری طرح بھوگ رہی ہے، لیکن کون سا انسان ہے جس سے غلطی نہیں ہوتی۔ میری اور تمہاری گود بھری ہے۔ جیتے رہیں دو دو تین تین بچے سامنے کھیل رہے ہیں۔ تمہارا سہاگ ہمیشہ قائم رہے، زندگی کی مسرتوں اور آرزوؤں کا دروازہ کھلا ہوا ہے، کسی بات کی کوئی کمی نہیں۔ شادی کے وقت تم پندرہ اور میں سولہ برس کی تھی۔ کون جانتا ہے کہ میں اور تم اگر اس حالت میں ہوتے، جس میں وہ تھی اور جو صورتیں اس کو پیش آئیں، اگر ہم کو پیش آتیں تو ہمارے قدم کہاں تک ثابت رہتے۔ بڑا بول نہیں بولنا چاہئے۔ اس کی حالت قابل نفرین نہیں، قابل رحم اور قابل ہمدردی ہے—

ساوتری: بہن جی! تم بات کو پورا کرو، اس کو تو بیچ میں بولنے کا مرض ہے۔ ہاں پھر کیا ہوا؟

شانتی: جو کچھ ہوا برا ہوا۔ مہینہ بیس روز تو خمار عیش باقی رہا، لیکن جب رکمنی کو حمل کے آثار ظاہر ہوئے تو نشہ ہرن ہونے لگا۔ اس پر طرہ یہ کہ جانکی بزدلی اور بے حیائی سے بغلیں جھانکنے لگا اور چند روز بعد ہی اس نے آنا جانا بھی ترک کر دیا۔ ایک روز دفعتاً رکمنی نے سنا کہ جانکی بیرسٹری کا امتحان دینے کی غرض سے ولایت روانہ ہو گیا۔ دل تو

پہلے ہی سے لرز رہا تھا۔ یہ سنتے ہی ہوش و حواس بالکل جاتے رہے۔ ننھی سی جان بے یار و مددگار، بات منہ سے نکالنے کی نہیں، اندر ہی اندر گھلنے لگی، جب کرتے دھرتے کچھ بنتا نہ دکھائی دیا اور زندگی اجیرن معلوم ہونے لگی تو افیون کھا کر سو رہنے کی ٹھانی۔ اس زمانے میں رکمنی آشرم میں ہی رہتی تھی۔ آشرم کی مہری کو کچھ دے کر اسے افیون لانے بھیجا، وہ بیوقوف تھی، لیڈی سپرنٹنڈنٹ نے اسے افیون لےجاتے پکڑا، راز کھل گیا۔ دیوان صاحب کو اطلاع ہوئی، معاملہ سنگین معلوم ہوا۔ انہوں نے اپنی بیوی سیتا دیوی سے جو آشرم کے کاروبار میں ان کا بہت کچھ ہاتھ بٹاتی تھی، مشورہ کر کے انہیں رکمنی کے پاس بھیجا کہ پتہ چلائیں کیا معاملہ ہے۔ رکمنی پہلے تو پہلو تہی کیا کی بالآخر بہت کچھ سمجھانے بجھانے سے اس نے تمام کیفیت رو رو کر بیان کی۔ سیتا دیوی نے جن کو اس کے ساتھ بہت محبت تھی، اس کی تسلی اور تشفی کی، جو کچھ ماں کرتی اس سے زیادہ کرنے کا یقین دلایا اور واپس ہو کر سارا کچا چٹھا دیوان صاحب کے گوش گذار کیا۔ دیوان صاحب عجب مخمصے میں پڑے، پریشان ہوئے۔ لڑکی کے باپ سے سب حال کہا، وہ پرانے خیال کے آدمی، سنتے ہی چراغ پا ہو گئے، اپنا منہ پیٹ لیا، دیوان صاحب کو بھی لعنت ملامت کی اور تمام ذمہ داری آشرم کی تعلیم و تربیت پر ڈالی۔ اپنی ماں ہوتی تو چاہے جو کچھ ہوا تھا، لڑکی کے کام آتی اور سہولت کی سبیل سوچتی۔ سوتیلی ماں تھی اسے صرف بدنامی کا خیال تھا، اس نے شوہر کے اور کان بھرے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ماں باپ دونوں نے لڑکی سے قطع تعلق کرنے اور اسے تن بہ تقدیر چھوڑنے کا فیصلہ کر کے دیوان صاحب کے سر منڈھا کہ تمہارا ہی سب کچھ کیا ہوا ہے، اب جو چاہو کرو، ہم سے کچھ واسطہ نہیں —

دیوان صاحب نے ان کے یہاں سے واپس ہو کر یہ سب گفتگو سیتا دیوی کو سنائی اور پوچھنے لگے کہ اب کیا کیا جائے :

سیتا دیوی : کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ماں باپ ڈھنگ کے ہوتے تو سو ترکیبیں ہو سکتی تھیں، لڑکی کو کچھ دنوں کے لئے یہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ بچہ ہو جانے پر اس کی غور و پرداخت کا بھی کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جاتا۔ لیکن یہ تو اسطرح سے الگ ہو کر دور بھاگے کہ گویا کوئی واسطہ ہی نہیں —

دیوان صاحب: یہی تو مصیبت ہے۔ میرا خیال نہ تھا کہ یہ ایسی خود غرضی اور نالائقی سے کام لیں گے۔ اب اگر کوئی دوسرا اس معاملے میں ہاتھ ڈالے بھی تو کس برتے پر۔ بات بالکل چھپی تو رہیگی نہیں، جو اس میں دخل دیگا، اسی کی روسیاہی ہوگی اور لوگ طرح طرح کی باتیں بنائینگے۔

سیتا دیوی : پھر حال جو کچھ بھی ہو، دیدہ و دانستہ تو لڑکی کو افیم کھاکر سونے دونگی نہیں، نیک نامی ہو یا بد نامی —

دیوان صاحب: تو تم نے کیا سوچا ہے —

سیتا دیوی : میں ارادہ کر چکی اور اس سے کہہ چکی ہوں کہ ساتھ لے جا کر اپنے گھر رکھوں گی —

دیوان صاحب: دنیا مجھکو اور تم کو کیا کہیگی۔ یہ بھی تو سوچ لو —

سیتا دیوی : تو تم لڑکی کو سڑک پر نکال باہر کرنے کے لئے تیار ہو ؟

دیوان صاحب: یہ کیسے ہو سکتا ہے —

سیتا دیوی : تو پھر اس کے علاوہ اور کیا چارہ ہے —

دیوان صاحب: یہ بھی سہی، پھر بھی تو گمنام باپ کے بچے کی پرورش اور زندگی ماں اور بچے دونوں کے لئے سوہان روح ہو گی۔ ہماری سوسائٹی میں ایسے بچے اور ماں کے لئے کہیں گنجایش ہے ؟

سیتا دیوی: یہ ٹھیک ہے ۔ میں تو تین روز سے اسی اُدھیڑ بن میں دن رات لگی ہوئی ہوں، کوئی ڈھنگ کی بات سمجھ میں نہیں آتی - ایک بات سوجھی ہے، پر کہتے ہوئے جھجکتی ہوں کہ تم کہیں خفا نہ ہو -

دیوان صاحب: خفا کیوں ہوں گا ۔

سیتا دیوی: خفا ہونے کی کوئی بات تو نہیں، بشرطیکہ سمجھ میں آ جائے -

دیوان صاحب: کہو —

سیتا دیوی: بچہ گمنام باپ کا کیوں رہے، اگر تم اس کے باپ بننے کی قانونی ذمہ داری لے لو تو یہ دشواری بھی حل ہو سکتی ہے —

دیوان صاحب: (چونکر) کیا معنی ؟ —

سیتا دیوی: معنی بالکل صاف ہیں ۔ دو جانوں کے ضائع ہونے اور دو زندگیوں کے سنورنے کا سوال ہے ۔ بڑی ہمت کا کام ہے لیکن تمہارے سے ہمت والے آدمی سے بعید نہیں —

دیوان صاحب: تمہاری تجویز یہ ہے ....

سیتا دیوی: کہ تم رکمنی کو عقد میں لے آؤ - آنندبواہ کے طریق سے یہ شادی ہوسکتی ہے - تم دو جانوں کو ضائع ہونے سے بچا سکتے ہو اور دو زندگیاں ٹھکانے لگا سکتے ہو -

دیوان صاحب: (سوچ کر) ہاں یہ ہوسکتا ہے، لیکن لوگ مجھے کیا کہینگے اور میں لوگوں کو کس طرح منہ دکھاؤنگا —

سیتا دیوی: تم نے تو روز اول سے اس کی پروا کی نہیں، آج لوگ تمہیں بھلا کہتے ہیں، جب آشرم کھولا گیا، لوگوں نے مطعون کرنے میں کوئی کسر اُٹھا رکھی تھی ؟ پر تم نے پروا نہ کی —

دیوان صاحب: آشرم کا کیا حشر ہوگا، سوشل رفارم کی تحریک کیسی بدنام ہوگی —

سیتا دیوی: میرے سامنے ان دلیلوں کی کوئی وقعت نہیں، جب تم نہیں ہوگے آشرم کیسے چلے گا، اگر تم ہمت کرنے کو تیار ہو تو

میری نگاہ میں اس سے بڑا اور اس سے زیادہ پراُوپکار کا کام اور دوسرا نہیں ہو سکتا ۔

دیوان صاحب: (سوچ کر) سوچوں گا ۔ کل تک کی مہلت دو۔ دیوان چھرام دوارکاداس بڑے دل گُردے کے آدمی تھے، ان کی نگاہیں ہمیشہ اُونچی رہتی تھیں، ہمت اور ایثار اب اُن کی طبیعت کا جوہر ہو گیا تھا ۔ ان کی ذات اب لوگوں کی تعریف و تحسین سے مستغنی تھی ۔ انھوں نے چوبیس گھنٹے معاملے کے سب پہلوؤں پر غور کیا، پھر خوش خوش اپنی بیوی کے کمرے میں گئے، اُن کی آنکھیں جوشِ مسرت سے نمناک تھیں، بیوی کی پیشانی پر بوسہ دے کر بولے: "تم نے جو کچھ کہا مجھے منظور ہے، اگر اس وقت میں اپنے فرضِ انسانی کے ادا کرنے کی ہمت کر رہا ہوں تو یہ ہمت تمہاری دی ہوئی ہے اور تمہارے ہی بوسوں کا صدقہ ہے، مرتے دم تک مجھے اس بات پر ناز رہیگا کہ میری سی بیوی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی ہوگی، جاؤ اب رکمنی کو معاملہ کی تمام صورت سمجھا کر راضی کرو"—

ایک مہینہ ہوا کہ شادی ہو گئی، رکمنی قانون اور قوم کی نگاہ میں دیوان چھرام دوارکا داس کی نئی نویلی دلہن ہے لیکن خود اُن کی اور سیتا دیوی کی نگاہ میں اُن کی پوتی اور نواسی کی حیثیت رکھتی ہے، قوم کے آگے اُسکی نگاہیں نیچی نہیں ہوتیں، اپنے پیدا ہونے والے بچے کو اب چھاتی سے لگانے میں اُسے شرم کرنے کی کوئی وجہ نہ ہوگی، لیکن شباب کے اُن اُمنگوں اور ارمانوں کی طرف جنہیں اُس نے اب ہمیشہ کے لئے دفنا دیا ہے، جب کبھی اُس کا خیال آجاتا ہے، تو دل میں ایک ٹیس اٹھتی ہے، جس کا صرف ایک سرد آہ سے پتہ چلتا ہے اور بس ۔ دیوان چھرام دوارکاداس کا لوگ اپنی اپنی صحبتوں میں طرح طرح سے مذاق اُڑاتے ہیں اور بری طرح مطعون کرتے ہیں ۔ اُن کے کانوں تک بھی یہ چرچے پہنچتے ہیں، لیکن اس مردِ خدا کی

پیشانی پر لمحہ بھر کے لئے بھی بل نہیں پڑتا —

ساوتری : شانتی بہن تم تو یہ واقعات بیان کررھی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا میں کوئی افسانہ سن رہی ہوں اگر یہ واقعات تمہاری زبان سے نہ سنے ہوتے تو میں ان کو ہرگز یقین کرنے کے لئے تیار نہ ہوتی —

شانتی : ساوتری ! بعض واقعات زندگی افسانے سے بھی عجیب تر ہوتے ھیں دیکھو انسان بھی کیا طرفہ تماشا ھے کوئی ذلیل سے ذلیل ایسی حرکت نہیں جو اس سے سرزد نہ ہوتی ہو اسی کے ساتھ یہ بھی انسان ھی کا جوہر ھے کہ ایسے ایثار اور حوصلے کی ہمت کرسکتا ھے کہ فرشتے بھی اس کے دامن پر نماز پڑھیں —

سسي پنوں

از

(جناب نور الہي و محمد عمر صاحبان)

یوں تو سسی پنوں کی داستان عشق کئی زبانوں میں سنی جاتی ہے۔ مگر پنجاب اور سندھ سے اسے خاص تعلق ہے - جہاں اس کے قبول عام کا یہ عالم ہے کہ بچے سے لے کر بوڑھے تک اس پر سر دھنتے ہیں - سندھ اس تریجڈی کا محل وقوع ہے - وہاں اسے مذہبی تقدس حاصل ہونا کوئی بات نہیں، مگر پنجاب میں اسے جو حسن قبول ملا وہ حیرت انگیز ہے - افسانے کی جزئیات میں پنجاب اور سندھ کو اختلاف ہے - اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی اور سندھی روایتوں کو الگ الگ بیان کریں --

---

پنجاب

پنجابی بولی میں جو قصے عوام الناس کے دل بہلانے کے لئے نظم میں بیان کئے گئے، ان میں بلحاظ چند خصوصیات سسی پنوں کو درجۂ امتیاز حاصل ہے - اس کے علاوہ پنجابی میں ہیر رانجھا، سوهني مهینوال، سیف الملوک اور شاہ بہرام کے قصے مشہور ہیں - ہیر رانجھا کی کہانی کو وارث شاہ اور فضل شاہ دو شاعروں نے آسمان پر پہنچا دیا - مگر لاہورا سنگھ اور مقبول کی تصنیفات بہت ادنیٰ درجہ کی کاوشیں ہیں - یہ قصہ صرف پنجابی بولی میں ہے اور اس کی قبولیت صرف پنجاب

تک محدود رہی - ہندوستان کے دیگر صوبوں میں اس کا بہت کم چرچا ہوا -
رسالۂ مخزن کے دور اول میں اس قصے کو "ہندوستان پسند" بنانے کی کوشش کی گئی،
لیکن یہ مساعی بار ور نہ ہوئیں - اس سے قبل دہلی اور لکھنو میں جو اس وقت
پاے تخت ہونے کے باعث علم و فضل کے مرکز تھے، ثقات اس قصے کو مبتذل اور
عامیانہ مذاق کی چیز خیال کرتے رہے اور شاید اسی کی بدولت پنجابی ذہنیت ان
مقامات میں چنداں رفعت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی تھی - چنانچہ دہلی اور
لکھنو کے دو نامور شاعروں کے دو شعر اس حقیقت پر بلا واسطہ روشنی
ڈالتے ہیں :-

(انشاء) سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

(بحر) سن کے میری سرگذشت احباب یہ کہنے لگے :
'بحر' کا قصہ بھی افسانہ ہے رانجھے ہیر کا

قصہ مختصر شعراے فارسی و اُردو نے اس قصے کی طرف بنظر التفات نہیں
دیکھا - ورنہ ایک خوبصورت دلفریب مثنوی آسانی سے تیار ہوجاتی - دیگر
قصص مذکور صرف "صوبیانہ"* شہرت رکھتے ہیں اور پنجاب سے باہر شاید ہی کسی
نے ان کا نام سنا ہو - یہ کہنا صحیح نہیں کہ دارالخلافے والے پنجابی سے نا آشنا
تھے اس لئے وہ اس سے حلاوت اندوز نہ ہوسکے - انشا کے چند پنجابی شعروں کو گو
آپ صرف ظرافت خیال کریں، پھر بھی اس بات پر تو دلالت کرتے ہیں کہ سید انشا
پنجابی سے نا واقف نہ تھے اور سودا کے کلیات میں تو پنجابی زبان میں مرثیہ
موجود ہے - دور کی باتیں جانے دیجئے، خود پنجاب میں فارسی شعرا کا قحط نہ
تھا - در اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات نے ان قصوں کو در خور اعتنا خیال

---

* Provincialism کا ترجمہ "صوبیت" مقبول ہوچکا ہے، اس لئے Provincial کا
ترجمہ "صوبیانہ" وضع کیا جاتا ہے —

نہ کیا - اب سسی پنوں کے قصے کو لیجئے تو فارسی' اُردو' سندھی' پشتو اور پنجابی میں اس پر کئی کتابیں ملیں گی —

میر محمد بھکری نے اس قصے کو اپنی مثنوی "حسن و ناز" میں موزوں کیا۔ اس کے بعد محمد شاہ کے عہد میں قاضی مرتضیٰ سورتی نے اس کی بنیادوں پر ایک مثنوی "شہید ناز" کا قصر بلند کیا - اس کہانی کو مولانا شرر مرحوم نے اپنے رسالے میں بڑی نوک پلک سے شائع کیا - متداولہ کتب کی رو سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ پنجابی میں سب سے پہلے حافظ رانجھا برخوردار نے سنہ ۱۱۷۹ ھ میں اس قصے کو کتاب کی صورت میں پیش کیا - یہ نسخہ نا پید تھا اور اس کا ایک محرف ایڈیشن حافظ برخوردار کے نام سے منسوب ہوا - آخر مولوی احمدالدین نامی حافظ صاحب کے ایک عزیز نے اصلی نسخہ نکالا' جو سنہ ۱۳۲۲ ھ میں اندر پریس سیالکوٹ میں شائع ہوا - اس کے بعد ہاشم کی مقبول عام نظم عالم ظہور میں آئی - لیکن اس کی تاریخ تصنیف کا پتہ نہیں ملتا - چوہدری شہباز سیالکوٹی نے سنہ ۱۲۵۰ ھ میں ہاشم کی روایت کے مطابق "وقائع پنوں" پر تکلف زبان اور رعایت لفظی میں ڈوب کر فارسی میں منظوم کیا - اس کے ایک شعر سے پایا جاتا ہے کہ بوقت تحریر ہاشم اور برخوردار کی تصنیفات اس کے سامنے تھیں :

زمین پیش بسے شعرا گفتہ ایں قصہ بہ پنجابی زباں
چوں حافظ رانجھا ہاشم هم برجستہ سخن جو بستہ میاں

یہاں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ وقائع پنوں میں پنوں کے بیہوش ہوجانے کے بعد کا حال منشی محمد حسین کے قلم کا مرہون منت ہے - یعنی اس کی تکمیل میں دو شاعروں کا حصہ ہے - اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم کا قصہ سنہ ۱۲۵۰ ھ سے قبل موجود تھا - پھر مولوی غلام رسول کی کتاب سنہ ۱۲۹۴ ھ میں تصنیف ہوئی' اور سنہ ۱۲۸۰ ھ میں فضل شاہ نے داد سخن دی - آخر میں میاں محمد بوٹا گجراتی نے اس قصے کو سنہ ۱۳۲۰ ھ میں نظم کیا -

برخوردار کے قصے کی کتھا سیدھی سادھی، الجھاؤ سے پاک اور تصنع سے معرا ہے اور یہی بات اسے فخر تقدم کا مستحق قرار دیتی ہے۔ ہاشم نے چند باتیں اضافہ کر کے داستان کو زیادہ حیرت انگیز اور عوام کے مذاق کی چیز بنا دیا ہے۔ غلام رسول نے ہاشم کے پلاٹ کا رنگ اور چوکھا کر دیا ہے۔ اور زبان ایسی لکھی کہ اردو کے بہت قریب پہنچ گئی۔ پنجاب کے حلقۂ مشائخ و صوفیا میں یہ کتاب وجدان پیدا کرتی ہے اور اس سے بہت سے رموز تصوف وابستہ کئے جاتے ہیں * فضلشاہ نے اتنی سی بات کو ایک ضخیم فسانہ کر دیا ہے۔ موعظت کا پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ انیس الواعظین سے التباس پیدا ہوتا ہے۔ رعایت لفظی کا اس قدر التزام ہے کہ شہباز بھی ماند ہوگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امانت، نسیم، بحر اور رشک کی ارواح عالم امکان میں آنے سے پہلے فضلشاہ کے کالبد میں جمع ہوگئی تھیں۔ بوٹا کی کاوش محض لہو لگا کے شہیدوں میں شامل ہونا ہے، فضلشاہ کی صدائے بازگشت ہے۔ کوئی جدت یا ندرت اس میں نہیں پائی جاتی —

پنجاب میں اس قصے کے باوا آدم حافظ برخوردار ہیں۔ نام رانجھا، تخلص برخوردار، حافظ قرآن تھے۔ حافظ ہی تخلص کرتے تھے، وطن مالوف ہزارہ ہے۔ جوان ہو کر وہاں سے نکلے اور لاہور آ کر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ لیکن اس زمانے تک سیالکوٹ مرکز علم و فنون تھا، جس کی خاک سے سعداللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں، تفضل حسین خاں مدار المہام اودھ اور مولانا عبدالحکیم جیسے باکمال پیدا ہوئے۔ اس لئے سیالکوٹ کا رخ کیا۔ اور وہاں ایسے آئے کہ پھر جانے کا نام نہ لیا۔ یہیں کسی اچھے گھرانے میں شادی ہو گئی اور بال بچوں کی محبت پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ اب درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، جس کے دوران میں

---

* یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے امتحان، پنجابی کے نصاب میں داخل ہے —

قصہ سسی و پنوں تصنیف ہو کر حیات جاوداں کا موجب بنا -

بر خوردار بعد مختصر حمد و ثنا کے قصے کو یوں بیان فرماتے ہیں :

شہر بھنبھور کا راجہ آدم جام بڑی شان سے حکومت کرتا تھا - کوئی چیز نہ تھی جو اُسے میسر نہ ہو، لیکن اولاد سے محروم تھا - آخر رانی کے آثار حمل نمودار ہوے - اور راجہ نے جوتشیوں کو بلا کر جنین کی قسمت کا حال پوچھا - انھوں نے زائچہ دیکھ کر کہا کہ رانی کے بطن میں جو لڑکی ہے اس پر ہزاروں مصیبتیں پڑینگی - کسی مسلمان کے ساتھ آنکھ ملا کر اڑھ جائیگی - اور ریگستان میں محبت کی بھینٹ چڑھیگی - لاج اور راج کی سلامتی اس میں ہے - کہ پیدا ہوتے ہی اسے یا تو دریا میں بہا دیں ، زہر دیدیں، یا گلے میں رسی باندھ کر لٹکا دیں - لیکن انھیں معلوم نہ تھا کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے - یہ سنکر راجہ بہت دلگیر ہوا اور رانی بھی کانپنے لگی - جب لڑکی یعنی سسی پیدا ہوئی تو رانی اس کا حسن دیکھ کر حیران رہگئی - آخر یہ فیصلہ ہوا کہ اس مانک موتی کو دریا کے نذر کیا جاے ، اسے صندل کے صندوق میں ڈالا اور اس میں تین حصے زرو جواہر کے رکھ دیے، ایک حصہ اس کی پرورش کے لئے، دوسرا تعلیم اور تیسرا شادی کے اخراجات کے لئے - لڑکی کا حسب و نسب اور اخراجات کی تفصیل ایک کاغذ پر لکھ کر اس کے گلے میں بطور تعویذ کے باندھ دیا - یہ انتظام کر کے صندوق کو منجھدھار میں ڈالا - آخر حضرت خضر کی رہنمائی سے یہ صندوق اس مقام پر پہنچا ، جہاں آتا نامی دھوبی کپڑے دھورہا تھا - دھوبی نے صندوق کو پکڑ لیا - گھر لے جاکر عورتوں میں کھولا تو ایک جیتی جاگتی پیاری پیاری لڑکی کے ساتھ زرو جواہر کا ڈھیر نکلا - انھیں تو صندوق میں ڈالکر اندر رکھا اور لڑکی کی پرورش میں مصروف ہو گئے - جب سسی نے لڑکپن کے کوچے میں قدم رکھا تو اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا - اس کے حسن کا چرچا ہونے لگا - دھوبیوں کے ہاں سے پیغام آنے لگے اور کپڑے دھونے میں کمال کو انھوں نے ذریعۂ کامیابی بنایا - مگر آتا ٹالتا رہا -

ایک شب کو سسی جوانی کی نیند کے مزے لے رہی تھی کہ اس نے خواب میں ایک شکیل وجمیل جوان رعنا دیکھا اور اسے دیکھتے ہی دل ہاتھ سے جا تا رہا ۔ دوسری بار پھر ایسا ہی اتفاق ہوا ۔ تیسری بار خواب میں آیا تو اس نے بتایا کہ وہ کیچ شہر کا شہزادہ ہے اور اس کا نام پنوں ہے ۔ سسی اُٹھی تو برسوں کی بیمار معلوم ہوتی تھی ۔ چہرہ زرد ، لب پر آہ سرد ، نہ کھانا نہ پینا ، گھنٹوں الگ چھپکے بیٹھے رہنا ۔ یہ حالت دیکھ کر سسی کی ماں یعنی دھوبی کی بیوی نے خیال کیا کہ جوان لڑکی شادی کے لئے کڑھ رہی ہے ۔ اس لئے اسے تسلی دینے کی غرض سے کہا کہ بیٹی غم نہ کر، جلدی کوئی اچھا سا دھوبی ڈھونڈھ کر تیری شادی کئے دیتی ہوں ۔ سسی نے کہا کہ راجوں مہاراجوں پر بھی کڑے وقت آیا کرتے ہیں، لیکن وہ رذیل اور اجلاف کے ساتھ شادی نہیں کیا کرتے ۔ دیکھنا سفید چادر میں داغ نہ لگا دینا ، جو مٹائے نہ مٹے ۔ جب تخت پر کوئی جوتی سیہت چڑھتا ہے تو عرش میں زلزلہ آجاتا ہے ۔ ماں نے کہا : اری تو جوان ہو کر کیا باتیں بنارہی ہے۔ ابھی کل کی بات ہےکہ تجھے کھانے تک کی تمیز نہ تھی اور اب‌تو راجاوں کے نسب نامے کھول کر بیٹھ‌گئی راجاؤں وزیروں‌کے رنگ محل‌کبھی دیکھے بھی ہیں۔ سسی‌نے کہا: مجھےکیا پڑی ہے جوراجاؤں اور وزیروں‌کے گھروں میں جھانکتی پھروں۔ آنکھیں وہ مانگتے ہیں جو بینائی سے محروم ہوں ۔ جواہرات اپنی جگہ پر آپ پہنچ جاتے ہیں ' انہیں اپنے لائق مقام تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی ۔ رذائل کے سر پر چتر شاہی زیب نہیں دیتا ۔ بلبل و بوم کا رشتہ نہیں ہوا کرتا ۔ اس دانتا کلکل کے بعد سسی خیال یار میں مگن ہو گئی اور عملی طور پر اسے گرد و پیش کے حالات سے کوئی علاقہ نہ رہا – تھوڑے دنوں بعد وہ زندگی سے مایوس سی ہوگئی اور صرف اس آرزو سے بر آنے کے خیال سے دل بہلاتی رہی کہ شاید دم واپسی پنوں کی شکل دیکھ لے—

ایک دن سسی کپڑے لے کر راجہ کے محل میں گئی تو راجا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا - راجا نے سسی کو ایک نو لکھا باغ عنایت کیا اور گھاٹوں کا محصول اسے بطور مقرری بخشا - سچ ہے ' جب خدا دینے پر آتا ہے تو اسباب آپ سے آپ پیدا ہوجاتے ہیں - ساون کے مہینے میں چمن خود بخود رونق پر آجاتے ہیں - سسی نے تمام گھاٹوں پر اپنے آدمی بٹھادئے اور حکم دیا کہ جو کوئی دریا عبور کرے پہلے اپنی جنم بھوم درج کرائے - پھر سسی نے اس نولکھے باغ میں رنگ محل تعمیر کرایا ' گویا بہار کے اندر ایک دوسری بہار پیدا ہو گئی ، مگر سوز فراق میں کوئی کمی نہ ہوئی اور آنسو بہاتے بہاتے اس کی آنکھیں سوجھ گئیں —

اس عرصے میں ایک دن شہر کیچ سے ایک قافلہ آیا' جس کے ساتھ کئی اونٹ مشک کے تھے - وہ مختلف رنگوں کے کپڑے پہنے ہوے تھے - حسن و جوانی میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا - کثرت خوشبو سے جنگل تا تار بن گیا - گویا قدرت پنوں کے خیر مقدم کی تیاری کر رہی تھی - اس قافلے کے سالار بہن اور بیبا نامی دو شخص تھے - سسی کو جب معلوم ہوا کہ وہ شہر کیچ سے آ رہے ہیں تو اس نے ان قافلہ کے سالاروں کو اپنے پاس بلایا - اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد سسی نے کہا کہ کسی طرح پنوں کو یہاں بلاؤ - اس یوسف نے مجھے زلیخا کی طرح دیوانہ بنا رکھا ہے - اُنہوں نے بہت عذر اور منت کی مگر سسی نے ایک نہ مانی - آخر صلاح و مشورہ کے بعد بہن شہر کیچ کو روانہ ہوا ' جب وہاں پہنچا تو دربار میں جاکر فریاد کی کہ پنوں کے لئے سسی نے ہمیں باندھ رکھا ہے - وہ وہاں جاے تو ہمیں آزادی ملے عالی خاں فرما رواے کیچ یہ قصہ سن کر حیران ہوا - پنوں نے جب ساری داستان سنی اور اُسے سسی کے حسن و جمال کا حال معلوم ہوا تو وہ بھمبور جانے پر تیار ہو گیا - عالی خاں اور اس کی بیگم نے لاکھ منع کیا لیکن وہ سنی ان سنی کر کے روانہ ہو ہی پڑا : جب یہ خبر عام ہوئی تو شہر میں کہرام مچ گیا - بیگم کی فرط غم سے بھوک پیاس بند ہوگئی - عالی خاں یعقوب وار اپنے یوسف کے لئے دھاڑیں

مار مار کر رویا، لیکن سب بیکار - پنوں پر خاک اثر نہ ہوا - بھلا جب حضرت عشق ڈیرے ڈالیں تو عقل و شعور وہاں کیسے ٹھہر سکتے ہیں - اونٹوں پر محمل رکھے گئے اور وہ ہوا کی طرح اڑنے لگے —

یہ قافلہ ریگستان کو طے کر کے شہر بھمبور میں پہنچا اور نولکھے باغ میں جا اُترا - صحرانورد اونٹوں نے مہینوں سے گھاس کا تنکا نہ دیکھا تھا ، سرسبز اور شاداب باغ کو دیکھ کر اُن کے منہ میں پانی بھر آیا، انہوں نے خوب ہاتھ صاف کئے اور تھوڑی دیر میں باغ کو برگ و بار سے سبکبار کر دیا - باغبانوں نے جا کر فریاد کی تو سسی سہیلیوں کے دل بادل جھرمٹ سے بجلی کی طرح چمک کر اٹھی اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ برق بلا عاشق تنوں کے خرمن حیات کو جلا کر خاک کر دے گی - لیکن پنوں کو دیکھا تو قہر و غضب کے بادل چھٹ گئے اور وہ بھولی بھالی سہانی- پھر حکم دیا کہ پنوں رہے اور باقی سب لوگ کیچ واپس چلے جائیں - پنوں نے ماں باپ کے نام پیغام دئے اور اُنہیں الوداع کہکر سسی کے پہلو میں جابیٹھا۔ اب سسی نے پنوں سے کہا کہ گو میں راجا کی بیٹی ہوں مگر دیکھنے کو میرے والدین دھوبی ہیں اور بغیر دھوبی کے وہ کسی سے میری شادی پر رضا مند نہ ہوں گے - اس لئے تم تھوڑی دیر کے لیے دھوبی بن جاؤ - پنوں نے بقول ''رشتۂ در گردنم افگندہ دوست''- دھوبیوں کا بانا پہنا اور سسی کے ساتھ گھاٹ پر گیا - سسی نے ماں کو تو دو چار باتوں میں راضی کر لیا لیکن دھوبی نے اپنی تسلی کے لئے پنوں کا امتحان لینا چاہا کہ وہ دھوبیوں کے کام میں کس قدر ماہر ہے - اللہ کو اس کی عزت رکھنی منظور تھی، پنوں نے اللہ کی طرح کپڑے اُجلے کر دکھائے - یہ سب حضرت عشق کے کھیل ہیں ، انہیں کے طفیل صنماں نے سور چرائے ، یہ شہزادہ ذرا دھوبی بن گیا تو کیا ہوا - اب اتا دھوبی نے بڑے پیمانے پر دعوت کی اور سسی کا نکاح پنوں کے ساتھ کر دیا - اور اچھا جہیز دے کر رخصت کیا - سسی پنوں فلک بے مہر کی چالوں سے بے پروا ہو کر چین کی زندگی بسر کرنے لگے —

اب اُدھر کا حال سنیے بہن اور بیبا روتے پیٹتے کیچ شہر میں پہنچے تو عالی خاں کو ساری واردات سنائی - اس کے ہوش اُڑ گئے اور بیگم پچھاڑیں کھانے لگی - آخر وہ بہن پر برس پڑا اور اُس کی بری گت بنائی اور پنوں کے تینوں بھائیوں کو حکم دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، جاکر پنوں کو لے آؤ- یہ تینوں شہزادے بڑے کار آزمودہ اور ریگستان کی راہوں سے خوب آگاہ تھے اور جلد بھنبور پہنچ گئے پنوں سے ملے گھر کا حال بیان کرکے پند و نصیحت کا دفتر کھولا - مگر پنوں نے کچھ قبول نہ کیا - جس کے دل و دماغ کا محافظ عشق ہو، وہ کسی کے فریب میں کس طرح آسکتا ہے - اب پنوں کے بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ سیدھی اُنگلیوں گھی نہیں نکلتا، پنوں کو بیہوش کرکے عالم بے خبری میں نکال لے جائیں - وہ پنوں کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ ہم صبح وطن جائیں گے، پھر خدا جانے کب مل بیٹھنا نصیب ہو، اس لئے آئیے ذرا جام و صراحی سے دل بہلائیں- چنانچہ سسی کی شرکت سے بزم عشرت منعقد ہوی اور مئے ارغوانی کا پیالہ گردش میں آیا - جب سسی اور پنوں دونوں مدہوش ہوگئے تو اُنھوں نے پنوں کو محمل میں ڈالا اور روانہ ہوگئے—

صبح کو سسی جاگی تو آغوش خالی دیکھ کر اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑگئے، دیوانہ وار چاروں طرف ڈھونڈھنے لگی - باغ کا کونہ کونہ چھان مارا، کوئیں میں بانس ڈالے مگر کچھ پتا نہ چلا - آخر بھانپ گئی کہ یہ کیچ والوں کی شرارت ہے - اور وہ اُسے جُل دیکر پنوں کو لے اُڑے ہیں- ماں اور سہیلیوں نے بہت سرمارا مگر سسی نے ایک نہ سنی، پنوں کی تلاش میں تن تنہا نکل کھڑی ہوئی اور ریگستان میں تنکے چننے لگی- پاؤں میں چھالے پڑگئے، چلنے کی سکت نہ رہی، پیاس کے مارے ہونٹ خشک ہوگئے- سسی کی حالت ایسی دردناک تھی کہ وحوش و طیور اُس پر رحم کھاتے تھے اس بیابان میں اُسے ایک گڈریا دکھائی دیا - اور وہ گرتی پڑتی اس کے پاس پہنچی- وہ حیران ہوگیا کہ یہ ماہ پارہ شہزادی یہاں کس طرح آگئی - آخر کار اس نے حال پوچھا تو سسی نے اپنی رام کہانی کہہ سنائی - گڈریے نے کہا: بی بی تین دن

ہوے ایک قافلہ یہاں سے گذرا، جو اونٹوں کو بگ ٹٹ دوڑائے جاتا تھا۔ ایک محمل میں ایک شخص پڑا اُونگ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نشے میں ہے، اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، مگر اُسے سر پیر کی خبر نہ تھی۔ وہ اب سیلکڑوں کوس نکل گئے ہونگے، تو پا پیادہ اُنھیں قیامت تک نہیں پاسکتی۔ میرا کہا مان واپس ہوجا۔ ناحق جان پر نہ کھیل۔ سسی نے کہا: بھائی تو دل کی لگی کیا جانے، محبت سے منہ موڑنا اپنا شیوہ نہیں۔ جان جاتی رہے تو جائے، مگر تلاش چھوڑدوں یہ محال ہے۔ گڈریا اپنا فرض ادا کرکے چلاگیا اور سسی وہیں تڑپتی رہگئی —

دوسرے دن گڈریا پھر وہاں آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس حوروش کی بجاے ایک لاش پڑی ہے۔ ادھر جو پنوں کا نشہ اُترا اور صورت حال معلوم ہوئی تو وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اُس نے بھائیوں کو بہت ڈانٹا اور اونٹ کی مہار موڑکر بھمبور کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے اس مقام پر پہنچا جہاں گڈریے نے سسی کی قبر بنائی تھی تو وہ ٹھیرگیا اور گڈریے سے پوچھا یہ کس کی قبر ہے جس کی مٹی سے مجھے کسی کی خوشبو آرہی ہے۔ گڈریے نے کہا؛ ایک خوبصورت عورت تھی، نام اُس کا سسی تھا، پنوں پنوں پکارتی تھی، میں نے اُسے بہت کہا کہ آبادی میں چل کر آرام کرے، مگراُس نے قدم تک نہ اٹھایا۔ یہ سنکرپنوں غش کھاکر گرا، قبر پھٹ گئی اور پنوں اُس میں جاگرا اور یہ محبت کے پتلے ایک دوسرے سے مل گئے —

اس خاکے میں 'ہاشم' نے رنگ آمیزی کرکے اسے اور شوخ کردیا ہے۔ اس کے کلام میں شاعرانہ تکلف زیادہ ہے مگر 'برخوردار' کے بے ساختہ اور بلا تکلف اشعار کا لطف کہاں۔ پلاٹ میں دو ایک جگہ تصرت کرکے قصے کو طویل اور زیادہ دلکش بنانے کی کوشش کی ہے، داڑھی کو بڑہ گئی مگر مولوی 'مدن' کی سی بات پیدا نہ ہوئی۔ 'ہاشم' کے اہم تصرفات حسب ذیل ہیں؛

(۱) دھوبی راجہ بھمبور کے پاس فریادی ہوئے کہ 'آتا' دھوبی کی بیٹی جوان ہوگئی ہے، مگر وہ برادری میں کسی سے رشتہ نہیں کرتا۔ راجہ نے سسی کو طلب

کیا - اس نے حاضر ہوکر وہ تعویذ پیش کیا' جو راجہ نے اُس کے گلے میں ڈالا تھا —

(۲) غزنی سے ایک سوداگر تصویریں لے کر آیا اور شہر بھمبور میں تصویر خانہ سجایا - اِن تصویروں میں پنوں کی تصویر دیکھہ کر سسی نے اصل کا حال پوچھا اور سوداگر سے پتہ نشان لے کر سسی اس پر نادیدہ عاشق ہوگئی —

(۳) اس گلڈریے کا نام 'کاکا' تجویز کیا ' وہ سسی کو دیکھہ کر ڈر گیا -

(۴) کاکا سسی کی قبر کا مجاور بن گیا -

(۵) شہد کی مکھیوں نے سسی کا حال زار دیکھکر پنوں کو ہوشیار کیا -

(۶) پنوں خودکشی پر آمادہ ہوگیا تھا' اس لئے بھائیوں نے اسے نہ روکا -

سادگی اورمحاکات کے لحاظ سے گو برخوردار کادرجہ بہت بلند ہے' مگرجو قبول عام اور ہمیشہ بہار ہاشم کو نصیب ہوئی وہ متقدمین و متاخرین میں سے کسي کے حصے میں نہ آئی' پنجاب میں اوھڑی کے دن ہندو مسلمان ملکر سسي پنوں کا سوانگ نکالتے ہیں اور اس میں ہاشم کی سسی گاتے ہیں- اس لئے اس کے شعر پنجاب میں بچے بچے کی زبان پر ہیں —

سوانگ میں ایک اونٹ پر پنوں اور سسی ہمردیف ہوتے ہیں اور ایک ساربان اونٹ کی مہار پکڑے رہتا ہے ' یہ سب کسی قدر مکالمے کی صورت میں ہاشم کے شعر پڑھتے ہیں - افضل شاہ نے قصہ تو ہاشم سے لیاہے مگر ہر بات کو طول دیکر بتنگڑ بنا دیا ہے- قصے میں دلاویزی پیدا کرنے کے بجاے داد سخن دینے کی طرف توجہ کی- البتہ یہ زیادتی کی ہے کہ راجہ آدم جام سسی پر فریفتہ ہو جاتا ہے' اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسکی بھانجی ہے تو عرق ندامت میں غرق ہوجاتا ہے' "ایجاد بندہ مگر سراسر گندہ" اسی کو کہتے ہیں —

سندھ

مولانا شرر لکھنوی بیان فرماتے ہیں کہ سندھ میں اس واقعے کو تاریخی منزلت حاصل ہے - عوام نے سسی پنوں کو اولیا کا مرتبہ دیا ہے - دلگداز بابت ستمبر سنہ ۱۸۹۸ میں تحفۃالکرام سے اخذ کر کے یہ قصہ اسطرح بیان کیا گیا ہے :

راجہ دلورائے کے زمانے میں سندھ کے ایک قدیم شہر بھام براہمہ میں نانیا نام برھمن رھتا تھا، جو ایک متوسط درجے کی عزت و حرمت سے اپنی بیوی سندر کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا - دونوں میاں بی بی کو مدتہائے دراز کی امیدوں کے بعد خدا نے ایک لڑکی عنایت کی، جس کا حسن وجمال آفتاب پر چشمک زنی کرتا تھا - بدنصیبی سے نجومیوں نے زائچہ بناکے پیشگوئی کی کہ یہ لڑکی کسی مسلمان سے بیاھی جائیگی - ماں باپ کو یہ سن کے نہایت صدمہ ھوا اور اُنھوں نے اپنی عزت و آبرو بچانے کے لئے سنگدلی سے کام لیا - مگر ان کا یہی بے رحمانہ کام اس پیشگوئی کے پورا ھونے کا موجب بنا، جس کی بنا پر اُنھوں نے اپنے لخت جگر کو اپنے دامن شفقت سے جدا کیا تھا —

پیشگوئی سن کر سسی کے والدین کو عزت و آبرو کے خطرے نے اس قدر خوف دلایا کہ انھوں نے اپنے اس جگر گوشہ کو ایک چھوٹے سے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا - تقدیر نے اس صندوق کی حفاظت کی اور موجیں بہا کر اسے شہر بھمبور میں لے گئیں —

شہر بھمبور میں ایک دھوبی رھتا تھا جس کا نام تونہیا تھا - مگر عام طور پر لالہ کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا - اس دھوبی کے پانچ سو شاگرد دریا کے کنارے کپڑے دھویا کرتے تھے - اگرچہ یہ سب بیٹوں کی طرح اس کی خدمت میں موجود تھے - مگر خدا نے حقیقت میں اسے اولاد سے محروم کر رکھا تھا، جس کی اسے بڑی تمنا تھی - وہ صندوق بہتے بہتے جب بھام براہمہ سے بھمبور پہنچا تو لالہ کے کسی شاگرد کے ھاتھ پڑا اور وہ اس صندوق کو اسی طرح بند اپنے مالک کے سامنے اُٹھا لایا -

لاله نے جو صندوق کھولا تو ایک چاند کے ٹکڑے کو اس میں دیکھ کر متحیر ہوگیا، فوراً نکال کے اپنے کلیجے سے لگایا - چونکہ اس کا چہرہ چاند کی طرح دمکتا تھا اس رعایت سے سسی نام رکھا اور اپنی بیٹی بنا کے پرورش کرنے لگا —

لاله کے دامن شفقت میں پرورش پا کے سسی بڑی ہوئی تو اس کا حسن و جمال زمانے کے لئے ایک فتنہ ہوگیا - جس کی نظر اس پر پڑی دل و جان سے فریفتہ ہوگیا - ہر صحبت میں اس کا تذکرہ ہونے لگا - اور مسافر اس کی یاد کو دل میں لے کے دور دراز ممالک میں پہنچے - الغرض اس طرح اس کے حسن عالم فریب کی شہرت ہر طرف پھیل گئی اور جا بجا لوگ اس کے نا دیدہ عاشق ہوگئے —

اس زمانے میں چند قافلے سندھ سے مکران کو روانہ ہوئے - جن کے پہنچتے ہی بعض تاجروں کے ذریعے سے سسی کے حسن کی تعریف شہر کش کے امیر کے بیٹے پنوں کے گوش گزار ہوئی - وہ یہ تذکرہ سنتے ہی دل و جان سے عاشق ہوگیا اور جب کامیابی کی کوئی تدبیر نظر نہ آئی تو سوداگروں کا بھیس کر کے بے کسی سے کہے سنے سندھ کو روانہ ہوا - بھمبور میں پہنچ کے جب سسی کی دلربا صورت دیکھی تو حضرت عشق کی آگ نے اس کے دل و دماغ پر اثر کیا - شوق وصل ایک سے دہ چند ہوگیا - جب کوئی اور صورت بنتی نظر نہ آئی تو مجبوراً پنوں کو سسی کے حسن سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ تدبیر کرنی پڑی کہ دھوبیوں کی صورت بنا کے سسی کے باپ کے شاگردوں میں داخل ہوگیا اور دریا کے کنارے روز جا کے کپڑے دھونے لگا - اس طریقے سے پنوں کو یہ موقع مل گیا کہ روز سسی سے ملا کرتا تھا - آخر دونوں طرف سے محبت نے جوش کیا اور دونوں کے دل میں عشق کے شعلے مشتعل ہوگئے -

یہاں ایک سنارن رہتی تھی جو ان دونوں کی پاک محبت کو دیکھ نہ سکی - اُسے آتش حسد نے اندر ہی اندر جلا دیا - اس بنا پر اس نے آخر کار ایسی

فتنہ پردازیاں کیں کہ پنوں کے دل میں سسی کی طرف سے کچھ بدگمانی سی پیدا ہوگئی - مگر سسی نے اپنی پاک دامنی کا ثبوت نہایت ہی سخت اور کڑے امتحان میں کامیابی حاصل کرکے دیا - چنانچہ وہ آگ میں کود کر خالص سونے کی طرح اس میں سے پاک و صاف نکل آئی - اس کے تھوڑے دنوں بعد ان عاشق و معشوق کی آپس میں شادی ہوگئی - اور وہ دونو اس شہر میں رہ کر کامیابی اور مقصد بری سے اپنی زندگی بسر کرنے لگے —

جب یہ حالات امیر کش کو معلوم ہوے تو اسے اپنے بھتیجے کی اس فریفتگی اور از خود رفتگی پر نہایت طیش آیا - اس نے چند آدمی روانہ کئے کہ جس طرح بنے پنوں کو خواہ برضا و رغبت خواہ بجبر و اکراہ کش میں لے آئیں - یہ لوگ گئے اور خود پنوں کے گھر میں اترے اور اس کے مہمان ہوے - لیکن رات کو جب پنوں اور سسی دونوں محو خواب تھے، ان لوگوں نے پنوں کو سوتے ہی میں اونٹ کی پیٹھ پر ڈال کے رسیوں سے باندھ لیا - اور سسی کو ویسے ہی سوتا پڑا رہنے دیا اور خود مکران کی راہ لی —

صبح کو جب سسی خواب ناز سے بیدار ہوئی تو پنوں اور رات کے مہمانوں کو غائب دیکھ کے رونے پیٹنے لگی - تمام کپڑے پھاڑ ڈالے، زیور اتار کے پھینک دیا اور تن تنہا شوہر کی جستجو میں نکل کھڑی ہوئی - محبت نے پاؤں میں اتنی طاقت دے دی کہ گھر سے بہت دور تک اپنے یوسف گم گشتہ کی تلاش میں قدم اٹھائے چلی گئی - کوئی چالیس کوس گئی ہوگی کہ پاؤوں نے جواب دے دیا اور تشنگی کی یہ شدت ہوئی کہ لق و دق بیابان اور برہنہ پہاڑیوں میں گر کے زمین میں ایڑیاں رگڑنے لگی اور بالکل نزع کا سا عالم طاری ہوگیا - خدا کی قدرت سے وہاں ایک پانی کا چشمہ نمودار ہوا جس سے پانی پی کر سسی خوب سیراب ہوئی - سیاحوں کا بیان ہے - کہ وہ چشمہ آج تک اسی جگہ پر موجود ہے اور صحرا نوردوں کے کلیجے ٹھنڈے کیا کرتا ہے وہ ہر موسم میں موجود رہتا ہے، نہ گرمیاں اسے خشک کرتی ہیں اور نہ بالو اس کے پانی کو جذب کرتی ہے -

کہتے ہیں کہ یہ واقعات مصیبت سسی نے اس شب کو خواب میں دیکھ لئے تھے جس رات وہ دلہن بنائی گئی تھی اور اس کے ہاتھ حنا آلودہ کئے گئے تھے —

وہاں رسم تھی کہ شب زفاف کو دلہنیں مہندی کی ایک ٹہنی ہاتھ میں لے کے سویا کرتی تھیں - سسی جو ٹہنی ہاتھ میں لے کے سوئی تھی' اسے اس نے محبت کی نشانی سمجھ کے حفاظت سے رکھ چھوڑا تھا - اس سفر غربت میں بھی وہ اس ٹہنی کو اپنے ساتھ لیتی گئی - اس پہاڑی علاقے اور صحرا میں جب خدا نے اسے آب نوشیں سے سیراب کیا تو اس نے وہ ٹہنی اس چشمہ کے کنارے گاڑ دی تھی - خدا کی قدرت سے وہ ٹہنی جم گئی - وہی مہندی کی جھاڑی اس چشمے کے کنارے آج تک سسی کے خوں چکاں دل کو یاد دلا رہی ہے —

تھوڑی دیر سستا کے سسی پھر آگے بڑھی - چھ ھی سات کوس چلنے پائی تھی کہ پھر پیاس کا غلبہ ہوا' چہرہ کملا گیا اور تھک کے بیٹھ گئی - اتفاقاً یہاں ایک گڈریا اپنی بکریاں چرا رہا تھا - اس نے جو سسی کی صورت دیکھی اور پھر اسے تن تنہا پایا تو بے اختیار ہوگیا - دیر تک مبہوت کھڑا دیکھتا رہا - آخر اس نے تجویز کی کہ سسی کو اپنے قابو میں لائے اور جہاں جی چاہے لے جائے - چنانچہ اس ارادے سے وہ قریب آیا اور سسی کو مخاطب کرکے کہنے لگا - چلو تم میرے ساتھ چلو اور میری معشوقہ بنو - سسی نے ایک آہ گرم کھینچ کے کہا - تم یہ کتنا بڑا ظلم کررہے ہو میں اپنی جان سے مر رہی ہوں اور تم ایسی ناجائز خواہش ظاہر کرکے میرا دل دکھا رہے ہو - گڈریے نے زیادہ اصرار کیا اور کہا: کہ یہ ممکن نہیں کہ تم میری خواہش پوری نہ کرو - تب سسی نے عاجز ہوکے کہا اچھا اگر تم مجھے مجبور ہی کرتے ہو تو کوئی ایسی تدبیر کرو جس سے میری جان میں تو جان آئے - مارے پیاس کے میرا دم نکلا جاتا ہے' کوئی ایسی چیز لادو کہ ذرا حلق تر کر لوں - اتنا سنتے ہی گڈریا خوش خوش اپنے گلے کی طرف دوڑا کہ تھوڑا سا دودھ لائے - گڈریے کے جاتے ہی سسی نے درگاہ الٰہی میں التجا کی وہ اپنے معشوق کی ملاقات کے آب حیات پائے

سے مایوس تو ہو ہی چکی تھی، ظالم گڈریے کے پنجۂ ظلم و ستم سے مخلصی کی کوئی صورت اسے نظر نہ آتی تھی، اس لئے تنگ آکے اس نے دعا کی: بار الہا مجھے اس صحرائی دیو کے پنجے سے نجات دے۔ اتنا کہنا تھا کہ وہ چٹان جس پر بیٹھی ہوئی تھی بیچ سے شق ہوگئی اور سسی کو اپنی گود میں لے کے پھر بند ہوگئی - سسی تو لعل بے بہا کی طرح پتھر کے کلیجے میں جا چھپی اور اس کی ساڑھی کا آنچل اس کی بیکسی یاد دلانے کے لئے باہر نکلا رہ گیا —

گڈریے نے جب واپس آکے یہ حال دیکھا تو اسے بڑی عبرت ہوئی، اپنی زیادتی پر بہت پچھتایا، خدا کی درگاہ میں توجہ کی اور اپنی ندامت مٹانے کے لئے اسی جگہ جہاں سسی پیوند کوہ ہوئی تھی، مقبرہ بنادیا —

اب پنوں کا حال سنئیے کہ وہ ستم رسیدہ، درد ہجراں کشیدہ، جب زنجیروں میں جکڑا ہوا اپنے باپ کے سامنے پہنچا تو اس کی بیتابی و حسرتناکی اس شدت پر نظر آئی کہ باپ کو بیٹے کے مرجانے کا اندیشہ ہوگیا۔ اس لئے مجبور ہوکر اس نے پنوں کے بھائیوں کو بلا کے کہا: تم پنوں کو ساتھ لے کے سندھ جاؤ اور جہاں ملے اور جس طرح ممکن ہو اس کی معشوقہ کو ساتھ لے آؤ —

اپنے باپ کے حکم کی تعمیل میں پنوں کے بھائیوں کا ایک قافلہ اسے ساتھ لے کے سندھ کی جانب روانہ ہوا۔ جب یہ لوگ اس مقام پر پہنچے جہاں سسی پہاڑ میں زندہ دفن ہوگئی تھی تو پنوں اپنے سواری کے اونٹ سے اترا اور کسی انسان کے تازہ نشان قبر کو غور کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ دل کے تعلقات کچھ ایسے بڑھے کہ وہیں بیٹھ کے سوچنے لگا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا:

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

پنوں کو وہاں بیٹھے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہی گڈریا نمودار ہوا اور پنوں کے پاس آ کے جب دیکھا کہ وہ ان آثار کا متجسس ہے تو اس نے سسی کی ساری حقیقت اس سے کہہ سنائی - پنوں فوراً سمجھ گیا کہ یقیناً یہ میری

هی معشوقه کا تذکرہ ہے - اپنے ساتھیوں سے کہا: میں ذرا اس قبر کی زیارت کر آؤں' اس شہید عشق کی تربت پر مجھے فاتحہ ضرور پڑھنا چاہئیے - اتنا کہہ کے مقبرے کے اندر گیا اور قبر سے لپٹ کے دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ مجھے میری معشوقہ سے ملا دے فوراً وہ چٹان پھر شق ہوئی اور پنوں بھی اس میں سما گیا ــ

پنوں کے بھائیوں کو سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہا کہ روتے پیٹتے اپنے وطن کو واپس گئے اور وہاں جاکر والد کو ساری کیفیت سے اطلاع دی - وہ بھی اس درد و حسرت بھرے واقعہ سے نہایت محزون ہوا' مگر صبر کئے بغیر اور کر ہی کیا سکتا تھا ــ

لیکن مسٹر کن‌کیڈ نے جوسنہ ۱۹۱۸ ءمیں کراچی میں‌متعین‌تھا، مسٹرهوم‌شیل کی مدد سے جو کہانی سندھی مثنوی اور گیتوں سے اخذ کی ہے وہ تحفۃالکرام سے بہت مختلف ہے - سندھ گزیٹر میں اس کہانی کا ذکر بر سبیل تذکرہ ہے مگر شاید بخوف طوالت کہانی بیان نہیں کی گئی - صاحب موصوف کی کہانی جو ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوئی - عوام میں متداول ہے جسے ہم اپنے الفاظ میں مختصر طور پر پیش کرتے ہیں :

" ایک مدت کی بات ہے کہ سندھ میں ڈاورائے نامی ایک راجا راج کرتا تھا - اس راجہ نے نانوں برھمن کو اپنا منتری بنایا - نانوں کے گھر دھن دولت کی گنگا بہتی تھی ' ہیرے موتی کے انبار لگے تھے ' پر بال بچہ کوئی نہ تھا - جس کے لئے یہ میاں بیوی بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑ پتے تھے - یوگی ' سادھوں مہنت کی سیوا میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی - ہون ہوے ' یگ کرائے ' کنگالوں کو جھولیاں بھر بھر کر روپیہ پیسہ دیا ' کچھہ نہ بنا - آخر نراس ہو گئے - تو ایک دن نانوں کی بیوی نے سن پایا کہ ایک بڈھا جوتشی کہیں سے آیا ہے - جو ہندوستانی اور یونانی دونوں ملکوں کی ودیا میں کامل ہے - نانوں گھر آیا تو بیوی نے اس جوتشی کا ذکر چھیڑا بچے کے بغیر زندگی اندھیری رات کے سمان

ہوتی ہے ' آئیے اس جوتشی کو بھی آزما دیکھیں - کیا معلوم کہ اس اندھیرے میں اُجالا ہو جاے۔ لوگ تو اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ اس جیسا پہنچا ہوا دنیا بھر میں کوئی نہیں ' آگے رام جانے "- ناتوں نے اس تجویز کی اونچ نیچ پر بہت سوچ بچار کیا' اور جب تسلی ہو گئی کہ اس میں کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تو بیوی کو ہمراہ لے کر جوتشی کے آشرم کی طرف چل پڑا -

جوتشی نے راج منتری کی بڑی آؤ بھگت کی' اُنہیں کٹیا میں لے گیا آنے کا کارن پوچھا۔ منتری نے جوتشی کے قدم لئے اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگا : " مہاراج! بھگوان کا دیا سب کچھ ہے' پر لڑکا بالا کوئی نہیں - اس پھانس نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے " جوتشی نے کچھ دیر سوچ کر پانسا پھینکا - اور رمل کے سارے قاعدے پورے کر کے بتایا : " منگل اور برھسپت کا سنجوگ ہے - مہاراج آپ کے ہاں ایک کنیا جنم لے گی پر اس کے لیکھ میں ایک مسلمان خاوند بدا ہے " - یہ سن کر منتری کے دل کو بڑا دکھ ہوا - اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آے اور اس نے جوتشی کی بڑی منتیں کیں ' کہ وہ اس کی بیٹی کی قسمت کو بدل دے - جوتشی کو اپنے معزز مہمان کی بہت خاطر منظور تھی ' مگر وہ قسمت کے لکھے کو نہیں بدل سکتا تھا - ناچار منتری اور اس کی بیوی روتے دھوتے گھر گئے - دارو کے لیے گئے اور نیا روگ لے آے - کچھ عرصے کے بعد لڑکی پیدا ہوئی - اس نے ارادہ کیا کہ یا تو پتھر سے لڑکی کا سر کچل دے یا آگ میں ڈالدے - برھمن کی بیوی لڑکی کی جان لینے کی روادار نہ ہوئی اور کہا کہ اگر اس سے کنارا ہی کرنا ہے تو صندوق میں بند کر کے سندھ میں ڈالدیجے - برھمن نے ایک صندوق منگوایا اور سوتے ہوے بچے کو صندوق میں رکھا - ایک تھیلی اشرفیوں اور موتیوں کی ڈال کر تالا لگا دیا - پھر اسے دریا میں پھینکدیا - صندوق بہتا بہتا شہر بھمبور میں پہنچا - وہاں محمد نامی ایک دھوبی صندوق کو باہر لے گیا - کھولا تو اس میں ایک لڑکی پڑی تھی - لڑکی کو صندوق سے نکالا تو اشرفیوں اور موتیوں کی ایک تھیلی ہاتھ لگی - اس کی خوشی کی کوئی

حد نہ رہی اور لڑکی اور تھیلی کو اٹھا کر گھر دوڑا ' اس کی بیوی جو دن رات اولاد کے لئے دعا مانگتی رہتی تھی ' نہال ہو گئی اور انہوں نے اس لڑکی کو اپنی بیٹی بنا لیا اور اس کا نام سسی رکھا ۔ (جسے ماہ لقا سمجھیے یا بدرالنسا کہئے) چند سال گذرے تو سسی جوان ہو گئی ۔ بچپن کا حسن نکھر کر شباب کے سانچے میں ڈھلا ۔ جدھر جاتی اُنگلیاں اٹھتیں اور لوگ گھنٹوں گھورتے ' اپنا کام کاج چھوڑ کر گھاٹ پر پڑے رہتے ۔ دھوبی نے اشرفیوں کی تھیلی سے سسی کے لئے اچھے سے اچھا کپڑا اور عمدہ سے عمدہ زیور خریدا ' ایک دو منزلا مکان تعمیر کیا ' جس کے گرد ایک دلکشا باغ احاطہ کئے تھا ۔ یہاں سسی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی ۔

اس زمانے میں ایک بلوچ سردار جام علی کی بہادری اور فتحمندی کی بڑی دھوم تھی ۔ اور اس کی قوم نے اسے کیچ اور کوہستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا ۔ جام علی کے چنوں ' پنوں ' ہوتو ' فکرو ' اور نوتو ' پانچ بیٹے تھے ۔ اگر چہ یہ سب بہادر اور شکیل نوجوان تھے ' مگر پنوں سب سے بڑھ چڑھ کر تھا ' اس بلوچ سردار کی دور دور تک دھاک بیٹھ گئی تھی ' کاروان محصول ادا کرتے تھے ' اور ارد گرد کے علاقے میں اگر کوئی سر اٹھاتا تھا تو اس کے بیٹے اسے ٹھیک بنا دیتے تھے ۔ سسی کی خوبصورتی کی شہرت اس دور دراز ملک میں بھی جا پہنچی اور اس کے خیال نے پنوں کے دل میں گھر کر لیا ۔ ایک دن بھو نامی ایک سوداگر کوہستان میں آیا ۔ جام علی نے اس کی بڑی خاطر مدارت کی اور اس کی باتوں اور ادب و آداب سے اس قدر خوش ہوا کہ تمام محصول معاف کر دیا ۔ تھوڑے دنوں میں بھو نے تمام مال فروخت کر لیا اور دوسری جگہ جا کر بیچنے کے لئے نیا مال خریدا ۔ اس نے جام علی سے رخصت چاہی تا کہ بھمبور شہر جا کر اپنا مال بیچ سکے ۔ جام علی بڑی مشکل سے اس کے جانے پر رضا مند ہوا ۔ لیکن جب پنوں کو الوداع کہنے آیا تو پنوں نے اسے چپکے سے کہا کہ : بھمبور میں سسی کو ڈھونڈھنا اور مجھے خفیہ اطلاع دینا کہ آیا واقعی وہ

ایسی ہی حسین ہے —

بہو نے مسکرا کر اس کام کی ہامی بھری اور اس کا کارواں بھمبور روانہ ہوا، جب وہاں پہنچا تو بہو نے ایک مکان لے کر وہاں اپنا مال سجایا — چند دنوں میں اس کے مال، اس کی خوبصورتی اور جوانی کا شہر بھر میں شہرہ ہوگیا اور اس کے مکان پر عورتوں مردوں کا تانتا بندھ گیا — ایک دن بہو کا اس مکان کے پاس گذر ہوا، جہاں سسی رہتی تھی — اس وقت سسی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی، اس نے بالا خانے کی کھڑکی سے بہو کو گلی سے گذرتے دیکھا — بہو کی خوبصورتی نے اس کے دل پر بڑا اثر کیا اور اس نے اپنی سہیلی سے جس کا نام سکھی تھا کہا کہ جاکر اسے اوپر لے آئے — بہو کو پیغام ملا تو وہ تھوڑا سا قیمتی مال لے کر سکھی کے ساتھ سسی کے پاس گیا — وہ مال کھول کر دکھا رہا تھا کہ سسی نے اس کے کان میں کہا : "اے سوداگر تونے میرا دل چھین لیا — اب میرے دل میں تم ہی بس رہے ہو" — پہلے تو بہو نے کچھ جواب نہ دیا، لیکن جب نظر بھر کر سسی کو دیکھا تو اس کے حسن کا قائل ہوگیا — اس نے دل میں کہا کہ گو یہ لڑکی دھوبن ہے مگر حسن کے لحاظ سے پنوں کے لائق ہے — سوچ کر اس نے سر ہلایا اور جواب دیا کہ "مجھ پر اپنی محبت ضائع نہ کیجیے، میں ایک شخص پنوں کو جانتا ہوں جو مجھ سے زیادہ خوبصورت اور آپ کے قابل ہے — میں تو ایک معمولی آدمی ہوں اور وہ ایک فیاض شہزادہ ہے — میں ایک ادنیٰ تاجر ہوں اور سارا کیچ اور کوہستان اس کی اطاعت کا دم بھرتا ہے — وہ پاس سے گذرے تو بھکاری کے گھر میں دھن برسنے لگے اس کے پاس گھوڑے، اونٹ، چاندی سونے کے خزانے، سپاہی، دربان اور منشی متصدی ہیں اور سچ پوچھئے تو میں بھی اسی کا ایک نوکر ہوں — میں نے اسکی خوبصورتی کا اسلئے ذکر نہیں کیا کہ مجھے اس کے لئے لفظ نہیں ملتے اسے دیکھ کر ہی آپ اس کے حسن کا اندازہ لگا سکتے ہیں — خدا کرے کہ آپ

کی اُس سے ملاقات ہو " —

سوداگر کی زبان سے پنوں کی اس قدر تعریف سن کر سسی کا دل اُس کی طرف مائل ہوا - اور اُس نے بھو سے کہا کہ وہ اس خوبصورت نوجوان کو بلا کر اسے دکھائے - بھو سسی سے رخصت ہو کر گھر پہنچا تو اس نے ایک منشی بلوا کر اس سے دو خط لکھوائے - ایک خط میں یہ لکھا تھا کہ " میں نے سسی کو دیکھا ' بے شک وہ چاند کا ٹکڑا ہے - اگرچہ دھوبن ہے' مگر خدا نے اسے دولت حسن سے مالا مال کردیا ہے - ایک سوداگر کے بھیس میں جلد تشریف لائیے اور عطر و عنبر کے بوجھ ساتھ ہونے چاہئیں " - دوسرے خط میں یہ تحریر تھا کہ " میری مدد کیجیے بھمبور کے لوگوں نے میرا سارا مال چھین لیا ہے اور مجھے قید کر رکھا ہے ' وہ مجھ سے محصول طلب کرتے ہیں - شہزادہ پنوں ! یہ خادم صرف آپ کے بھروسے پر جی رہا ہے ' مایوس نہ فرمائیے اور جلد تشریف لائیے —

یہ خط اُس نے ایک شتر سوار کو دئیے' جو جلد پنوں کے ملک میں پہنچ گیا - قاصد نے پنوں سے زبانی کہا کہ پہلا خط صرف اس کی ذات کے لیے ہے اور دوسرا وہ اپنے باپ کو دکھا سکتا ہے - پہلا خط پڑھ کر پنوں کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی ' دوسرا اس نے اپنے باپ کو سنایا تو وہ غصے سے بیتاب ہو گیا - اس کی زندگی میں اس کے دوست بھو سوداگر کی یہ گت بنے اور وہ بیٹھا دیکھا کرے' یہ کیسے ہوسکتا تھا - اُس نے پنوں کو حکم دیا کہ " فوراً جاؤ ' اس کے دشمنوں کو تلوار کے گھاٹ اتارو اور اسے آزاد کرو " —

پنوں نے قاصد کو یہ پیغام دے کر رخصت کیا کہ اسے پہنچا سمجھو اور آپ سفر کی تیاری کرنے لگا - عطر و عنبر سے بہت سے صندوق بھرے' انھیں چھکڑے سے اونٹوں پر بار کیا - کمبلا جمنی مخمل دھوپ میں چمک رہے تھے اور اونٹوں کے گلے میں مالا اور گھنگرو پڑے تھے - پنوں اور اس کے ہمراہیوں نے زر دوزی کپڑے پہنے ' سروں پر بڑے گھیر کی پگڑیاں باندھیں - ان کے پاجامے سبز رنگ کے تھے -

کندھوں پر سفید ریشمی رومال پڑے تھے' جن پر سنہری رپہلی لیس لگی تھی۔ جب پنوں کی جماعت روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئی تو جام علی اپنے بیٹے پنوں کو لے کر الوداع کہنے کے لئے آیا - اور پنوں سے کہا کہ پنوں کو ساتھ لیجاؤ' کام آے گا اور پنوں کو جلد واپس آنے کی تاکید کی - پنوں ماں باپ سے رخصت ہو کر روانہ ہوا - رات ہوئی تو پنوں نے کھیربیلہ میں قیام کیا - صبح ہوئی تو سارا گاؤں اس قافلے کو دیکھنے آیا - اس موضع کھیربیلہ میں سجن نامی ایک البیلی چھبیلی سنارن رہتی تھی' جب اس نے پنوں کو دیکھا تو وہ دل و جان سے اس پر فدا ہوگئی اس نے ایک بوڑھیا کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ وہ اس کا مال جواہرات کے عوض خریدنا چاہتی ہے - مگر پنوں نے کہا کہ یہ مال بکاؤ نہیں' مجھے اس کی بھمبور میں ضرورت ہے - اصرار کرنے پر سجن کی دعوت قبول کی اور ایک رات اور ٹھیرنے پر رضا مند ہو گیا - دوسرے دن سجن دامنگیر ہوئی مگر پنوں نے روانگی کا حکم دیدیا —

جب شہر کے قریب پہنچے تو پنوں نے بھو کو بلایا اور اس کے مشورے سے شہر کے جنوب میں ڈیرے ڈالے اور سوداگروں کی طرح دکانیں لگائیں - جب سسی کو معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑا سوداگر آیا ہے تو وہ بھانپ گئی کہ اس سوداگر کے پردے میں پاوں جلوہ دکھا رہا ہے اور بھو کے کہنے پر وہ جھٹ اپنی سہیلیوں کے ساتھ نئے سوداگر کے بازار کی سیر کرنے کے لئے چل پڑی - جب وہاں پہنچی اور سسی اور پنوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو اُنھیں کوئی سدھ بدھ نہ رہی اور وہ ایک دوسرے کے لیے وقف ہو گئے - دونوں کے دلوں میں آتش عشق پر بھڑک اٹھی - جب سسی گھر واپس گئی تو اُس نے اپنی محرم راز سہیلی سکی سے کہا : آنکھیں اشکبار ہیں' کلیجے میں ہوک اُٹھ رہی ہے - اگر کسی طرح پنوں کو لے آؤ تو خیر' نہیں تو سمجھو کہ میری جان کی خیر نہیں " - سکی نے اس کو باتوں میں بہلانا چاہا لیکن سسی نے اس وقت تک دم نہ لیا' جب تک سکی نے یہ وعدہ نہ کیا کہ وہ اس کے والدین کو اسبات پر راضی کرے گی کہ سسی کی شادی پنوں سے ہوجاے-

دوسرے دن سکی نے سسی کی ماں سے یہ ذکر چھیڑا اور کہا کہ سسی کے لیے اس سے بہتر بر ملنا محال ہے - خوبصورت گبرو جوان اور اس پر مال دار اور کیا چاہئیے۔ سسی کی ماں نے کہا : یہ تو خیر ہوا ' پر یہ تو بتاؤ کہ اس کی ذات کیا ہے - اتنے میں محمد آ گیا اور سسی کی ماں نے ساری بات کہہ سنائی - یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتفاق سے بہو گلی سے گذرا - اسے دیکھکر سکی نے کہا : " وہ دیکھو سوداگر کا منشی جا رہا ہے ' اُسے بلا کر ذات پات پوچھ لیجیے " - محمد گیا اور اسے لے آیا - بہو نے سوال کا مطلب پا کر جواب دیا - " اُس نے مجھ سے بار ہا کہا ہے کہ وہ کسی زمانہ میں دھوبی کا کام کرتا تھا لیکن اپنے وطن سے بھاگ آیا اور یہاں سوداگری شروع کردی " - یہ سن کر محمد نے بہو سے کہا کہ پنوں کو اپنے گھر بلا کر اُس سے ملائیے - پنوں خوشی سے بہو کے مکان پر آکر محمد سے ملا - محمد نے پنوں کا امتحان لینے کے لئے کہا - "میں نے سنا ہے کہ تم ذات کے دھوبی ہو ' ذرا ان کپڑوں کے دھونے میں میرا ہاتھ بٹاؤ " یہ کہہ کر محمد نے شہزادے کو کچھ ریشمی کپڑے اور صابون دیا - بہو نے شہزادے کو بتادیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوبی ظاہر کرے - اس لئے اُس نے کپڑے لے لئے اور گھاٹ کو چل پڑا - وہ حیران تھا کہ یہ کام کس طرح سرانجام ہوگا - رستے میں اُس کا بھائی ' چنوں ملا اور کہنے لگا : یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں ' کیا تم سچ مچ ایک دھوبن سے شادی کرکے ہوتوں کا نام کا ٹیکا لگاؤ گے " - پنوں نے جواب دیا : "بھائی یہ تو من بھاتے کا سودا ہے ' جب دل آگیا تو کیا کی دھوبن اور کہاں کی رانی " - چنوں یہ جواب سن کر دم بخود کھڑا رہا اور پنوں نے گھاٹ کا رخ کیا - کپڑے دھونے میں اس نے ایسا زور لگایا کہ ان کے پرخچے اُڑ گئے - ان دھجیوں کو پنوں حیرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا کہ سسی مسکراتی ہوی اس کے پاس آئی اور کہا : کوئی فکر کی بات نہیں ' ہر ایک کپڑے کی جیب میں ایک اشرفی ڈالدو ' کوئی بولے گا بھی نہیں - پنوں نے ایسا ہی کیا ' اور جب ان کے مالکوں کو کپڑے دینے گیا تو اُنھیں

کہتا آیا کہ بھائی کپڑوں کے ساتھہ اُن کی جیبوں کو بھی دیکھہ لینا۔ کپڑوں کا حال دیکھا۔ وہ بگڑنے کو تھے لیکن اشرفی دیکھہ کر اُن کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ جب معمد کو معلوم ہوا کہ پنوں نے کپڑے دھوکر لوگوں کے پہنچا دیے۔ اور کسی نے شکایت نہیں کی تو اُسے اطمینان ہوگیا کہ پنوں واقعی دھوبی ہے۔ اُس نے بڑی دھوم دھام سے سسی اور پنوں کی شادی کر دی۔ لیکن چنوں اس میں شریک نہ ہوا اور ناراض ہو کر وطن کو چلا گیا۔ وہاں جاکر اس نے سارا قصہ جام علی' کو سنایا تو وہ آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے پنوں کے تین بھائیوں 'چنوں 'ھوتو' اور 'نوتو' کو حکم دیا کہ فوراًپنوں کولےآئیں۔ یہ تینوں شہزادے بھمبور پہنچے اور دل میں کھوٹ رکھہ کر خندہ پیشانی سے پنوں سے ملے اور بھائی اور بھابی پر سے صدقے اُتارے۔ پنوں اور سسی کو اُن کی نیت پر کوئی شک نہ ہوا۔ چنوں نے اس سے کہا کہ 'جام علی' نے شادی منظور کرلی ہے اور اس خوشی میں وہ سب مل کر رات دن رنگ رلیاں بنائیں گے۔ ایک شب کو شہزادوں نے شراب میں داروے بے ہوشی ملائی اور پنوں اور سسی کو پلادی۔ آدھی رات کے وقت جب ان پر نیند غالب آئی تو انہوں نے پنوں کو سسی کے آغوش سے نکال کر اونٹ پر ڈالا اور فوراً کیچ کو روانہ ہوے۔ جب صبح کو سسی بیدار ہوی اور پنوں کو نہ پایا تو وہ دھاڑیں مارکر رونے لگی۔ ہمسائے اکٹھے ہوگئے اور دم دلاسا دینے لگے۔ سسی پنوں کو ڈھونڈھنے کے لئے تن تنہا چل پڑی۔ 'سکی' کے سوا سب نے اس کے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے ایک نہ سنی —

اونٹوں کے پاؤں کے نشانوں پر سسی پاپیادہ روانہ ہوی۔ دن بھر چلتی رہی مگر اس کا پتہ نہ ملا۔ شام کو ایک گڈریے کی جھونپڑی پر پہنچی اور اس سے پوچھا کہ ادھر سے کوئی قافلہ تو نہیں گذرا۔ گڈریا سسی کے حسن کو دیکھہ کر مونھت سا ہوگیا اور جواب دینے کے بجاے گھسیٹ کر اندر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ سسی نے اس مصیبت میں پہلے پنوں کو یادکیا' پھر بلند آواز سے یہ دعا مانگی :

"یا رحیم و کریم! زمین کو حکم دے کہ پھٹ جائے اور مجھے اپنے آغوش میں لے لے" -
خدا کا کرنا دھرتی ماتا کا منہ پھٹ گیا اور سسی گڈریے کی گرفت سے نکل اس میں جا پڑی - شگاف مل گیا مگر سسی کے دوپٹے کا دامن باہر رہ گیا - گڈریا یہ دیکھ کر مارے خوف کے اپنی جھونپڑی میں جا چھپا —

اب پنوں کا حال سنئے - دوپہر کو اُسے ہوش آیا تو وہ اپنے آپ کو اُونٹ کی پشت پر دیکھ کر حیران رہ گیا - پہلے تو خواب سمجھا ' لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ یہ عالم بیداری ہے تو اُس نے 'چنوں' سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے - جب اُس کے بھائیوں نے اُسے بتایا کہ وہ اُسے 'جام علی' کے حکم سے کیچ لیجا رہے ہیں تو وہ ونت سے کود پڑا - اُس کے بھائیوں نے اُس کے پکڑنے کی کوشش کی ؛ تو اُس نے تلوار نکال لی - سب الگ کھڑے ہوگئے - پنوں بھمبور کی سمت چل پڑا - چلتے چلتے اس جگہ پہنچا ' جہاں سسی گم ہوئی تھی - وہاں سے گڈریا ملا - اس نے دریافت کیا کہ اس نے کسی عورت کو سرگرداں پھرتے تو نہیں دیکھا؟ کیونکہ اسے یقین تھا کہ سسی نچلی نہ بیٹھیگی - گڈریے نے کہا کہ اس کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ایک عورت یہاں ساری ماری پھر رہی تھی اور اسے زمین نگل گئی - اور اسکے ثبوت میں سسی کا آنچل دکھایا ' جو قبر سے باہر ہوا میں اُڑ رہا تھا - شہزادے نے فوراً پہچان لیا اور اللہ سے دعا کی کہ وہ بھی زمین میں سما جاے - اللہ نے اس کی دعا قبول کی - زمین پھٹی اور پنوں سسی کے پہلو میں جا پڑا - شگاف پھر بند ہوگیا - اس طرح شہزادہ اور دھوبن ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے مل گئے —

یہ ہے سسی پنوں کی داستان ' جو سندھ اور پنجاب میں مختلف طور پر بیان کی جاتی ہے - چونکہ یہ سندھ کی سرزمین کا واقعہ ہے ' اسلئے روایات سندھ حکایات پنجاب پر مرجح ہیں - لیکن پنجابی میں جو قصہ برخوردار نے تیار کیا ہے؛

ہو زیادہ قریں قیاس معلوم ہوتا ہے۔ قصے کے دلچسپ ہونے میں کلام نہیں۔ لیکن اسے حضرت شرر مرحوم کی طرح تاریخی واقعہ تسلیم کرنے میں تامل ضرور ہے۔ مشرقی تاریخوں میں ایسے قصے اکثر زیب داستان کے طور پر بیان ہوے ہیں۔ لیکن ان چیزوں کو امر واقعہ کی منزلت حاصل نہیں ہوسکتی۔ لفٹننٹ برٹن اور مسٹر اوسٹن کی راے میں اس قصے کی اصلیت کچھہ بھی نہیں۔ اور یہ فرضی ایک کہانی ہے۔ مولانا شرر کا یہ فرمانا کہ خلاف قیاس حاشیے کو چھوڑ کر اگر غور کیا جاے تو اصل قصے کے صحیح ہونے میں شک باقی نہیں رہتا۔ محض تکلف ہے۔ ورنہ تاریخ سندھ کا یہ مصنف اس پر مزید روشنی ڈالتا —

ہاں صاحب تحفۃالکرام وثوق سے فرماتے ہیں کہ اس کے آثار و نشان ان کے عہد تک موجود تھے اور ان شہیدان عشق کا مزار مرجع خاص و عام تھا۔ لیکن صرف انکے کہنے کو کون باور کرے جب تحقیق و تدقیق سے انکی تائید میں نہ ہو —

عوام کی راے میں سسی اور پنوں ہنوز زندہ ہیں اور جو بھولا بھٹکا مسافر انکے مقبرے کے پاس آتا ہے، اسکی خبر گیری کرتے ہیں اور غیب سے انہیں کھانا بھی مل جاتاہے۔ان میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ اسمعیل نام ملتان کے ایک درویش نے سسی اور پنوں کو زندہ دیکھا۔ کئی شخصوں نے اس قسم کے واقعات بیان کئے ہیں۔ مگر یہ باتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں اور تحقیق کے معیار پر پوری نہیں اترتیں —

اس قصے میں اظہار محبت کی ابتدا عورت کی طرف سے ہوتی ہے جو خالص ہندی اسلوب ہے، اسکے بر عکس عرب اور عجم میں اسکا آغاز مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔ اسلئے قیاس یہ ہے کہ اس قصے کی بنیاد کسی ہندوستانی نے ڈالی اور یہ قصہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ ہندو عورت اور مسلمان مرد میں ازدواج نے رواج نہ پایا تھا اور ہندو ایسے تعلقات کو جائز نہیں سمجھتے تھے اس سے زیادہ اس قصے کی تحقیق پر مزید روشنی نہیں پڑتی —

سنیما کی چادر پر

تھیٹر والوں نے اس قصے کی جو مٹی پلید کی ہے، بیان سے باہر ہے مگر سنیما کے ڈھب کی چیز تھی وہ اسے لے اُڑا۔ آجکل سنیما نواز حضرات کی نگاہ میں سسی پنوں کا فلم ہندوستانی صنعت فلم سازی کی بہترین پیداوار ہے سنیما میں یہ قصہ دھوبی کے دریا سے صندوق پکڑنے سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل کے واقعات کو بجا طور پر نظری کردیا ہے۔ اور سسی کی علالت کے سلسلے میں ایک طبیب آکر سامان مذاق پیدا کرتا ہے، یہ تصرف مذاق سلیم برداشت نہیں کرتا۔ بھلا اس زور کی ٹریجڈی میں ہنسی مذاق کو کیا دخل۔ اتحاد جذبات کا فقدان آرٹ کے منافی ہے۔

تبصرے

ادب

مذهب و اخلاق

تاریخ و سیر

متفرق

اُردو کے جدید رسالے

ادب

سیرالمصنفین جلد دوم

(از جناب محمد یحییٰ صاحب تنہا' بی اے' ال ال بی-
جامعۂ ملیہ پریس دہلی — قیمت تین روپے)

سیرالمصنفین کی یہ دوسری جلد ہے - پہلی جلد اس سے قبل شایع ہوچکی ہے اور ان اوراق میں اس پر تبصرہ بھی ہوچکا ہے- اس جلد میں سر سید احمد خاں' مولوی چراغ علی' مولوی محمد حسین آزاد' مولوی ذکاءاللہ' مولوی سید علی بلگرامی' مولوی نذیر احمد' خواجہ الطاف حسین حالی' مولانا شبلی' مطبع منشی نولکشور' پنڈت رتن ناتھ سرشار' مولوی عبدالحلیم شرر کے حالات اور ان کی تالیف و تصنیف کا ذکر ہے - مولف نے مختلف ماخذوں سے سلیقے کے ساتھ ان بزرگوں کے حالات ایک جا جمع کردئے ہیں' اُن کی تالیفات و تصنیفات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور آخر میں ان کی تحریر کے نمونے بھی لکھ دیے ہیں- ہر مصنف کے طرز تحریر اور اس کی تالیف و تصنیف پر تنقیدی راے بھی لکھی ہے- تنقیدی حصہ ایسا ہے کہ اس میں اختلاف کی بہت گنجائش ہے لیکن حالات بہت خوبی سے اور صاف اور اچھی عبارت میں لکھے ہیں - یہ جتنے مصنفین ہیں اردو پر ان کا بڑا احسان ہے اور ان پر جس قدر ایسی کتابیں لکھی جائیں قابل قدر ہیں —

تاریخ ادب اُردو

(مصنفۂ جناب بابو صاحب سکسینہ ایم اے' ال ال بی۔ مترجمۂ جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے۔ مطبع نول کشور)

—•—

اصل کتاب پر جو انگریزی میں شایع ہوئی تھی' تبصرہ ہوچکا ہے۔ یہ اس کا ترجمہ ہے۔ اردو ترجمے میں بعض باتیں اضافہ کی گئی ہیں۔ جس سے کتاب زیادہ خوشنما' دلچسپ اور مکمل ہوگئی ہے۔ مثلاً انگریزی کتاب میں کلام کا نمونہ درج نہ تھا اور نہ اُس میں ضرورت تھی' لیکن ترجمے میں بعض بعض مصنفین و شعرا کے کلام کا نمونہ بھی درج ہے۔ کہیں کہیں حذف و اضافہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اکثر شعرا اور مصنفین کی تصویریں بھی دی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قابل مصنف نے بعض خامیوں پر نظر ثانی فرمائی ہے اور بعض غلطیوں کی تصحیح کی ہے۔ مگر اب بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً شمس علی الدین کلیم العلم کی اردو تصانیف کا ذکر جو محض فسانہ ہے۔ اس طرح سے یقین سے نہیں کرنا چاہئے۔ اب تک ان کی کوئی تصنیف ایسی نہیں معلوم ہوئی ہے جو اُردو یا کسی دیسی زبان میں ہو۔ یا دہ مجلس کو مشہور شاعر ولی سے منسوب کرنا' حالانکہ یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ دہ مجلس کا مصنف اسی نام کا دوسرا شخص ہے۔ یا میر صاحب (میرتقی) کے والد کے نام کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ ذکرمیر میں میر صاحب نے کہیں اپنے والد کا نام نہیں لکھا اس لئے ان کا نام میر عبداللہ ہی ہوگا۔ یہ صحیح نہیں۔ میرصاحب اپنے والد کو ہر جگہ علی متقی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور دوسروں کی زبان سے بھی یہی نام کہلوایا ہے۔ البتہ جب میر صاحب اپنے والد کے مرنے پر امیرالامرا صمصام الدولہ بہادر کی خدمت میں حاضر ہوے تو امیرالامرا نے اپنے برادر زادہ خواجہ محمد باسط سے جو انہیں نواب کے پاس لے گئے تھے' پوچھا کہ یہ لڑکا کون ہے؟ تو خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ " از میر محمد علی اسٹ "۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً میر صاحب کے والد کا نام میر محمدعلی تھا۔ اس قسم کی بعض غلطیاں اور بھی ہیں مگر اس سے کتاب کی قدر وقیمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اردو ادب کی تاریخ پر اس وقت اس سے بہترکوئی کتاب نہیں اور بابو صاحب کی محنت اورکوشش بہت قابل قدر ہے۔

ہم بابو صاحب کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انہیں مترجم بھی مرزا محمدعسکری

صاحب جیسے قابل شخص ملے ہیں - مرزا صاحب نے ترجمہ ایسا اچھا کیا ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا —

کتاب بہت اچھی چھپی ہے، کاغذ بھی عمدہ لگایا گیا ہے اور مجلد ہے - غرض سب خوبیاں موجود ہیں —

منتخبات عود ہندی

(از جناب مولوی حافظ شاہ علی احسن صاحب مارہروی، اُردو لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈہ - صفحات مع مقدمہ وغیرہ ۳۶۱- قیمت دو روپے) —

یہ انتخاب جناب احسن صاحب کا ہے - اس میں کل ۱۵۸ خط ہیں اور ہر ایک کے نام کے الگ الگ کردیے ہیں- چونکہ یہ انتخاب یونیورسٹی کے ایف - اے کے نصاب میں ہے لہذا ایسی بحثیں خارج کردی گئی ہیں جن کا تعلق خالص فارسی ادب سے ہے - شروع میں احسن صاحب نے ٦٦ صفحے کا مقدمہ مرزا غالب کے حالات اور اُن کے کلام کی خصوصیات پر لکھا ہے - اور آخر میں ۸۷ صفحے پر حواشی ہیں جن میں مشکل مقامات اور مشکل الفاظ کا حل درج ہے - یہ انتخاب یونیورسٹیوں کے نصاب کے لئے بہت موزوں ہے —

ادبی خطوط غالب

(مرتبہ مرزا محمد عسکری صاحب بی - اے لکھنوی ، مصنف یا نول کشور پریس سے مل سکتی ہے - قیمت دو روپیے، صفحات ۳۰۴)

یہ مرزا غالب کے ایسے خطوں کا مجموعہ ہے جن میں مرزا صاحب نے ادبی نکات حل کئے ہیں، اشعار کے معنی سمجھائے ہیں اور شعرا کے متعلق رائے زنی کی ہے - شروع

میں ۵۴ صفحے کا دیباچہ قابل مرتب صاحب نے لکھا ہے ' جس میں مرزا صاحب کی طرز تحریر اور ان کے خطوط کی خصوصیات پر بحث کی ہے - ہر رقعے میں جو جو ادبی نکات یا مباحث آئے ہیں' ان کے عنوان الگ الگ لکھ دیے ہیں' جس سے پڑھنے والے کو بڑی آسانی ہوجاتی ہے - ان تمام رقعوں کی تعداد ۹۶ ہے - آخر میں ۱۲۴ صفحے کا ضمیمہ ہے' جس میں اُن تمام اصحاب کے حالات ہیں' جن کے نام یہ رقعے لکھے گئے تھے - یہ ضمیمہ بہت دلچسپ اور کار آمد ہے - مرزا محمد عسکری صاحب کی یہ ادبی سعی بہت قابل شکریہ ہے —

اُردو محاورات و ضرب الامثال

[مؤلفۂ مولوی محمد اسمعیل صاحب سابق اسسٹنٹ گورنمنٹ آف انڈیا سکریٹریٹ بی فیلو شملہ- ملنے کا پتہ: حاجی عبدالکریم صاحب تاجر کتب کلکتہ ویلسلی ا، کوائر نمبر ۱۶—قیمت ایک روپیہ ایک آنہ لکھائی' چھپائی متوسط تقطیع ۱۸ × ۲۲ حجم ۲۰۰ صفحے]

—•—

یہ کتاب اردو زبان کے محاورات اور ضرب الامثال اور بحث تذکیر و تانیث پر ایک متوسط درجے کی اسکولی لغت ہے' جسے مولوی اختر جمیل صاحب بی اے نظر ثانی و اضافے کے بعد تیسری بار چھپوایا ہے —

پہلی فصل میں تین ہزار سے زیادہ اردو محاورات ہیں' جو روز مرہ کے استعمال میں ہیں - اشعار بھی سند و مثال کی طور پر دیے ہیں ' دوسری فصل میں تقریباً چارسو ضرب الامثال ہیں- ہر مثال کے نیچے اُس کے معنے بھی بتادیے گئے ہیں — تیسری فصل مؤنث و مذکر کی بحث میں ہے اس میں حقیقی ' غیر حقیقی' قیاسی ' سماعی مرکب اضافی' توصیفی وغیرہ کی کارآمد بحثیں آگئی ہیں اور چار ہزار الفاظ کی فہرست دے دی ہے غرضکہ طلبائے اردو کے لئے مختصر سی کارآمد اور مفید لغت ہے اور اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب بار سوم چھپی ہے جناب مؤلف کی قابل قدر کوشش لائق تحسین ہے —

فغانِ درد

(مصنف: جناب عطا محمد خان صاحب 'درد' درانی قندھاری۔
حجم ۱۰۰ صفحے، سائز ۲۰×۲۶ - لکھائی، چھپائی متوسط - قیمت
ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مصنف صاحب۔ محلہ قدیم پورہ، گجرات، پنجاب)

—•—

یہ جناب مصنف کے کلام کا مجموعہ ہے، یا دیوان - جس میں ردیف وار ترتیب سے وہ غزلیں یادگار کے طور پر جمع کرکے چھپوا دی ہیں، جو درد صاحب نے اپنے تاثرات سے مجبور ہوکر وقتاً فوقتاً کہی ہیں۔ کلام اچھا خاصا اور صاف ہے۔ شروع میں مصنف کا فوٹو اور مختصر حالات بھی خود اُنہوں نے لکھ دیے ہیں - کلام کا نمونہ یہ ہے۔

دام صیاد میں بلبل کو چمن یاد آیا
قید ہستی میں بدن جاں کو وطن یاد آیا

سوز ہجراں نے تو کیا جوش پیدا کردیا
دل میں اشکوں نے مرے صحرا کو دریا کردیا

آنکھ اے آنسو، دل پر 'درد' سے نکلی ہے آہ
اُس بت بے مہر کی اُلفت نے رسوا کر دیا

مجھے سیر گلشن کی پروا نہیں کہ داغوں سے سینہ چمن بن گیا

کلام میں کوئی خاص ندرت و جدت یا تازگی نہیں معلوم ہوتی۔ وہی قدیم تخیل ہے اور وہی انداز بیان ہے، بہر حال جناب مصنف نے خود کہدیا ہے کہ "میری شاعری عالمانہ فاضلانہ نہیں اور نہ میں اعلیٰ پایہ کی نظم لکھنے (کہنے) کا مدعی ہوں، قدرت نے مجھکو بے درد دیکر آہ و فغاں کا سوز عطا کیا تھا، جس کا اثر یہ مجموعہ ہے" اُمید ہے کہ شعر و سخن کے قدر داں جناب درد کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے اور ان کے کلام سے لطف اندوز ہوکر داد دیں گے۔

—•—

عروض

النجمۃ السائرہ

(ترجمۂ محیط الدائرہ مترجمۂ جناب مولانا سید سبط حسن صاحب ملا فاضل، مولوی فاضل، ممتاز الافاضل۔ ملنے کا پتہ: انجمن مؤید العلوم مدرسۃ الواعظین لکھنؤ۔ قیمت ایک روپیہ، حجم تقریباً ۲۰۰ صفحے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ متوسط سائز ۲۰×۲۶)

—•—

محیط الدائرہ علم عروض و قافیہ کی مشہور اور نہایت مقبول عربی کتاب ہے، جو مصر میں کئی بار چھپی اور ہندوستان کے کئی سرکاری و غیر سرکاری مدارس کے نصاب عربی میں شامل ہے۔ یہ اسی کتاب کا ترجمہ ہے جو لکھنؤ کے مشہور عالم نے کیا ہے، ترجمہ صحیح ضرور ہے لیکن انداز قدامت لئے ہوئے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا نے بالکل لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سبب سے لطف عبارت جاتا رہا ہے۔ یوں تو یہ فن ہی نہایت خشک وبے مزہ اور غیر ضروری ہے پھر اس کی اصطلاحات نہایت ہی غیر دلچسپ اور اس کے قواعد میں گنجلک اور اُلجھاؤ ہے۔ تاہم طلبائے عربی اور ان طلبا کے لئے خاص کر جو سرکاری یونیورسٹیوں میں عربی کے امتحانات دیتے ہیں۔ یہ ترجمہ بہت کارآمد اور معین ثابت ہوگا۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ حامل المتن ہے۔ اوپر کے نصف صفحے میں اصل عربی ہے۔ اور نیچے کے نصف صفحے میں ترجمہ۔ ضرورت مند طلبہ اور عروض کے شائقین ضرور اس سے فائدہ اُٹھائیں۔

———•———

آل انڈیا مشاعرہ

(مرتبۂ احسن صاحب مارہروی۔ لکچرار اردو انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ سائز ۲۰×۳۰۔ قیمت بارہ آنے۔ حجم ۱۰۰ صفحے)

—•—

خیابان اُردو، انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ میں اردو کی ایک ادبی انجمن ہے

جس کے روح رواں کالج کے اردو پروفیسر جناب احسن مارہروی ہیں - اس کی جانب سے سالانہ ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوتا ہے - جس میں باہر کے شعرا اور دیگر ارباب ذوق بھی شریک ہوتے ہیں - یہ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ ع کے سالانہ مشاعرے کے کلام کا مجموعہ ہے' ابتدا میں جناب مرتب نے مختصر حالات اور ضرورت مشاعرہ و شعر و سخن پر تمہید لکھی ہے' اسی کے بعد جناب ملا رموزی صاحب بھوپالی نے اپنے خاص انداز میں مشاعرے کے حالات بہت تفصیل سے اور نہایت دلچسپ پیرایے میں لکھے ہیں پھر مشاعرے کی دونوں طرحوں اردو فارسی پر جو غزلیں پڑھی گئی تھیں اُن کا انتخاب ہے - اس سال یہ جدت کی گئی تھی کہ مصرع طرح کے علاوہ "عزت" - نفس و جذ بو تولی کا عنوان نظمیں لکھنے کے لئے دیا گیا تھا - چنانچہ یہ نظمیں بھی شامل ہیں کلام عمدہ اور آج کل کے مذاق کا ہے اور مجموعی طور پر یہ گلدستہ دلچسپ و دلپذیر ہوگیا ہے —

مذہب و اخلاق

نغمہ اور اِسلام

(مؤلفہ مولوی محمد علی شاہ صاحب 'میکش' - میوہ کٹرہ آگرہ -
قیمت بارہ آنے' سائز ۱۸ × ۲۲' لکھائی' چھپائی' کاغذ' متوسط - حجم ۷۴ صفحات)

—•—

یہ مختصر سا رسالہ جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے' اس موضوع پر جناب مؤلف نے لکھکر شائع کیا ہے کہ اسلام میں گانا اور گانا سننا جائز ہے یا نہیں' اور اسے ارباب دل و شریعت کیا رتبہ دیتے ہیں جناب مؤلف نے نہ صرف احادیث و آیات قرآنیہ سے اپنے مفید مطلب نتائج نکالکر نغمہ اور سماع کا جواز ثابت کیا ہے بلکہ اور بزرگان دین کے اقوال اور علماء کے تصانیف کے حوالے بھی دیکر نغمہ کو مباح اور جائز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے آخر میں تقلید اور وجد وحال پر بحث ہے' جن حضرات کو اس موضوع سے اختلافی یا اتفاقی حیثیت سے دلچسپی ہے وہ اس رسالے کو پڑھیں -

—•—

تاریخ و سیر

افغان بادشاہ

مصنفہ جناب محمد حسین خان صاحب بی اے [علیگ] سابق رئیس تدریسات عمومی افغانستان یعنی ڈائرکٹر جنرل پبلک انسٹرکشن - مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس ' سرکلر روڈ ' لاہور - قیمت دو روپے آٹھ آنے]

—•—

یہ کتاب غازی امان اللہ خاں سابق شاہ افغانستان کے حالات میں ہے ' جو محمد حسین خاں بی - اے [علیگ] سابق صدر ناظم تعلیمات افغانستان نے تالیف کی ہے۔ خاں موصوف نہایت قابل اور فاضل شخص ہیں۔ اور انہوں نے امیر حبیب اللہ خاں مرحوم اور شاہ امان اللہ خاں کے عہد میں قابل قدر خدمات کی ہیں ' خصوصاً تعلیم کی اشاعت و ترویج میں لائق تعریف کام کیا ہے۔ فاضل مؤلف نے امان اللہ خاں کے خصائل و عادات ' اُن کی روز مرہ کی باتوں ' اُن کے مختلف ارشادات اور ان کی کارگزاریوں کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی طبیعت اور دماغ کا اصلی جوہر جس طرح ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے کھلتا ہے وہ بڑے بڑے کاموں سے نہیں معلوم ہوتا - اس کتاب کے پڑھنے سے امان اللہ خاں کے حالات اور خیالات کی سچی قدر ہوتی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص میں اپنے ملک کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور اس کی یہ تمنا تھی کہ جس قدر جلد ہوسکے افغانستان دنیا کے اعلی متمدن ممالک میں سے ہو جائے - اس آرزو کے پورا کرنے کے لئے اُس نے ہر طرح کے سامان کئے اور شب و روز ایک مزدور کی طرح سے کام کیا —

امان اللہ عجیب دل و دماغ کا آدمی ہے - ملک کے ہر شعبے اور ہر محکمے میں خود کام کرتا اور کوئی جزوی سے جزوی چیز بھی اس کی نظر سے نہ بچتی تھی - خصوصاً تعلیم کی اشاعت سے اُسے خاص شغف تھا - مدارس میں جاتا ' خود پڑھاتا ' امتحان لیتا اور تعلیم کے سہل طریقے ایجاد کرتا - ممالک غیر سے ماہرین فنون بلاکر مختلف فنوں کے مدرسے قائم کئے - تعلیم نسواں کی اشاعت کی بھی اُسے ایسی ہی دھن تھی جیسی مردوں کی تعلیم کی - اس کے علاوہ افغان لڑکوں کو ممالک غیر میں تعلیم کے

لئے بھیجا اور اُن کے لئے وہی انتظام کیا جو اپنی اولاد کے لئے —

باوجودیکہ وہ سچا مسلمان تھا مگر کبھی مذہب و ملت کی تفریق روا نہ رکھا تھا اور ھندو، مسلمان، یہودی سب سے یکساں برتاؤ کرتا تھا۔ اگر وہ مولانا محمودالحسن مرحوم کی فاتحہ خوانی میں شریک ہوتا ہے تو ملک مہاراج کی موت پر اُن کے جلسۂ ماتم داری میں بھی اظہار غم کے لئے جاتا ہے اور اسی طرح محرم کی مجلسوں میں شریک ہوتا اور حالات شہادت سنکر آنسو بہاتا ہے —

اگرچہ امان‌اللہ خاں اس وقت اپنے ملک سے جدا بہت دور پڑا ہے مگر اپنے ملک کے لئے جو مخلصانہ کوششیں اس نے کی ہیں وہ رائگاں نہیں جائیں گی اور وہ بد نصیب قوم جس نے اُسے جلا وطنی پر مجبور کیا ایک روز اپنے کئے پر پچھتائے گی اور اس کی صداقت، ایثار اور حب وطن کی قدر کرے گی — ·

فاضل مؤلف کو چونکہ زمانۂ دراز تک افغانستان میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور شبانہ روز بادشاہ سلامت کی صحبت کا شرف حاصل رہا ہے، اس لئے جس قدر واقعات اس میں درج ہیں وہ ان کی آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں اور بالکل صحیح ہیں —

جن صاحبوں کو موجودہ افغانستان اور اس کے سابق بادشاہ امان‌اللہ کے حالات سے ذرا بھی دل چسپی ہے وہ اس کتاب کو شوق سے مطالعہ کریں گے اور اس کے مطالعے سے انکو خوشی ہوگی —

فاضل مؤلف بعض بعض جگہ عربی فارسی کے ثقیل اور غریب الفاظ لکھ گئے ہیں، جو غالباً ان کے قیام کابل کا نتیجہ ہے —

ایشیا

(از جناب ابرار حسین قادری صاحب ایم - اے، ایل ٹی
لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

یہ کتاب ایشیا کے طبعی، سیاسی اور اقتصادی جغرافیے پر ہے - اب تک جو جغرافیے کی کتابیں عام طور پر اُردو میں لکھی گئی ہیں اور مدارس کے نصاب میں شریک ہیں، اُن میں اور اس کتاب میں بہت بڑا فرق ہے - یہ کتاب محض جغرافی اسما اور بعض خشک معلومات کا مجموعہ نہیں ہے جو رٹنے اور امتحان پاس کرنے کے لئے کار آمد ہوتا ہے بلکہ اس میں ایشیا کے ہر ملک کی طبعی، سیاسی اور معاشی

حالت بہت ہی شستہ زبان میں، دلچسپ طریقے سے، اس طرح بیان کی گئی ہے کہ طالب علم اور عام پڑھنے والے دونوں مستفید ہوسکتے ہیں۔ جغرافیے کو بہت خشک مضمون کہا جاتا ہے مگر اس کتاب نے اسے دلکش بنا دیا ہے —

کتاب کے آخر میں ایک نقشہ شامل ہے جس میں ایشیا کے خشکی اور تری کے رستے اور تقویم الاوقات کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چند ضمیمے اور نقشے بھی ہیں۔ پہلے ضمیمے میں دنیا کی طبعی خطوں کی تقسیم ہے، جس سے دنیا بھر کی طبعی تقسیم نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ دوسرے ضمیمے میں علامہ ابن خلدون کے مقدمۂ تاریخ سے اس حصے کا اقتباس دیا ہے جس میں علامہ ادریسی (چھٹی صدی) نے ایشیا کی جغرافی کیفیت بیان کی ہے۔ اس کے بعد ذرائع آمد و رفت، سکہ جات، گوشوارۂ تجارت، جدول عرض البلد و طول البلد کے نقشے ہیں۔

عصر قدیم

(مرتبہ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم۔ ملنے کا پتہ: دلگداز پریس، کٹرہ بزن بیگ خان لکھنؤ۔ حجم ۲۲۰ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ متوسط۔ تقطیع ۲۰-۲۶)

مولانا شرر مرحوم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی تمام تر زندگی علم ادب اور زبان کی خدمت میں گزری ہے اور آخر وقت تک وہ برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ہیں، یہ کتاب ان کی مشہور اور مستند تاریخی تالیف ہے جسے عہد سلف کی مختصر اور جامع تاریخ کہنا چاہئے۔ اس میں مولانا نے تخلیق عالم کی ابتدا سے لیکر حضرت مسیح کی ولادت تک کے دنیا کی تمام قائم اور متمدن و ترقی یافتہ قوموں کے واقعات نہایت سلیقے اور ترتیب کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ سیریا، بابل، مصر، فلسطین، یونان، روم وغیرہ اقوام قدیم کے اجمالی حالات درج ہیں۔ غرض کہ یہ کتاب ایک بیش بہا تاریخی ذخیرہ ہے، ہر لائبریری اور کتب خانے میں ہونا چاہئے بلکہ ہر پڑھے لکھے کے مطالعے کی چیز ہے۔ کتاب کی خوبی کے لئے خود مؤلف کا نام کافی

ہے - اس کے علاوہ یہ ملک میں کافی مقبولیت حاصل کر کے اب دوبارہ شائع کی گئی ہے - تاریخی ذوق رکھنے والوں کے لئے از بس دل چسپ اور قدیم تاریخی حالات کے لئے اچھی چیز ہے —

مسلمان تاجداران ہند

مولفہ حکیم محمد سراج الحق صاحب ایڈیٹر صفی سلیم ' مطبوعۂ دلگداز پریس لکھنؤ- قیمت فی جلد آٹھ آنے- لکھائی چھپائی ' کاغذ ادنی درجہ کا سائز ۲۰×۳۰ - ۱۶ حجم حصۂ اول جلد دوم ۱۲۰ صفحات- حجم حصۂ سوم جلد اول ۹۹ صفحات

حکیم سراج الحق صاحب ' مولانا شرر مرحوم کے دلگداز پریس کے مطبع اور مرحوم کے کتابوں کے ناشر و طابع کی حیثیت سے مدت سے اردو کی قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں ' اور اب انہوں نے خود بھی تالیف و تصنیف کے خارزار میں قدم رکھا ہے - اُن کی دو کتابیں جو جدید شائع ہوئی ہیں ہمارے پیش نظر ہیں یہ ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں - پہلا حصہ ' دوسری جلد کا ہندوستان کے مشہور و نامور شہنشاہ جلال الدین اکبر کے سوانح حیات پر مشتمل ہے - ہمایوں ابن بابر کے حالات سے شروع ہوتا ہے - بیان صاف و سادہ ہے - اور حالات کے انتخاب میں سلیقے سے کام لیا گیا ہے ' تیسرا حصہ جلد اول کا ' کتاب کے ساتویں باب سے شروع ہوتا ہے اس میں تیمور کے حملے کے بعد سے خاندان شیر شاہ کے آخر عہد تک کے تمام واقعات ہیں - ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے اور حکومت کرنے کی مجمل مگر کارآمد تاریخ ہے - مدارس میں ہندوستان کی تاریخ کے نصاب میں داخل کی جائے تو بہتر ہے ' ہمارے خیال میں یہ پورا سلسلہ مفید ہوگا اور مکمل کتاب نہایت کار آمد و ضروری ہوگی —

متفرق

رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ منعقدۂ ڈسمبر سنہ ۱۹۲۸ع

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں - یہ رپورٹ اسی کے اکتالیسویں سال کے جلسے کی روداد ھے- جو ڈسمبر کے آخر میں بمقام اجمیر شریف منعقد ہوا تھا اور سکریٹری صاحب کے حسب ہدایت رپورٹ اب شائع ہوئی ھے' کانفرنس کا یہ پہلا اجلاس تھا جو صوبۂ اجمیر و میوار میں ہوا - ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان ایم اے - جج ہائی کورٹ الہ آباد اس کے صدر تھے - تقریباً سات صفحوں میں جناب صدر کا معرکہ‌آرا اور زبردست خطبۂ صدارت ھے جس میں بیش قیمت مشورے مسلمانوں کی بہبودی اور تعلیمی ترقی پر دیے گئے ہیں' پھر اس کے رزو لیوشن (تجاویز) ہیں' تجاویز کے بعد سال بھر کی رپورٹ اور چندہ دینے والوں کی فہرست ھے - ان سب کو ملا کر یہ رپورٹ دو تین سو صفحات تک پہنچ گئی ھے - لکھائی چھپائی عمدہ' کاغذ متوسط' حجم تقریباً دو سو صفحات-صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڈھ سے ملتی ھے —

اُردو کے جدید رسالے

مجلۂ مکتبہ

(انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن - قیمت سالانہ چار روپیہ)

مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد اردو کتب کی اشاعت کا بہت اچھا کام کر رہا ہے اور یہ ماہوار رسالہ بھی اسی مکتبہ کی جانب سے شایع ہوتا ہے - اس رسالے میں زیادہ تر ادبی اور علمی مضامین ہوتے ہیں - دکنی تصانیف کے متعلق اکثر مضامین درج ہوتے رہتے ہیں حیدرآباد کے ممتاز علمی رسالوں میں سے ہے اور بعض مضامین اس میں عالمانہ شان کے شایع ہوئے ہیں۔ اس کے مدیر مولوی محمد عبدالقادر صاحب سروری ایم-اے' ال-ال-بی ہیں جو اسے سلیقہ اور محنت سے مرتب کرتے ہیں —

چمنستان

(از امرتسر' ایڈیٹر محمد افضل خان' و سید ظفر
ہاشمی- چندہ سالانہ دو روپے فی پرچہ تین آنے حجم ۴۴
صفحات سائز ۲۰ × ۲۶ لکھائی چھپائی متوسط۔ باتصویر)

—•—

لاہور سے جس قسم کے اُردو ادبی رسالے آئے دن نکلتے رہتے ہیں - یہ بھی اسی طرح کا ایک ماہانہ رسالہ ہے - جس میں زیادہ تر افسانے' غزلیں اور نظمیں ہیں- ایک آدھ اور مضمون بھی ہے - اور دو تصویریں ہیں - ایک رنگین " نخچیر صیاد " نہایت دلفریب تصویر ہے اور دوسرے جون آف آرک کی ہے' جو بہت پامال ہے اور بارہا چھپ چکی ہے - مضامین متوسط درجے کے ہیں- کوئی اہم اور قابل تذکرہ نہیں - افسانوں سے جو حضرات ذوق شوق رکھتے ہیں وہ یہ پرچہ بھی منگواکر دیکھیں -

—•—

الهادی

(ایڈیٹر سید محمد حسین صاحب ' کوثر ' کانپوری ' ملنے
کا پتہ بازار رام نرائن کانپور - قیمت سالانہ تین روپے -
حجم ۲۴ صفحے 'سائز ۲۰ × ۲۶ کاغذ اور لکھائی چھپائی متوسط)

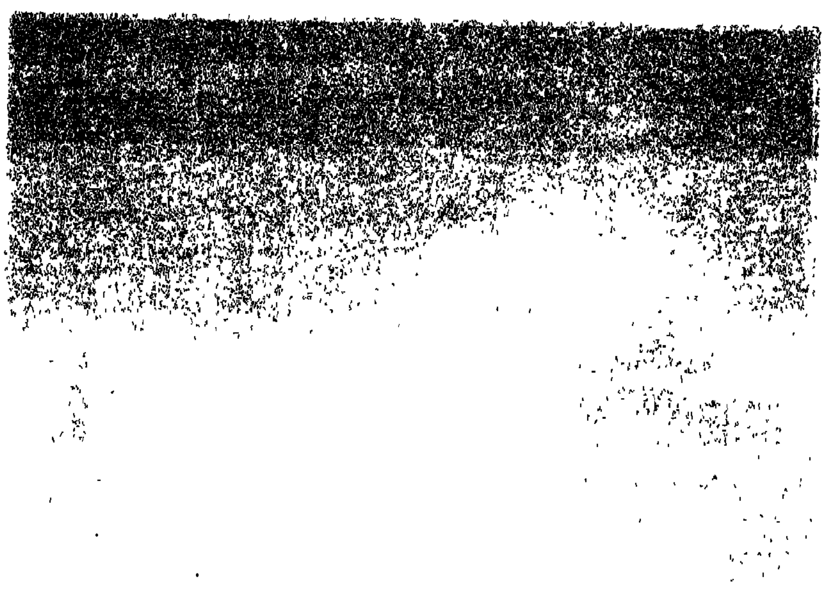
—*—

یہ مذہبی رسالہ بھی نیا نکلنا شروع ہوا ہے- اور پہلا ہی نمبر ہمارے سامنے ہے اس کے مقاصد یہ ہیں کہ اہل اسلام اُن نکات و رموز حکیمانہ سے واقف ہوں جو قرآن مجید اور احادیث میں موجود ہیں ' کسی فرقۂ اسلام کی دل آزاری مقصود نہیں" ہمارے یہاں ایسے رسالے کم نکلتے ہیں جنہوں نے اپنا کوئی خاص مقصد قرار دیا ہو بلکہ زیادہ تر نقیر کے کھکول کی حیثیت رکھتے ہیں مگر یہ خالص مذہبی رسالہ ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ دل آزاری سے اس کا دامن پاک ہے- اس نمبر میں پانچ مضمون ہیں - علوم الله خاص ایڈیٹر صاحب کا دوسرا الاخلاق- تیسرا امام پنجم امام باقر پر چھٹا اور ساتواں احسان اسلام و خصوصیات اسلام پر ہیں - اپنے مقاصد کے لحاظ سے پرچہ غنیمت ہے اور شیعیت غالب ہے -

—*—

اردو

نویں جلد — سنہ ۱۹۲۹ ع



انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

اردو

نویں جلد — سنہ ۱۹۲۹ ع

فہرست مضامین

(الف) مقالے

(ب) نظمیں

تبصرے

اخلاق و مذہب

تاریخ و سیر

تعلیم

متفرق

اردو کے جدید رسالے